تارِ عنکبوت
مصباح نوشین

(ناول)

مصباح نوشین

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور
فون: 042-37352332-37232336

نام کتاب	....	تارِ عنکبوت
مصنفہ	....	مصباح نوشین
ناشر	....	علم وعرفان پبلشرز
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز لاہور
کمپوزنگ	....	دلدار حسین
قیمت	....	-/400 روپے
اشاعتِ اول	....	اگست 2016ء

......ملنے کے پتے......

علم وعرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔اُردو بازار، لاہور

اشرف بک ایجنسی
اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

کتاب گھر
اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم وادب
الکریم مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

ویلکم بک پورٹ
اُردو بازار، کراچی

بیکن بکس
گلگشت کالونی، ملتان

رشید نیوز ایجنسی
اخبار مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

کشمیر بک ڈپو
تلہ گنگ روڈ، چکوال

فرید پبلشرز
اُردو بازار، کراچی

انتساب!

اس مہربان ذات کے نام

جو سب پر مہربان ہے!

کہنی سننی

الحمدللہ کامیابی کی طرف بڑھتا ہوا ایک اور قدم میری نئی کتاب ''میرے بے خبر میرے بے نشان'' ادارہ علم وعرفان پبلشرز کی محنت وجانفشانی کا منہ بولتا ثبوت آپ سب محبت کرنے والوں کے ہاتھوں میں ہے۔

اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس کا طرز تحریر میرے گزشتہ اسلوب سے ہٹ کر ہے۔ جو میری تحریر کا خاصا ہے۔

تارِ عنکبوت ایک خواہشات کے حال میں جکڑی عورت کی کہانی ہے جس نے دنیا کی رنگینی کی خاطر اپنی جنت اپنے ہاتھوں خراب کردی اور اسی تفریح اور ہنسی مذاق میں بے خرسا فعل کیسے ایک عورت کی زندگی تباہ و برباد کرسکتا ہے اس ناول میں بہت اچھے سے واضح بیان کیا گیا ہے ''میرے بے خبر میرے بے نشان'' حشمت زیدی کی کہانی ایک ایسے رائٹر کی کہانی جس کی شخصیت کا کھلا تضاد کسی معصوم کی زندگی تباہ کرگیا۔ جو اتنی تحریروں میں اچھائی محبت واخلاص کا سبق دینے کے ساتھ اپنی ذات سے محبت وعشق کا جھانسہ بھی دیا کرتا اور کیا کمال دیا کرتا کہ ایک عالم اس کی محبت میں گرفتار اپنی رگیں کاٹنے پر مجبور ہو گیا۔

حشمت زیدی میرے مختصر ادبی سفر کا ایسا کردار جو میری پہچان بن گیا پاک ٹی ہاؤس کا مجھ پہ طاری وہ سحر جو حشمت زیدی کو تخلیق کرنے کا سبب بنا۔

مجھے خوشی ہے کہ میں حشمت زیدی جیسا کردار تخلیق کر پائی اللہ کے فضل وکرم سے دوستوں کی دعاؤں سے میں کامیابی کی جانب اپنے قدم بڑھا رہی ہوں۔

ادارہ علم وعرفان کا بھی شکریہ جو محنت وخلوص سے میری کتابیں شائع کر کے مجھے معتبر کرتا ہے......ان صفحات کے ذریعے میں ان تمام دوست احباب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن کی بے لوث محبت اور خلوص کی وجہ سے میں نہ صرف زندہ ہوں بلکہ محنت ولگن سے اپنی منزل کی طرف گامزن بھی ہوں۔

آپ سب کی تحسین آراء کی منتظر۔

مصباح نوشین

Alisummer747@gmail.com

تارِ عنکبوت

وہ بوسیدہ زدہ لباس میں ملبوس گندگی کے ڈھیر سے اپنے بیٹ کے دوزخ کو بجھانے کے لیے کچھ تلاش کر رہی تھی......اس کے ہاتھ کبھی خوبصورت رہے ہوں گے مگراب صرف استخوانی (وہ ہاتھ جس پر گوشت نہ ہو اور دیکھنے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھتا ہو) ہاتھ ہی دکھتے تھے جن کی اوپری جلی ہوئی جلد بے حد باریک اور کالی تھی جیسے جلی ہوئی ہو اور وہ دیکھنے پر بے حد کریہہ اور کوڑھ زدہ نظر آتے تھے۔ گرد سے اٹے بالوں کو کبھی صابن اور شمپو نصیب ہوا تھا نہ ہی کنگھی............وہ کچھ بستی کی طرف بنا گندگی کا ایک بڑا سا پہاڑ تھا میونسپل کمیٹی والے سارے شہر کا کوڑا کرکٹ وہاں پھینکا کرتے تھے۔اور وہ فاقوں مرتی یہاں گندگی کے ڈھیر کو کھنگال کر اپنے لیے کھانا ڈھونڈا کرتی تھی۔کبھی کبھار کچھ اچھا کھانا بھی مل جایا کرتا تھا جیسے بچی کچھ روٹی کے ٹکڑے تھوڑے خراب ٹماٹر، سبزی اور باسی ٹفن باکس سے نکال کر پھینکے گئے سینڈوچز......یا کچھ بھی؟ بے دردی سے رزق کی بے عزتی کرنے والوں کو کبھی بھی معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ ان کے پھینکے گئے باسی کھانوں کو کوئی من وسلویٰ کی مانند کھا کر خوش ہوتا ہے۔کسی نے سوچا تھا نہ ہی کبھی دیکھا تھا وہ دیکھ سکتے بھی نہیں تھے کیونکہ اس کی عزت نفس باقی سارے جذبات واحساسات کے مرجانے کے باوجود بھی زندہ تھی......وہ افشین حیدر تھی جو قسمت کے تھپیڑے کھاتی گندگی کے ڈھیر سے جینے کا جواز ڈھونڈا کرتی تھی......یہ وہ افشین حیدر تھی جو رات کا سالن صبح ناشتے میں نہیں کھایا کرتی تھی اسے وہ سالن باسی لگتا تھا اور اب......گلی کے بچوں نے اسے دیکھتے ہی چیخنا چلانا شروع کر دیا تھا کئی ایک تو ہاتھوں میں پتھر اٹھا کے اس کے پیچھے مارنے کو لپکے تھے وہ بے دم ہوتی سانسوں کو سنبھالتی ہاتھوں میں تھامی جلی ہوئی روٹی اور تھیلی میں ڈلا سالن لے کر بمشکل تمام بھاگ رہی تھی کتنے دنوں کے بعد اچھا کھانا نصیب ہونے والا تھا اور یہ گلی کے آوارہ بچے......اس نے کوفت وکروفر سے سوچا......اور کیا کبھی اس نے سوچا تھا کہ اس کروفر وطنطنے نے اسے کس حال میں پہنچایا تھا......وہ بھاگ رہی تھی آج پھر گلی کے بچوں کی اس پر نظر پڑ گئی تھی بھاگتے بھاگتے اس کے پیروں میں کوئی نوکیلا پتھر لگا تھا بھل بھل بہتا خون اور درد کا اتھاہ احساس اسے رکنے پر مجبور کر گیا تھیلی والا سالن اور روٹی ہاتھ سے چھوٹ کر مٹی مین جا گری اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مٹی میں ملے سالن اور روٹی کی باقیات کو دیکھا کھانا نہ کھا سکنے کا دکھ بہرحال پیر میں چبھے پتھر کے درد سے زیادہ تھا وہ تین دن کی بھوکی تھی اور باوجود کوشش کے بھی بستی کے ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کے بھیک مانگنے کے باوجود بھی اسے کسی نے بھیک نہیں دی تھی اور اب......بھوک کا احساس اور اس کی شدت درد پر غالب آ گئی اس نے مٹی میں بھنبھوڑی روٹی اٹھائی اور تھیلی میں بچا تھوڑا بہت

شوربہ اٹھا کر پہلا نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا اور آنکھیں موند لیں پیٹ کا دوزخ بھجنے لگا۔

اس کے اندر بہت آہستہ آہستہ سکون اترنے لگا۔

"سکون" اس نے پٹ سے آنکھیں کھول کر سوچا کیا اس کی زندگی میں کبھی سکون رہا تھا پہلی بار پانی کا قطرہ اس کی آنکھ سے آنسو بن کر گرا تھا اس نے یاد کرنے کی کوشش کی......کہانی کہاں سے شروع ہوئی ہے اس نے ذہن پر زور ڈال کر سوچا تھا!

☆..................☆..................☆

"افتی" خمار آلود گھمبیر لہجہ اس کے آس پاس مہکا اس نے غور سے اکڑی گردن مزید اکڑا کر بڑے کروفر سے دیکھا ظاہر ہے وہ شمع تھی اور پروانے اس پر مرتے تھے اور وہ پروانوں کو جلا کر مارنے کی از حد رسیا اور۔ اور۔ اور رضا حسن تو اس کے پیچھے دیوانہ تھا اتنا دیوانہ کہ اسے پا کر ہی دم لیا تھا شادی کے پانچ سال گزرنے کے بعد بھی وہ اس کے لیے اتنی ہی وارفتگی رکھتا تھا جتنی شادی کے اولین دنوں میں......مغرور تو وہ پہلے ہی تھی رضا حسن کی جنونی محبت کے بعد تو بالکل ہی ہواؤں میں بسیرا کیے رکھتی زمینی مخلوق اسے اچانک پاؤں کے نیچے آجانے والے بے ضرر کیڑے مکوڑوں کے برابر محسوس ہوتیں۔

افتی میری جان پلیز میری طرف دیکھو! ہمیشہ کی طرح رضا حسن کے انداز میں بے پناہ لجاجت تھی میں نہیں دیکھ رہی آپ کی طرف......اب آپ کا محبت نامہ شروع ہو جائے گا اور اس وقت بول ہی نہیں پائے کچھ" وہ ہنوز رُخ موڑے بیٹھی رہی البتہ شکوؤں کی پٹاری کا منہ کھول دیا اب کم از کم اگلا ایک آدھ گھنٹہ اس پٹاری سے شکوے برآمد ہوتے رہنے تھے افتین حیدر کی شکوؤں کی پٹاری مقام حیرت ہمیشہ ہی لبالب بھری ہوا کرتی تھی۔

"افتی میں مانتا ہوں امی جان کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گئیں تمہارے ساتھ مگر تم خود سوچو وہ بڑی ہیں ہم سے ان کا تجربہ زیادہ ہے اور پھر وہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں تم گھر کی حالت خود دیکھو تم گھر پر توجہ بالکل بھی نہیں دے رہی ہو۔"

"تو آپ کا کہنے کا مطلب ہے میں صرف خود پر توجہ دیتی ہوں سارا دن۔" گھر اور بچوں کی کبھی ذمہ داری پوری نہیں کی..........." اچانک رُخ اس کی طرف موڑتے وہ غصے سے بپھرتے بات کو بڑھاوا دینے کی پوری تیاری میں تھی اس کی فطرت میں اپنی غلطی کا اعتراف کرنا کہیں نہیں تھا۔

افتی......میں نے یہ کب کہا؟ رضا حسن بے دم ہوا۔

تو پھر کہنے کا مطلب تو وہی تھا ناں..........کونسی قیامت آگئی اگر ایک دن میں گھر صاف کر کے وقت پہ بچوں کو صاف ستھرا نہیں کر سکی تو......اور پھر مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کی والدہ ماجدہ تشریف لا رہی ہیں پہلے جب جب وہ ہمارے ہاں آتی ہیں سچ سچ بتائیے کیا میں ان کے آگے پیچھے نہیں پھرتی انہیں اچھا کھانا نہیں کھلاتی..........جو وہ آج مجھے اتنی باتیں سنا کے چلی گئیں۔" رضا حسن کا سر جھک گیا۔

وہ صرف مجھے ذلیل کرنے کے بہانے تلاش کرتی ہیں کیونکہ انہوں نے مجھے کبھی قبول ہی نہیں کیا؟

سوں سوں کرتے اپنی سرخ ہوتی ناک کو پونچھتے وہ تڑخی تھی۔

اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے بھی مجھے ذلیل کروانے کے لیے ہی مجھ سے شادی کی ہے۔

اس نے رضا حسن پر سراسر الزام لگایا رضا حسن کی جنونی محبت تڑپ کر رہ گئی۔

میں نے تم سے محبت کی تھی اسی لیے تمہیں سارا خاندان چھوڑ کے بھی اپنایا تھا'' وہ روہانسا ہوا۔

تو نہ کرتے ناں............کسی نے آپ کے پاؤں تو نہیں پکڑے تھے یا میں خود آئی تھی چل کے......اس کا لہجہ مزید تیز اور تلخ ہوا جو اکثر ہی ہوتا تھا سچی بات تو یہ تھی کہ افتین حیدر کو گھر اور بچوں کی ذات میں دلچسپی لینے کا کوئی شوق نہیں تھا وہ گھر کے معمول کے کام مارے باندھے نپٹایا کرتی تھی بچے ابھی چھوٹے تھے مگر اتنے بھی نہیں بڑا بیٹا چار سال کا تھا اور چھوٹا ڈھائی سال کا......کھانا موڈ ہوتا تو پکا لیتی ورنہ سارا دن بیڈ پہ لیٹی موبائل فون پر لگی رہتی تھی رضا حسن نے اسے کبھی کچھ نہیں کہا تھا کیونکہ اپنی بے پناہ محبت میں رہتے افتین کی ذات کی خامیاں شاید نظر ہی نہیں آیا کرتی تھیں اس نے کھانا بنا دیا تو ٹھیک ورنہ وہ ہوٹل سے لے آیا کرتا افتین تو ویسے بھی بہت شوقین تھی مرغن کھانوں کی اور وہ افتین کی خوشی میں خوش تھا مگر رضا حسن اس کی محبت میں اندھا تھا ساری دنیا نہیں طاہرہ بیگم ماں تھیں رضا حسن کی اس کی خوشی اور سکون کے لیے افتین کے لیے راضی تو ہو گئی تھی مگر وہ افتین کے بھوہڑ پن سے سخت نالاں رہا کرتی تھیں آج بھی وہ بازار سے لوٹیں تو اچانک ہی واپسی پر ان کے گھر چکر لگانے کا سوچ بیٹھیں......انہیں کیا خبر تھی کہ گھنٹہ بھر تو بہو بیگم دروازہ ہی نہیں کھولیں گی وہ دل کی مریضہ تھیں اتنی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر ان کے فلیٹ تک آئی تھیں بے دم ہوتی سانسوں سمیت وہ بمشکل دروازے کو پکڑے کھڑی تھیں۔ بار بار بیل بجانے کے بعد افتین نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

طاہرہ بیگم اسے لش لش کرتے چہرے کے ساتھ دیکھ کے چونکیں خوبصورت تو وہ تھی مگر اب تو دن بدن بے حد حسین ہونے جا رہی تھی......ابھی وہ جی بھر کے متاثر بھی نہ ہو پائی تھی کہ

''آیئے۔'' اس نے بے زاری سی آواز میں اندر آنے کی پیش کش بالکل ایسے ہی انداز میں گویا ہوئی کہ آنا ہے تو آؤ ورنہ میں دروازہ بند کر کے رہی ہوں......وہ ہانپتی کھڑی تھیں فوراً اندر ہو لیں مگر اندر کا منظر دیکھ کر ان کا پارہ چڑھنے میں ایک منٹ کی تاخیر ہوئی تھی بس......!

''آج کہیں گئی ہوئی تھیں کیا؟'' لاؤنج کے وسط میں کھڑے ہو کے پورے گھر کا طائرانہ جائزہ لیتے ان کی آواز و لہجہ خود بخود ہی سرد ہو گیا تھا افتی اپنی دھن میں تھی سوان کے موڈ کا اندازہ نہیں کر پائی ورنہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا ہی لیتی......سوفی الفور نفی میں سر ہلا گئی۔

''اور طبیعت تمہاری خراب نہیں لگ رہی؟ اس کے نفی میں سر ہلانے پر انہوں نے کمس کر جیسے اپنا غصہ دبانے کی کوشش کی تھی

انہوں نے اسے سر سے پیر تک گھورا۔

تو پھر گھر اتنا گندا کیوں ہو رہا ہے ایسا لگتا ہے ہفتہ بھر سے جھاڑ پونچھ کی گئی ہے نہ ہی جھاڑو پوچا...... کیا کرتی رہتی ہو سارا دن گھر میں؟'' ان کے سرد کٹیلے لہجہ میں کیے استفسار نے بغیر کسی وقت کے افتی کے تن من میں بھانبڑ بھڑکائے تھے وہ پوری جان سے جلی تھی۔

''اصل میں آج ذرا سر میں درد تھا تو صفائی نہیں کر سکی۔'' اس نے بہانہ گھڑتے بمشکل تمام لہجے کو ہموار رکھا۔

''اچھا'' ان کے لہجے میں استہزاء افتی کو اپنی واضح چھب دکھلا گیا'' ٹی وی کا اونچا والیوم تو پوری بلڈنگ والے سن سکتے ہیں۔

امی جان............ آپ کھڑی کیوں ہیں پلیز بیٹھے نا............ افتی نے بات بدلنے کی کوشش کی طاہرہ بیگم نے اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ کیا کوئی ڈھنگ کی جگہ صاف ہے جہاں بیٹھوں ویسے بھی وہ تو بے حد صفائی پسند خاتون تھیں افتی نے ان کے نظروں کے مفہوم کو سمجھتے ہی آگے بڑھ کے صوفے پر پڑا گیلا تولیہ اور میلی بنیان اٹھائی............ رضا کو ویسے بھی عادت تھی پھیلاوا ڈالنے کی............ آگے دونوں بچے بھی پورے باپ پر پڑے تھے۔ کشن درست کرتے اس نے طاہرہ بیگم کے بیٹھنے کی جگہ بنائی اور اندر جا کے فوراً ٹی وی بند کیا...... پھر کچن میں جا کے ان کے لیے کولڈ ڈرنک نکال کر لائی تو احساس ہوا کہ کچن کی حالت بھی کم و بیش لاؤنج جیسی ہی تھی سلیب پر گرا سالن اور خشک آٹے کے ذرات حد درجہ بدنما نظر آ رہے تھے۔ افتی نے دانستہ نگاہ چرا کے طاہرہ بیگم کی طرف رُخ کیا...... جو ناگواری سے صوفے پر یوں ایستادہ تھیں گویا صوفے میں نوکیلی کیلیں رہوں اور ان کے وجود کو چبھ رہی ہوں۔

''دوپہر میں کیا بنا رہی ہو؟'' انہوں نے خالی گلاس میز پر رکھتے افتی کی جانب دیکھا۔

''رات کا سالن رکھا ہے۔ رضا شام کو سبزی گوشت لے آئیں گے تو تازہ سالن بنا لوں گی...... آپ کو جو بھی کھانا ہے بتا دیں میں منگوا لیتی ہوں؟ افتی نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا جو طاہرہ بیگم کے دل پہ ہرگز بھی نہیں پڑا۔

''میں وہی کھا لوں گی رات کا سالن............ میرے لیے اہتمام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں یوں کرو اب میرے اور اپنے لیے چائے بنا وا اور تم خود ساتھ کوئی پین کلر لے لو...... پھر اس کے بعد یہ پھیلاوا سمیٹو............ بلکہ مل کے کرتے ہیں مجھ سے تو یہاں بیٹھا ہی نہیں جا رہا۔'' انہوں نے ناگواری سے ناک سکیڑتے جیسے افتی کو جتلایا اسے بے پناہ ہتک کا احساس ہوا دل تو چاہا دو چار کھری کھری سنا دے بڑی کو۔ مگر ایک تو وہ اس کے گھر آئی مہمان تھیں دوسرے رضا حسن کی پیاری والدہ...... سو دل کے جذبات دل میں دبائے وہ آہستگی سے سرا ثبات میں ہلا گئی۔ پھر ناچار اسے وہ سب بھی کرنا پڑا اس نے خاموشی سے سارا کام کیا چھوٹے بیٹے کو نہلا کر صاف ستھرا کیا دوپہر کے لیے روٹی بنائی سالن گرم کر کے تقریباً پٹخنے والے انداز میں طاہر بیگم کے سامنے رکھا جو بے وقت کی مصیبت بن کے اس کے سر پہ سوار ہو گئیں تھیں اس کی کمر تختہ اور مزاج کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا جس وقت رضا کی واپسی ہوئی تھی اور طاہرہ بیگم کے سامنے سعادت مندی کا مظاہرہ کرنے والی افتین حیدر کا سارا ضبط رضا حسن کو دیکھتے ہی پانی کے بلبلے کی مانند ہوا میں تحلیل ہوا تھا وہ تو جیسے پھٹ پڑی تھی آفس میں

کام کے برڈن اور کراچی شہر کی ٹریفک سے نبرد آزما ہونے کے بعد گھر آتے آتے رضا کی آنکھیں ویسے ہی بند ہونے لگتی تھیں ان کی بلڈنگ کی لفٹ کافی دنوں سے خراب تھی سو سڑھیاں چڑھ کر تھرڈ فلور پر آنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا رضا گھر میں داخل ہونے کی منتظر افتی بغیر اس کی تھکن کی پرواہ کیے شروع ہو چکی تھی۔ اور رضا حسن وہ تو سدا کا نرم دل اور افتی پر جان چھڑکنے والا تھا فوراً ہی اپنی تھکاوٹ کی پرواہ کیے بغیر اس کی دل جوئی میں لگ گیا...... جواب بیٹھی سوں سوں کر کے رو رہی تھی...... کھانا تو طاہرہ بیگم خود بنا کے گئی تھی اور صفائی ستھرائی بھی وہ اتنی کروا گئی تھیں کہ اگلے تین دن افتی ہاتھ پیر ہلائے بغیر بھی مزے کر سکتی تھی مگر اس کلفت وخجالت کا خاتمہ کیسے کرتی جو طاہرہ بیگم کے آنے پر اسے اٹھانا پڑی تھی اور بدر کی ناراضی...... اس سے آگے سوچنا ہی افتین حیدر کے لیے محال تھا۔

☆..................☆..................☆

"بدر" افتی کا دل چاہا رو رو کے شہر اپنے آنسوؤں سے بہا دے مگر اُسے پرواہ کہاں تھی!

"بدر پلیز۔ میری مجبوری کو سمجھیں کہا نا ایمرجنسی ہو گئی تھی ورنہ میری کیا مجال کہ میں آپ کی فون کال ڈسکنکٹیٹ کرتی............"

وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے اسے منا رہی تھی اور وہ تھا کہ مان کے ہی نہیں دے دیا تھا۔

"بدر آپ مجھے رلا رہے ہیں۔" پہلی بار بدر کا دل کچھ نرم پڑا۔

"اور تم جو مجھے اذیت دیتی ہو اس کا کیا؟ ہمیشہ والا شکوہ دہرایا گیا مگر افتی نے شکر کیا کہ اس نے چپ کا روزہ تو توڑا۔

آپ کو کیا لگتا ہے اپنے دل سے کرتی ہوں وہ سب...... کیا کروں مجبوری ہے میری۔ بھابھی جاب کرتی ہیں اور اپنے بچے میرے پاس چھوڑ کے جاتی ہیں پھر سارا دن گھر کا کام کاج بچوں کی ذمہ داری اور پھر روز کوئی نہ کوئی مہمان بھی آیا رہتا ہے۔ کل بھی بھابی کی امی آ گئی تھیں بڑی بی نے سارا دن ناک میں دم کیے رکھا اور میرا یقین کیجئے ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ملی ورنہ ضرور آپ کو بتا دیتی۔

"افتی" اس کی تفصیل کے جواب میں بدر کا خواب آگیں لہجہ مہکا افتی کی سماعتیں تک مہک گئیں۔

"تم جانتی ہو تم سے بات کیے بغیر میرا سارا دن خراب گزرتا ہے۔ مگر تم نہ میری محبت کی پروا کرتی ہو نہ ہی میری اور انتظار کی سولی پر لٹکا کے مجھے تڑپا کے مزے لیتی ہو۔ خوش ہوتی ہو میری بے بسی کا تماشا دیکھ کے...... وہ شکوہ کناں ہوا۔

"بدر" افتی تو تڑپ ہی گئی اس کی قدرے بلند آواز میں بولنے پر ڈھائی سالہ اسود کسمسایا افتی نے فوراً ہی اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کے اسے دوبارہ سلایا مبادا وہ کچی نیند سے اٹھ جائے اور بدر کا موڈ زیادہ خراب ہو............!

"تو اور کیا سمجھوں...... تمہیں میری فکر نہیں جو تم پر دیوانہ وار نثار ہے بلکہ اپنے ظالم بھائی اور سفاک بھابھی کی ہے جو دن بھر تم سے گھر کے کام کاج کے علاوہ بچے تک پلوا رہے ہیں۔ آیا بنی ہوئی ہو تم ان کے بچوں کی۔

یہ بچے میرے بھی کچھ لگتے ہیں بدر...... اور پھر ماں باپ کی وفات کے بعد بھیا اور بھابھی نے مجھے اگر سہارا دے رکھا ہے تو میرا

بھی فرض ہے کہ ان کے کچھ کام آ سکوں اور بچے تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں......! افتی نے بدر کی تڑپ اور محبت پر دل ہی دل میں ناز کرتے بظاہر نرم دلی اور حساسیت سے کہا تھا۔

سہارا دے رکھا ہے سے تمہاری مراد کیا ہے افتی۔ کیا تم اپنے بھائی کی سوتیلی بہن ہو؟ بدر نے اچانک قدرے ترشی سے پوچھا تھا۔

میں نے ایسا تو نہیں کہا؟ افتی گڑ بڑاتے بولی۔

تو پھر ایک کی ذمہ داری کو سہارا دینا ہر گز نہیں کہتے بلکہ تمہیں تحفظ دینا اور اپنے گھر کا کرنا ان پر فرض ہے نہ کہ احسان۔ اور اسی لیے تم نے اپنی بھابھی کو سر پر چڑھا لیا ہے اپنی بے تکی منطق انہیں سنا سنا کے......! فار گاڈ سیک افتی۔ خود کو دوسروں کے سامنے فار گرانٹڈ مت پیش کرو کہ آؤ اور مجھ سے فائدہ اٹھا کے میرے جذبات کو روند کر آگے بڑھ جاؤ...... دکھ ہوتا ہے مجھے تمہاری نرم دلی تمہیں کہیں کسی بڑے نقصان سے دوچار نہ کر دے افتی خود کو آئینے میں دیکھتی دلربائی سے مسکرائی۔ کیا کوئی ایسا جنا تھا جو افتین حیدر کو نقصان پہنچا تا آپ کا ساتھ اور محبت مجھے کبھی ٹوٹنے نہیں دیں گی بدر...... یہ میرا یقین ہے!'' مکارانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے بظاہر وہ بہت یقین سے کہہ رہی تھی دوسری جانب بدر تو نثار ہی ہو گیا۔ اور میں تمہارا یہ یقین کبھی نہیں ٹوٹنے دوں گا یہ میرا وعدہ ہے افتی! بدر کے لہجے میں سچے جذبات کا الاؤ دہکنے لگا۔

مجھے آپ کے یقین پر یقین ہے بدر......بس آپ مجھ سے ناراض مت ہوا کریں آپ کی ناراضی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی میری جان پر بن آتی ہے۔

''تمہارے معاملے میں خود پر کنٹرول نہیں کر پاتا افتی۔ دل چاہتا ہے کہ تمہارے بھیا بھابھی کے گھر کو آگ لگا دوں اور تمہیں چرا کر کسی ایسی جگہ لے جاؤں جہاں خود غرض اور بے حس لوگوں کا گزر ہی نہ ہو۔''

''اتنی محبت کرتے ہیں کیا مجھ سے؟ افتی نے اس کے خاموش ہوتے ہی پوچھا تھا۔ تمہاری سوچ کی حد جہاں پر ختم ہوتی ہے وہاں سے میری محبت کا آغاز ہوتا ہے! سچی محبت نے بدر کے لہجے کو گھمبیر اور دل آویز بنا دیا تھا افتی نے پرسکون انداز میں آنکھیں موند لیں۔

''تو پھر بے فکر رہیے آپ کی محبت مجھے کبھی ہارنے نہیں دے گی ایک طاقت کی طرح زندگی کی خاردار راہوں کو طے کرنے میں مدد کرتی رہے گی۔ افتی کا جواب بدر کے یقین سے بھی گہرا تھا بدر نے افتی کی محبت پر مغرور ہوتے رب کا شکر ادا کیا تھا۔

☆............☆............☆

رضا کے آنے سے پہلے افتی نے بچوں کو نہلا کر تیار کیا......عبداللہ کو ہوم ورک کروایا وہ چار سال کا تھا اور ابھی چند ماہ پہلے ہی اسے انہوں نے کڈز یونیورسٹی میں داخل کروایا تھا تا کہ کچھ مینرز اور ابتدائی معلومات ایڈمیشن ٹیسٹ کے لیے سیکھ سکے......رضا کی بہت بڑی خواہش تھی کہ وہ اپنے بچوں کو شہر کے سب سے مہنگے اور اچھے سکول میں داخل کروائے اور وہ محنت بھی خوب کر رہا تھا اسود ابھی چھوٹا تھا رضا جاتے ہوئے عبداللہ کو سکول چھوڑ دیا کرتا تھا واپس وہ اسکول وین سے آ جایا کرتا تھا کبھی کبھار اسے افتی جا کے لے آتی کڈز یونیورسٹی ان کی

بلڈنگ سے دس منٹ کے فاصلے پر ہی تھی۔ ویسے بھی اس کے موڈ پر منحصر ہوتا وہ ان ماؤں میں سے نہیں تھی جو اپنی اولاد کے لیے اپنا سکون و آرام تج دیتی ہیں افتی کے لیے سب سے پہلے اپنی ذات تھی اس کے بعد وہ کچھ اور دیکھنے کی قائل تھی۔ آج بدر کو شہر سے کہیں باہر جانا تھا سو افتی سے اس کی فون پر بات نہیں ہو پائی تھی فارغ افتی کو کچھ تو کرنا ہی تھا سو خوب دل جمعی سے گھر صاف کر کے اچھا سا کھانا بنا لیا۔ بدر سے اس کی ملاقات اپنی دوست سعدیہ کے گھر پر ہوئی تھی وہ ان کے ہمسائے میں کسی کے گھر مہمان آیا تھا۔ اونچی لمبی مناسب سراپے تیکھے نقوش والی افتین حیدر نے اسے پہلی ہی نظر میں گھائل کر دیا تھا۔ اس کی رنگت بے حد سفید تھی اور سیاہ گہرے گلے والے ایمرائیڈڈ سوٹ میں اس کا سفید رنگ دہک رہا تھا۔ کوئی بھی ذی ہوش گولڈن براؤن بالوں والی اس باربی ڈول جیسی لڑکی کو دیکھ کے اپنے ہوش کھو سکتا تھا مقابل تو پھر بدر حیات تھا جو بنا ہی جس پر مرمٹنے کے لیے تھا وہ بے اختیار افتین کے پاس سے گزرا دو چار ادھر اُدھر کی باتیں کیں چند ایک پوچھیں اور جھٹ اپنا وزٹنگ کارڈ بڑھا دیا۔ افتین کو ہر وہ مرد پسند تھا جو اس کی خوبصورتی و سراپے سے متاثر ہو کے اس کی طرف بڑھے سو اس نے انکار کرنے کی ضرورت سمجھی نہ ہی کارڈ تھامنے میں تامل کا مظاہرہ...... باوجود اس کے کہ رضا حسن اس پر جان چھڑکتا تھا افتی نے اپنے حسن کے کسی بھی قدر دان کو نظر انداز کرنے کی غلطی کبھی نہیں کی تھی۔ اس کی بہت سے مردوں سے خفیہ دوستیاں تھیں البتہ تعلقات نہیں تھے کہ وہ تعلقات قائم کرنے سے گھبراتی تھی...... ہاں ان مردوں سے اپنی مرضی کے مطلب نکالتی وہ نئے نمبر کے ساتھ سم تبدیل کرتے ہوئے انہیں خیر باد کہہ دیا کرتی آپ سوچ رہے ہوں گے وہ بار بار نمبر تبدیل کرنے پر رضا سے کیا کہتی ہو گی......

رانگ نمبرز بہت زیادہ آ رہے ہیں اور آپ کو تو معلوم ہے ان فون نمبرز سے کال ریسو نہیں کیا کرتی پلیز مجھے نئی سم لا دیں۔ میں تو بھر پائی! اور رضا حسن ان مردوں میں شمار ہوتا تھا جو بیوی کی محبت میں اتنے اندھے ہوتے ہیں کہ اپنے سامنے بہت کچھ غلط ہوتا انہیں نظر نہیں آتا آئے بھی کیسے بہت خوبصورتی اور کمال مہارت سے ان کے اعتراض کرنے کی وجہ افتین حیدر جیسی بیویاں داش اینڈ کلین کر دیا کرتی ہیں ویسے بھی افتین حیدر جیسی خوبصورت اللہ کا انعام بیوی پر وہ شک کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا جو اسے اس قدر محبت، توجہ اور خدمت کرتی تھی اور والہانہ اظہار بھی رضا کو وہ ناراض کرتی نہیں تھی اور خود ناراض ہو کے لاڈ پیار محبت میں اپنا مطالبہ منوانا رضا سے اس کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا بلکہ ہر مرد سے مطلب نکالنا اسے بخوبی آتا تھا...... بدر افتین حیدر کا نیا شکار تھا یا افتین حیدر کی......اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا مگر ایک بات تھی دونوں ہی اس میدان کے اور اس کے کھیل کے بڑے منجھے ہوئے اور پرانے کھلاڑی تھے افتی کو جو کہانی بدر نے سنائی تھی اس میں ایک فی صد بھی جھوٹ نہیں تھا وہ لاہور میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر کام کر رہا تھا چار بہن بھائیوں میں سب سے آخری نمبر تھا اور اکیلا تھا...... بدر جھوٹ نہیں بولتا تھا کھل کے کھیلنا پسند کرتا تھا جبکہ افتی کی سنائی کہانی میں سچ کے علاوہ باقی سب کچھ تھا کہانی کو کس وقت کیا موڑ دینا ہے۔ یہ اس جیسی منجھی ہوئی کہانی کار کو بخوبی علم تھا۔

☆............☆............☆

کال بیل کی آواز پر افتی نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا سامنے حسب انتظار اور حسب توقع رضا حسن کھڑا تھا۔ دن بھر تھکا پژ مردہ رضا حسن خوشبوئیں بکھیرتی چاندنی وجود والی افتیخید رکو دیکھتے ہی بشاش ہو گیا۔

گڈ ایوینگ ڈیئر وائف! آگے بڑھ کے اسے گلے لگاتے اس کا انداز والہانہ تھا دونوں کا شادی کے بعد کا معمول رہا تھا صبح جاتے اور شام کو آتے ہی ایک دوسرے کے گلے لگ کر بوسہ دینا...... دونوں میں سے کوئی بھی اس عادت کو نہیں بھولتا تھا ہاں جب افتی لڑی ہوتی تب وہ پہل نہیں کیا کرتی نہ ہی رضا کی حوصلہ افزائی...... اس کی ذرا سی ناراضی پر رضا اس کے پیچھے بھاگتا۔ منانا افتی کو بے حد اچھا لگتا وہ اکثر جان جان کے ناراض ہوتی وہ ناراض ہوتے تھک جاتی مگر رضا مناتے کبھی نہیں تھکا۔

''کیوں مجھ غریب پر بجلیاں گراتی ہو وائف! میں تو پہلے ہی تمہارے رعب حسن سے جل بھن چکا'' وہ اسے آتشی گلابی رنگ کے پرنٹڈ سوٹ میں کھلا کھلا دیکھتے نثار ہوتے بولا...... افتی ایک ادا سے اٹھلائی۔

بجلیاں گرانے کو تو بہت سے راہوں میں نظر الفت کے منتظر بڑے ہیں پر میں کیا کروں۔ کہ یہ دل (دل پر انگلی رکھ کے) آپ کے علاوہ کسی کو درخود اعتنا جاننا پسند ہی نہیں کرتا! اس ادا پر کون مر نہ جائے یا خدا...... رضا ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے صوفے پر گرا...... افتی کا جاندار قہقہہ پورے لاؤنج میں بکھر گیا۔

کیا خیال ہے آج کھانا باہر نہ کھایا جائے......'' رضا نے اچانک ہی پروگرام ترتیب دے ڈالا: بالکل بھی نہیں'' افتی کا قطعی لہجہ کچن سے باہر سنائی دیا۔

''ارے وہ کیوں بھئی'' رضا کو افتی کے انکار پر حیرانی ہوئی وہ تو ایسے موقعوں کی تاک میں رہا کرتی تھی اس نے آج گھر پر روسٹ اور چکن پلاؤ بنایا ہے اور اتنی محنت کرنے کے بعد میں ہرگز بھی اپنی محنت ضائع نہیں کر سکتی...... باہر کھانا پھر کبھی کھلا دیجیے گا۔ پانی کا گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھاتے اس کا لہجہ قطعی اور سخت تھا رضا کو اس کے انکار کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

ٹھیک ہے پھر جلدی سے کھانا لگا لو۔ میں فریش ہو جاتا ہوں پھر آئسکریم کھانے باہر چلیں گے''۔

کچن کی طرف جاتے افتی فوراً پلٹی۔

''کیا مطلب...... آج آپ ہمیں ہر حال میں باہر کیوں لے جانا چاہتے ہیں۔؟''

اور آج تم کیوں ہر حال میں انکار کر کے میرا دل توڑنا چاہتی ہو؟'' وہ کمرے کی طرف جاتے جاتے پلٹا...... نگاہوں میں شوخی بھر کے اسے دیکھا افتی نے پاؤں پٹخے اور کچن میں غائب ہو گئی فریج میں بوتل رکھ کے پلٹی تو اپنے پیچھے کھڑے رضا کو دیکھ کے بالکل بھی نہیں چونکی اچھے سے جانتی تھی وہ وجہ جاننے کو پیچھے ضرور آئے گا۔

''بولو...... ڈیئر وائف۔! اس نے ابرو اچکائے آنکھ ماری۔ اس عامیانہ مظاہرے پر افتی کی ہنسی چھوٹ گئی۔

اتنا خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے رضا......وہ پلٹ کر اس کے قریب آئی اور اس کے شرٹ کے بٹن کھولنے لگی......ایکسکیوزمی اتنی اچھی لان کی سیل لگی ہوئی ہے...... میں سوچ رہی تھی وہاں سے کچھ شاپنگ کر آتی اس ایک اینڈ......شرٹ کے بٹن بند کرتی جھکی نگاہیں لرزتے لب بات منوانے کا اپنا الگ انداز...... جہاں ضرورت نہ بھی ہو وہاں بھی ایسی ادائیں مقابل کو گھائل کرنے کو یہ انداز کافی تھے۔رضا دھیمے سے مسکرایا۔

''اتنی سی بات'' اب وہ کھل کے مسکرایا افتی نے چونک کے سر اٹھایا۔

''تیار ہو جاؤ......ابھی چلتے ہیں۔اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

''اوہو......تھینک یو سو مچ رضا۔آپ کتنے اچھے ہیں''۔افتی کو اندازہ تک نہیں تھا کہ وہ اتنی آسانی سے مان جائے گا مہینہ کا آخیر چل رہا تھا اور ان کے گھر کا خرچ بے حد کھلا تھا بھلے رضا کی سیلری بہت اچھی تھی مگر زیادہ کمائی پر خرچے بھی زیادہ ہوا کرتے ہیں پندرہ سے بیس ہزار کی تو صرف افتی کی ہی شاپنگ ہو جاتی اور اگر وہ جاتی اور بچوں کے لیے یا رضا کے لیے کچھ نہ لیتی تو یہ اور بھی زیادتی ہوتی اور افتی چاہے جتنی بھی خود غرض تھی اتنی بہر حال نہیں تھی۔

''مگر رضا......بہت خرچ آ جائے گا اور مہینے کا آخیر......'' افتی کو جیسے ہی اندازہ ہوا کہہ اٹھی کیا فرق پڑتا ہے یار......تمہاری خوشی سے بڑھ کر تو نہیں کچھ......اوور ٹائم کر لوں گا ویسے بھی نیکسٹ منتھ سے آفس میں کام کا لوڈ بہت بڑھ جائے گا میں تم لوگوں کو کہیں باہر لے جا نہیں پاؤں گا نہ ہی زیادہ وقت دے پاؤں گا۔اسی لیے آج تم سب کو باہر لے کر جانا چاہتا تھا تا کہ پھر تم مجھ سے گلہ نہ کرو......وہ اس کی چھوٹی سی ناک دباتے تفصیل بتاتے بولا......افتی کی جگہ کوئی اور ہوتی تو یقیناً اس قدر محبت پر آبدیدہ ہو جاتی مگر افتی کندھے اچکا کر رہ گئی تھی۔

☆..........☆..........☆

اگلے مہینے میں کراچی آ رہا ہوں۔صرف تم سے ملنے بولو ملو گی کہ نہیں؟'' بدر کا انداز دو ٹوک اور قدرے نروٹھا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ وہ پہلے بھی اپنا کام چھوڑ کر اس سے ملنے کے لیے کراچی آیا تھا مگر افتی اس سے نہیں ملی تھی اس کا اسود بیمار تھا مگر اس نے بدر کو جو کہانی سنا رکھی تھی اس میں صرف اتنا سا بدلاؤ کیا کہ اسود اس کا بھتیجا اس کے ساتھ زیادہ اٹیچ ہے اور چونکہ وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے سو وہ اسے مل نہیں سکتی بدر اس بات پر جو بگڑا وہ ایک الگ کہانی تھی مگر اس بار وہ اور کوئی بہانہ بہر حال نہیں سننا چاہتا تھا۔

''جواب دو......ملو گی یا نہیں ملو گی؟'' وہی خفگی بھرا لہجہ افتی دھیمے سے مسکرائی۔آپ کیا مجھے اتنا بے مروت سمجھتے ہیں کہ آپ کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھاؤں گی ہر بار......پچھلی بار بھی ملنا میرے لیے ناممکن نہیں تھا اگر اسود کا مسئلہ نہ ہو جاتا تو؟'' افتی نے پچھلی غلطی کا ازالہ کرنے کی خواہش میں صفائی دی بدر اور بھی چڑ گیا۔

''دیکھو...... مجھے اس بات سے جتنی چڑ ہے تم اتنا ہی اس پر عمل پیرا رہتی ہو......مگر ایک بات کا یقین مجھے اب ہونے لگا ہے کہ

تمہاری زندگی کی ترجیحات میں میں سب سے آخری عزیز ہوں......!'' افتی کا دل دھک سے رہ گیا اتنی کڑی سچائی سن کے! آپ کے میرے جیسے حالات نہیں ناں اسی لیے ایسا کہتے ہیں آسانی سے......ایک بھائی بھابھی کی محتاج یتیم لڑکی جس کے پاس اتنی تعلیم بھی نہیں کہ کوئی عزت کی ڈھنگ کی نوکری کر کے اپنا بوجھ اٹھا سکے سوائے مجبور ہونے کے کرے بھی کیا......میرے پاس سر چھپانے کو چھت نہیں ہے نہ ہی کوئی اور سہارا جس کے برتے پر میں اپنے حالات بدلنے کی کوشش کروں! سہارے تمہارے اردگرد میں مگر تم توجہ دو تب ہی کچھ ہوگا ناں؟'' بدر کا انداز پہلے سے نرم مگر ہنوز نروٹھا سا تھا یہ ان کے درمیان ہمیشہ ہونے والی لاحاصل'' بحث تھی۔

بدر......ہر کام کا ایک وقت متعین ہوتا ہے اور میری اپنے بھائی سے بھابھی سے ایسی بے تکلفی نہیں ہے کہ میں ان سے اپنے منہ سے وہ سب کہوں......جو آپ کہلوانا چاہتے ہیں! وہ ہلکا سا جھنجلائی تو پھر ٹھیک ہے سڑتی رہو بس اس برزخ میں اور پالتی رہو اپنے بھائی کے بچے......لگا دو اپنی جوانی کو گرہن میری بلا سے......'' وہ چیخا۔ افتی نے سر جھٹکا اور بدر کی بات پر عود کر آنے والے غصے کو اپنے اندر ہی دبایا۔

''بدر پلیز......آپ تو میری طاقت ہیں آپ یوں طعنہ زنی کریں گے تو میں ٹوٹ کے بکھر جاؤں گی۔'' وہ رونے لگی تھی اس کی سسکیاں ایرپیس پر ابھرتے ہی دوسری جانب بدر کو اپنے تلخ لہجے کا احساس دلا گئی تھیں۔

افتی......میری جان......آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو تمہاری حالت مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ جان۔ کب تک تم یوں اپنی خواہشات کا رونا روتی رہو گی۔ افتی نے بدر کا موڈ ترنت بدلتے ہوئے جھوٹ موٹ آنسو صاف کیے اور نادیدہ سسکی کا گلا گھونٹا۔

''میری کچھ مجبوریاں میں بدر۔'' افتی نے لہجے کو مزید دھیما کیا۔

''کیسی مجبوریاں......تم یک دفعہ مجھے اپنے بھائی سے ملواؤ تو سہی میں ہماری شادی کی بات کروں گا۔ ہم اچھی اور آسودہ زندگی گزاریں گے افتی......بدر نے جذباتیت کا اعلیٰ مظاہرہ کرتے اپنے دل کی بات اگلی۔ افتی دھیمے سے مسکائی جتنے مردوں سے اس کی دوستی رہی تھی سبھی کی اولین و آخری خواہش افتین حیدر کا ساتھ پانا تھی مگر وہ چیز ہی ایسی تھی............میری اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہوگی بدر......اگر مجھے آپ کا ساتھ مل جائے گا تو؟ مگر پلیز......کچھ وقت دیں......بھائی تک بات پہنچانے کے لیے......ظاہر ہے میں یہ بات ان سے خود تو کہہ نہیں سکتی اور فی الحال کوئی ایسا ہے نہیں جو میرے لیے اسٹینڈ لے۔ اور بھابھی کو کیا پڑی ہے مفت کی نوکرانی سے ہاتھ دھونے کی سو وہ تو کریں گی نہیں......افتی کا لہجہ آپ یوں آپ ہی تلخ ہو گیا۔ تو پھر کون کرے گا ان سے بات......'' بدر کے انداز میں محسوس کی جانے والی بے چینی تھی۔

اللہ بڑا اسبب الاسباب ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکال ہی دے گا۔ افتی نے بھرپور انداز میں تسلی دی۔

اس کی ذات اور کرامات پر تو کوئی شک نہیں ہے لیکن......اب میں گھر بسانا چاہتا ہوں افتی......چند ماہ پہلے تک میں بالکل بھی سنجیدہ نہیں تھا مگر اب میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔ بدر نے بے چارگی سے کہتے افتی کے اندر چھپ کے بیٹھی مکار اور بدچلن عورت کو مسکرانے پر مجبور کیا تھا۔

☆............☆............☆

افتی نے اس روز جو شاپنگ رضا کے ساتھ جا کے کی تھی، ہمیشہ کی طرح بے حد شاندار اور مہنگی تھی اپنی چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلانا اس کی فطرت سے زیادہ اس کی مجبوری تھی بقول اسکے جتنی خوبصورت وہ خود تھی اتنا ہی قیمتی لباس ڈیزرو کرتی تھی کم قیمت لباس اس کے وجود کو ہلکا ظاہر کرے یہ اسے کسی طور پر گوارا نہیں تھا بہر حال۔

افتی نے آج شام کو پہننے کے لیے گلابی اور کاسنی رنگ کا سوئس وائل کا بے حد خوبصورت پرنٹ والا لباس نکالا۔ باقاعدگی سے یوگا آسن کرنے کی وجہ سے دو بچوں کے بعد بھی اس کا جسم ایک انچ نہیں بڑھا تھا۔ وہ شادی سے پہلے کی طرح فٹ اور اسمارٹ تھی اس کی آواز کی طرح بدن میں بھی کافی لوچ تھی ملائی کی مانند نرم و نازک اور سفید جلد رکھتی تھی نفاست سے کیا ہوا میک اپ گولڈن براؤن بال......وہ کسی فلمی ایکٹریس کی مانند حسین دکھتی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ فلمی ایکٹریسز بڑے بڑے اسٹائلسٹ کے ہاتھوں کے جادو کی محتاج تھیں جبکہ وہ قدرتی طور پر بنی بنائی ہی ایسی تھی اور وہ بلا نتیجہ ایسی عورتوں جیسی تھی جو کچھ کیے بغیر بھی بے حد خوبصورت لگتی ہیں ہمیشہ اور ایسا صرف سو میں سے 2 فی صد خواتین ہی دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ کیئر تو خیر ہر ذی روح کو چاہیے اور حسن تو فانی چیز ہے چند سال مزید ٹکانے کے لیے محنت تو کرنا ہی پڑتی ہے کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ افتی کا شمار دونوں قسم کی خواتین میں نہیں ہوتا تھا اسے کچھ کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی وہ بے تحاشا کانشستیں رہتی تھی۔ عام لفظوں میں پاگل کہنا زیادہ مناسب لگتا ہے۔ اور وہ خود کو فٹ اور خوبصورت نظر آتے رہنے کے بارے میں جتنی جنونی تھی اس سے بڑھ کر حسین اور کم عمر نظر آتی تھی......وہ بلاشبہ ایک پرفیکٹ لڑکی تھی۔ رضا کو آنے میں کچھ وقت تھا سو اس نے بچوں کی تیاری کرانی شروع کی ساتھ ہی کھانا گرم کرنے لگی۔ رائتہ سلاد رضا شوق سے کھاتا تھا سو وہ روز ہی بنایا کرتی ابھی بھی بنا ہوا تھا روٹی پکا کر ڈھانپ لی کہ تیار ہونے کے بعد کچن میں جانے پر بہت سی قباحتیں دامن گیر ہونے کا خدشہ تھا۔ ساڑھے پانچ بجے گھر کی بیل بجی وہ دوڑ کر باہر کو لپکی جلدی سے دروازہ کھولا سامنے حسب توقع رضا کھڑا تھا پژمردہ قدرے نڈھال......اُف یہ کراچی کا ٹریفک اور ایک عام مڈل کلاس بندے کی لائف......

اسلام علیکم! بہت فریش موڈ میں خوشبوؤں سے مہکتے وجود کے ساتھ اس نے آگے بڑھ کر رضا کے ہاتھ سے بیگ تھام لیا۔ رضا نے لپک کر بچوں کو اٹھا لیا کس قدر خوبصورت مکمل منظر تھا ہنستی بستی خوشگوار زندگی گزارتے دو حسین میاں بیوی کے حسین بچے۔

آج تو قیامت ڈھا رہی ہو......'' رضا نے نظر بھر کر دیکھا اور مخمور لہجے میں کہہ گیا وہ شگفتگی سے مسکرائی یوں کہ گلابی لپ اسٹک سے سجے ہونٹ سفید آبدار موتیوں کی لڑی کو واضح کر گئے۔

قیامت قیامت نہیں ڈھائے گی تو اور کیا کرے گی ، اس نے بھی ایک ادا سے کہا تھا۔

''ہاں......ہم تو کب کے برباد ہو چکے یہ قیامت تو ہمیں لوٹ چکی ہم تو گھائل ہو گئے......'' رضا نے مصنوعی ٹھنڈی آہیں بھرتے کہا افتی کی مسکراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ جلدی سے کھانا کھالیں......ڈائیلاگز بعد میں بول لیجیے گا ہمیں پہلے باہر لے کر جائیں سیر و تفریح کے

لیے...... کتنے دن ہو گئے ہم اس گھر سے نکلے ہی نہیں۔

اور کوئی حکم میری سرکار......؟ وہ فدا و نثار ہوتا اس پر جھکا۔ افتی نے اسے پرے دھکیلا پہلے اس کی تو تعمیل کریں...... بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ پھر واقعی میں اس نے جلدی سے کھانا کھایا اور انہیں باہر گھمانے کو لے گیا......ڈھیر ساری سیر و تفریح کے بعد واپسی پر اچانک ہی رضا حسن نے امی کے گھر جانے کی فرمائش کر دی۔ افتی کا سسرال جانے کے خیال سے ہی منہ بن گیا۔ مگر بولی کچھ نہیں۔

کتنے دن ہو گئے امی سے ملے ہوئے۔ چلو ان سے ملتے ہوئے چلے جائیں پھر نجانے کب فرصت ملے۔

رضا۔ بہت دیر ہو جائے گی آپکو صبح آفس بھی تو جانا ہو گا ناں......؟ افتی نے اپنا لہجہ نارمل رکھا مبادا رضا جان نہ لے کہ وہ نہیں جانا چاہتی۔

بس تھوڑی دیر بیٹھیں گے پھر جلدی اٹھ جائیں گے......رضا نے بائیک کا رخ امی کے گھر کی جانب موڑتے جلدی سے کہا افتی کو خاموش ہونا ہی پڑا حالانکہ اسے بالکل بھی پسند نہیں تھا اپنی سسرال جانا۔ اسے وہ ہتک اور بے عزتی ابھی تک نہیں بھولی تھی جو اس گھر سے نکالتے وقت اس کی ساس نے اس کی تھی۔ بہر حال وہ ان عورتوں میں سے تھی جو اپنا الو سیدھا رکھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھیں اور اپنی مرضی و منشاء سے جینے کو وہ تھوڑا بہت رضا کی خاطر جبر بھی کرے تو کیا مضائقہ تھا بھلا۔ جس وقت ان کی بائیک گیراج میں آ کے رکی اس وقت عامر ہاتھ میں انڈے بریڈ کا شاپر پکڑے اوپر جا رہا تھا وہ یقیناً ناشتے کا سامان لینے آیا تھا نیچے......گھر کا چھوٹا موٹا کام اسی کے ذمے تھا اکثر ہی کرتا رہتا تھا۔ افتی نے اسے ایک نظر دیکھا اس کی آنکھیں سلگنے لگی تھیں وہ اپنی ہی دھن میں رِکی مونٹن کا کوئی اسپینش گانا گنگناتا جا رہا تھا رکی مونٹن اس کا فیورٹ سنگر تھا اور اسی کی خاطر اس نے خصوصی طور پر اسپینش سیکھی تھی۔

چاچو......عبداللہ اسے پہچانتے ہی چیخا تھا وہ جلدی سے مڑا۔

ارے میرا شیر......وہ وہیں سے پلٹا اور آ کے عبداللہ کو اٹھا کے گلے لگایا اسے بھیا بھابھی کو اچانک دیکھ کر ہی بہت خوشی ہوئی تھی پھر وہ رضا سے بغلگیر ہوا پھر افتی کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ وہ شعلہ جوالہ بنی مسکراتی ہوئی اس کے سامنے تھی۔

کیسی ہیں بھابھی۔ نظروں اور لہجے پر قابو پاتے اس نے بمشکل تمام کہا تھا۔ بھابھی کہنے پر اس نے بڑی مشکل سے خود کو آمادہ کیا تھا ورنہ پہلے تو وہ افتی کہتا تھا بے تکلفی سے اور ان میں بے تکلفی تھی بھی بہت...... یہ ایک الگ قصہ تھا۔

میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو عامر؟ اس کی نظروں میں اپنے لیے ستائش دیکھتی وہ نرمی سے مسکراتی ایک ادا کے ساتھ آگے بڑھی۔

میں بھی ٹھیک ہوں۔ عامر کے قدم سُن پڑنے لگے۔ افتی کا حسن جادو اں اسے بے خود کرنے لگا اور بھائی......آپ کو اچانک کیسے یاد آ گئی ہماری اتنے عرصے کے بعد؟ عامر نے نا چاہتے ہوئے بھی شکوہ کیا اسے تو اجازت نہ تھی بھائی کے گھر جانے کی ورنہ روز ہی جاتا یا وہیں پڑا رہتا۔

"تو تم کونسا روز آتے ہو۔ کتنے سال ہو گئے مجھے علیحدہ گھر لیے غالباً دو سال۔ اور تم ایک دفعہ بھی نہیں آئے میرا گھر دیکھے......"

رضا نے بھی شکوہ کیا۔ تو وہ بے دلی سے ہنس دیا کیا کہتا کہ اس کے گھر جانے پر خود ماں نے اپنی قسم دے کے مجبور کر رکھا ہے۔

آؤں گا بھائی۔ ضرور آؤں گا مگر اکیلا نہیں آپکی طرح کپل کی صورت...... وہ افتی کو نظر بھر کر دیکھتے نرمی سے مسکرا نے بولا۔ افتی بھی مسکرائی دفعتاً بولی۔

کب کر رہے ہو شادی۔ امی جان تو اپنی پسند کی بہو لائیں گی تمہارے لیے ہے ناں جب بھائی نے اپنی مرضی کی...... تو میں اپنی پسند سے شادی کیوں نہ کروں بھلا...... عامر کو سنا یا بُرا لگا تبھی جتلائے بغیر رہ نہ سکا تھا۔

افتی چلتی چلتی رک گئی رضا چلتا رہا اس نے اسود کو اٹھا رکھا تھا...... اسے رکتا دیکھ کر عامر بھی رک گیا۔

تو پھر رضا حسن کی پسند جیسی ڈھونڈ لانا۔ ہے کوئی ایسی تمہاری نظر میں...... جو افتین حیدر کے مقابلے پر لائی جا سکے......'' رضا بھی انہیں رکتا دیکھ کر رک گیا۔

'' آپ جیسا تو کوئی نہیں بھابھی۔ آپ جیسی ڈھونڈنے نکلا تو شاید کنوارا ہی رہ جاؤں عمر بھر......'' اس کے اقرار پر رضا اور افتی کا قہقہہ بے ساختہ تھا...... مگر عامر کے لہجے میں سچائی تھی وہ اتنا ہی متاثر تھا افتی کی خوبصورتی سے...... اتنا کہ اس کے سامنے گنگ ہو جاتا سن پڑ جاتا...... مورت بن جاتا اور وہ ایک ایسا نہیں تھا افتی کے سامنے سب ہی ایسے ہو جاتے نہ ہوتے تو افتی خود کر لیتی۔

پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ میرے بھائی...... زیادہ دکھی مت ہو بس اپنی صلاحیتوں کا استعمال اچھے سے کرو...... رضا نے شگفتگی سے کہتے ہوئے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تینوں ہنستے کھلکھلاتے گھر کے اندر داخل ہوئے۔ طاہرہ بیگم نے انہیں حیرت سے کم اور غصے سے زیادہ دیکھا تھا۔ انہیں عامر پر بے طرح غصہ آنے لگا نئے سرے سے آنے لگا۔ اور افتی اسے تو نجانے وہ ناپسند کرتی تھیں عامر افتی کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا بالکل بے خود اور دیوانہ سا جیسا دیکھا کرتا تھا وہ افتی کے آنے پر یونہی خوش اور بے خود ہو جاتا جیسا اس وقت تھا...... طاہرہ بیگم نے بے حد ناگواری سے اس منظر کو دیکھا۔

یہ ڈائن میرے آنگن کو آگ لگا کر ہی رہے گی ایک نہ ایک دن انہوں نے کلس کر سوچا تھا لیکن اس کے بعد انہوں نے جتنا بھی وقت وہ لوگ وہاں بیٹھے عامر کو وہاں پھٹکنے بھی نہ دیا تھا۔ اور کچھ غلط بھی نہیں کیا تھا۔

☆............☆............☆

طاہرہ بیگم نے آ کر ایسا سوچا تھا تو کچھ غلط بھی نہیں سوچا تھا۔

آج سے پانچ برس قبل جب رضا حسن ان کے سب سے فرمانبردار بیٹے نے افتین حیدر سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی انہیں لگا بربادی نے ان کی چوکھٹ پکڑ لی ہے۔ ان کے ہاں بالکل بھی رواج نہیں تھا کہ پسند کی شادی کی جاتی۔ برسوں سے ان کے ہاں یہ رواج و رسم چلی آ رہی تھی کہ لڑکا اور لڑکی گھونگھٹ پلٹنے پر ہی ایک دوسرے کو دیکھ پاتے۔ ماں باپ کی پسند پر کسی کو بھی اختلاف تو دور رائے زنی کا حق

تک حاصل نہیں تھا اور وقت یہ بات اکثر ثابت کر کے دکھاتا ہی رہتا کہ والدین کے کیے گئے فیصلے بچوں کے لیے کس قدر سودمند اور معاون ثابت ہوتے ہیں......اور ہر ماں کی طرح طاہرہ بیگم کی اولین خواہش بھی یہی تھی کہ وہ اپنے چاند سے بیٹوں کے لیے چاند سی بہویں ہی ڈھونڈ کر لائیں جو شکل وصورت سلیقہ مندی اور سگھڑاپے میں یکتا و مکمل ہوں......مگر پسند ان کی اپنی ہی ہو......ایسے ہیں جب رضا حسن نے افتین حیدر سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تو انہیں تو عینگے ہی لگ گئے سختی سے انکار ہوا انہیں گمان تھا کہ وقتی اُبال ہے خود ہی رضا حسن ٹھنڈے پڑ جائیں گے مگر یہ محض ان کی خام خیالی ہی تھی وقت نے بہت شفاف طریقے سے یہ حقیقت ان پر آشکار کی تھی بیٹے کی خودکشی کی دھمکی اور بھوک ہڑتال نے انہیں سوائے تلملانے کے کچھ نہیں کرنے دیا تھا......افتین حیدر کو وہ کس دل سے بیاہ کر لائیں یہ ان کا دل ہی جانتا تھا مگر لاڈلے کی خاطر انہوں نے اس کڑوے گھونٹ کو بھی حلق سے بھی اُتار لیتیں اگر کہ افتین حیدر کی عادات وحرکات قابل اعتراض نہ ہوتی تو......؟

ان کی بہو خوبصورت وحسین تھی اس کا اعتراف انہیں بھی تھا لیکن شاید اس بات کا احساس ان کی بہو کو سب سے زیادہ تھا......

شادی کے اولین روز......مہکتے ہوئے گزر رہے تھے رضا حسن کو وہ دیوانہ بنے دیکھ رہی تھیں افتی بھی اس پر فدا ہوتی بات قابل اطمینان اور باعث سکون تھی مگر طاہرہ بیگم کے لیے مزید پریشانی کے در افتی رضا کی غیر موجودگی میں سارا دن سارا وقت عامر کے ساتھ ہنسی ٹھٹھوں میں مصروف رہتی......وہ بھی یا بھابی کے کمرے میں پایا جاتا یا افتی اس کے کمرے میں......بھابی کی فرمائش پر ڈھیروں ڈھیر فرمائشی چیزیں لاکے اس کے سامنے ڈھیر کیے رکھتا......ہنسی مذاق کیے جاتے......فلمیں دیکھی جاتیں......بن سنور کر رہنے والی افتی سارا دن بجلیاں گرائے رکھتی......عامر بے خود اور قدرے دیوانہ وار انداز میں افتی کو دیکھنے چھونے کی خواہش رکھتا مگر چھونے سے ڈرتا......افتی اس سب سے بظاہر انجان اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتی......کبھی ہنستے ہنستے اس پر جھول جاتی......اس کے لیے یہ سب عام تھا مگر طاہرہ بیگم جہاندیدہ خاتون تھیں وہ افتی پر شک نہیں کرتی تھیں دیور بھابی میں ایسا ہنسی مذاق یا بے تکلفی کا رشتہ رہتا ہی ہے لیکن جوان بیٹے کی مردانگی سے خوفزدہ تھیں ایک دن وہ لدا پھندا سا گھر لوٹا آتے ساتھ ہی افتی کو آوازیں دینے لگا۔

آتے ہی گھر کیوں سر پہ اٹھا لیا ہے۔خیر ہے؟ انہوں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اپنے تئیں عامر کو لتاڑا......پر وہ نہیں سمجھا اس سادگی میں پوچھ بیٹھا۔

افتی کہاں ہے امی......؟ طاہرہ بیگم نے ناگواری سے اسے دیکھا بھر بگڑ کر بولیں۔

بھابی ہے وہ تمہاری......عمر میں نہ سہی بہرحال رشتے میں وہ تم سے بڑی ہے بھابی کہہ کے بلایا کرو......انہوں نے اسے ٹوکا مگر اس نے اثر نہیں لیا ایک دو بار بھابی کہہ کے پکارا بھی مگر افتی نے روک دیا۔

یہ بھابی جیسا اولڈ فیشن ورڈ میرے لیے کم از کم یوز مت کیا کرو تم......میری پہچان کے میرا نام ہی کافی ہے اور وہ میرا پسندیدہ بھی ہے۔

پسند تو مجھے بھی نہیں ہے مگر امی جان کو بُرا لگتا ہے۔سو اسی لیے نام نہیں لیتا۔عامر نے بھی خوب اپنی مظلومیت و معصومیت دکھائی افتی دانت پیستے بمشکل مسکرائی۔

وہ پرانے زمانے کی پروردہ خاتون ہیں عامر...... ان کے اصول آج کے زمانے میں نہیں چل سکتے...... ہمیں تماشا تو نہیں بننا ناں...... وہ طنزیہ انداز میں ہنسی یوں کہ طنز سارے ماحول میں رچ بس گیا خود سوچو میں صرف عمر میں ہی نہیں دیکھنے میں بھی تم سے کتنی ''چھوٹی'' لگتی ہونا اگر ہم کہیں جائیں تو لوگ کیا تمہارا مذاق نہیں اڑائیں گے......'' عامر نے فوراً کسی سدھائے ہوئے بندر کی طرح اثبات میں سر ہلا کے تائید کی حسن کے سامنے اختلاف رائے کرنے والوں میں سے وہ نہیں تھا وہ بس مبہوت ہونے والوں میں سے تھا مسحور ہی رہتا۔

''دیور بھابھی کا رشتہ بہت مقدس ہوتا ہے بہو۔اس میں عمروں کا تفاوت معنی نہیں رکھتا رشتے کی نزاکت اور احترام معنی رکھتا ہے۔'' افتی کے ہاتھوں کے توتے طاہرہ بیگم کی اچانک مداخلت سے اڑے تھے انہوں نے خوب بھگو بھگو کر ماری تھیں افتی خاموش ہو رہی بولی کچھ نہیں حالانکہ چاہتی تو کئی کرارے جواب اس کے پاس بھی تیار تھے مگر ساس کے سامنے نہ بولنا اس کی خوبی تھی...... وہ ان کا احترام بھی کرتی اور ان سے بدتمیزی بھی نہ کرتی وہ جتنا بھی تلخ ہو جاتیں اتنی روح افزاء کے میٹھے گھونٹ مانند پی ہی جاتی۔

''سوری امی جان...... میں ہی غلط تھی عامر...... آج سے تم مجھے بھابھی ہی کہہ کے بلانا پلیز۔'' اس نے عامر کو تنبیہ کی اور واپس پلٹ گئی...... طاہرہ بیگم چاہتے ہوئے بھی عامر کو کچھ جتلا نہ سکیں اتنی اچھی تو ہے بے چاری۔آپ کیوں خوامخواہ میں خار کھائے رہتی ہیں''۔ اس کے جانے کے بعد عامر کہے بغیر رہ نہیں سکا طاہرہ بیگم نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے عامر...... کہ ماں سے باز پرس کر سکو......''

مگر امی...... عامر نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے بے حد سختی سے ٹوک دیا۔

اپنے کمرے میں جاؤ عامر۔اور وقت بے وقت افتی کے کمرے میں جانے سے پرہیز برتو۔وہ اُبالی اور کھلنڈری ہے مگر تم تو سمجھدار رہو وہ تمہارے بھائی کی بیوی ہے اس کی عزت۔

''امی...... عامر حیرت سے اپنی جگہ جم گیا: آپ مجھے اتنا غلط سمجھتی ہیں؟'' وہ پاؤں پٹختے مڑا ''غلط نہیں سمجھتی مگر کچھ غلط ہو جانے سے ڈرتی ہوں'' اس کے جانے کے بعد وہ خود کلامی کرتے ہوئے بڑبڑائیں تھیں۔

شادی کو چھ ماہ سے زائد کا عرصہ گزر گیا افتی دوسرے جی سے تھی خوب صحت مند ہو رہی تھی خوراک بھی اچھی تھی اور خیال بھی اچھا رکھا جا رہا تھا...... سو اچھی صحت تو ہونی ہی تھی۔ان دنوں تو خیر طاہرہ بیگم بھی اس کا خوب خیال رکھ رہی تھیں۔ویسے بھی روایتی ساس بہو والی عداوت اور کدورت تو ایک دن بھی انہوں نے اس کے ساتھ نہ پالی تھی بس انہیں افتی کی کچھ عادتوں سے اختلاف ضرور تھا۔اسی بات پر اسے اکثر کڑوا کسیلا سنائے دیتیں مگر افتی بُرا مانے بغیر سن لیتی۔مگر اپنی روش پر قائم ضرور رہتی۔کبھی کبھار طاہرہ بیگم کا جی چاہتا وہ پلٹ کر انہیں

جواب ضرور دیئے پھر وہ دل کھول کے اسے سنا سکیں مگر یہ خواہش آہستہ آہستہ ان کی حسرت بن گئی تھی۔ پھر ایک دن انہیں یہ موقع مل ہی گیا۔افقی کے آخری ایام گزر رہے تھے بے حد بھاری جسامت ہوگئی تھی اٹھ کر ملنے جلنے سے بھی عاجز تھی مگر حسن کی حفاظت وہ اس حال میں بھی دل جمعی کے ساتھ کر رہی تھی۔ وہ کچن میں کھانا بنا رہی تھیں اور افقی لاؤنج میں سامنے والی دیوار پر لگے بڑے سے آئینے کے سامنے کھڑی بلیچ کریم لگا رہی تھی۔اس نے آگے پیچھے سے گہرے گلے والی ڈھیلی ڈھالی قمیص پہن رکھی تھی۔طاہرہ بیگم نے کچن کی کھڑکی سے اسے باہر جاتے عامر کو پکارتے دیکھا اور سنا تھا۔

''عامر......پلیز یہ تھوڑی کریم میری پچھلی گردن پر لگا دو گے۔ میرا ہاتھ نہیں جا رہا۔عامر کسی معمول کی طرح بغیر پس و پیش کیے اس کے ہاتھ سے کریم کی ڈبیا تھام کر اس کی گردن کے پچھلے حصے پر لگانے لگا۔

اتنی تو گوری ہو بھابھی۔ پھر فضول میں یہ کریمیں کیوں لگاتی ہو۔تمہیں بھلا ان سب چیزوں کی کیا ضرورت۔ عامر بے لاگ انداز میں تبصرہ کرتے کریم لگا رہا تھا افقی کھلکھلا کے ہنسی۔

ہر چیز کو حفاظت کی ضرورت رہتی ہے۔اور پھر حسن تو چار دن کی جوانی کے ساتھ ڈھلنے والی شے ہے اسے قابو کر کے قائم رکھنا بہت مشکل کام ہے۔اس نے آئینے میں نظر آتے اس کے وجیہہ عکس پر نگاہیں جماتے کہا تھا عامر اسے دیکھ کے مسکرایا'' وزن پر تو تمہارا کنٹرول ہے نہیں موٹی۔حسن پر کیا خاک کنٹرول کرو گی۔'' وہ اس کے کندھے پر دھپ مارتے اسے بتانے کو بولا۔افقی تو نہیں البتہ طاہرہ بیگم ضرور تپ گئیں۔ تیر کی سی تیزی کے ساتھ عامر تک آئیں اور پوری قوت سے تھپڑ اس کی گال پر جڑا۔عامر نے گال پر ہاتھ رکھا۔بے شرم۔بے حیا۔کہا تھا ناں۔اسے یاد نہیں پر تو اس سے اپنا رشتہ اور مقام یاد رکھ کے فاصلے پر رہ۔عامر ہنوز گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔

اسے حیا نہیں کیونکہ وہ حیا والے خاندان سے آئی ہی نہیں مگر تو بھی اپنے خاندان کی لاج گھول کے پی گیا کیا۔کیا منہ دکھائے گا بھائی کو۔زمانے کو اگر کسی کو تیرے ان کرتوتوں کی بھنک بھی پڑ گئی تو۔وہ اس کے سینے پر دو ہتڑ مارتے بولی تھیں تبھی افقی تڑپ کے ان تک آئی تھی۔

''امی جان۔آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ عامر میرے لیے بھائیوں جیسا ہے آپ الزام لگا رہی ہیں مجھ پر۔افقی احساس توہین سلگنے لگی۔

''تم چپ کر۔یہ مجھے تمہاری کوئی صفائی نہیں سننی۔'' وہ حسب عادت تڑخیں جواباً افقی بھی تڑخ اٹھی۔

کیوں نہیں سننی۔بس یوں آپکو خود پر کیچڑ نہیں اُچھالنے دوں گی۔آخر کیا دیکھا آپ نے اس ایک ڈیڑھ سال میں میرے اور عامر کے درمیان۔دیور بھابھی میں بے تکلفی کہاں نہیں ہوتی اور آپ کس قدر گندگی اچھال رہی ہیں مجھ پر۔کتنی گندی سوچ ہے آپکی۔'' افقی پہلی بار اونچی آواز میں چلائی تھی۔

اپنی حد میں رہو بہو۔ مجھے چیخنے چلانے والی لڑکیاں بالکل بھی پسند نہیں۔اور تم میرے صبر کو مزید مت آزماؤ۔اگر مجھے دنیا کا ڈر نہ

ہوتا تو ضرور تمہاری آنکھیں کھولتی۔وہ جواباً قدرے نیچی آواز میں غرائی مگر افتی اور بھی بپھر گئی۔

''آپ نے اتنی بڑی بات کہہ دی اور اب کہہ رہی ہیں کہ میں آپکے صبر کو نہ آزماؤں۔آپ نے مجھے میری ہی نظروں میں گرادیا ہے بلائیں عامر کو۔اور پوچھیں اس سے کہ میں نے کب اس سے بے حیائی کی ہے۔کب میں اپنے مقام سے نیچے گری ہوں۔کیا دیکھا آپ نے میرے اور اس کے درمیان قابل اعتراض۔''غصے سے چہرہ صاف کرتی وہ تیز تیز بولتے ہانپ رہی تھی۔

''تو پھر ابھی جو ڈرامہ رچا رہی تھی وہ کیا تھا۔کونسی بھابھی ہوگی جو یوں اس طرح دیور سے کندھوں کا مساج کرواتی ہوگی۔طاہرہ بیگم نے عامر کی طرف سے غصے سے دیکھتے افتی کو جتلایا تھا۔

تو اس میں غلط کیا ہے۔افتی نے لہجے میں حیرت سموئی۔آپ کے سامنے ہی تو کہا میں نے اس سے۔اپنے کمرے میں بلا کے تو نہیں کہا اور یہ کونسی ایسی قابل اعتراض بات ہے آپ نے بہت گھٹیا چال چلی مجھے رضا کی نظروں میں گرانے کے لیے امی جان۔وہ روتے ہوئے کہتے کمرے کی طرف بڑھی اور یہی شکوہ طاہرہ بیگم نے عامر کی نگاہوں میں بھی دیکھا تھا۔اگلے آدھے گھنٹے میں رضا گھر پر موجود تھا خوب لڑائی ہوئی غضب کی مکالمہ بازی ساس بہو کے درمیان ہوتی رہی۔طاہرہ بیگم کی حسرت اب پچھتاوے میں بدل گئی جب انہیں افتی کے زبان کے جوہر کھلتے دکھائی اور سنائی دیئے بے اختیار اس وقت کو کونسا جس وقت ایسی کوئی خواہش کی تھی۔عامر اور رضا سر پکڑ کر بیٹھتے تھے۔رضا بیوی کی محبت سے واقف تھا وہ اس پر محاورتاً نہیں حقیقتاً جان چھڑکتی تھی عامر الگ دم بخود تھا ماں نے بہو سے عداوت نکالنے کے لیے اس کے کردار کو بھی نشانہ بنایا تھا ایسے میں وہ خواب بھول گیا تھا کہ جتنی بے تکلفی ان کے رشتے میں دکھتی تھی کوئی بھی ہوتا یہی سمجھتا ماں نے پھر ابھی ٹوکا تھا بڑھاوا تو افتی کی منہ زور فطرت نے دیا تھا۔

مجھے اب اس گھر میں ایک پل بھی مزید نہیں رہنا۔رو رو کر اسنے آنکھیں سجالیں تھیں بی پی خطرناک حد تک گر گیا تھا۔رضا کو اس کی جان کے لالے پڑ گئے اس نے دوپہر سے کچھ کھایا تھا نہ ہی پانی کا گھونٹ حلق سے اتارا تھا۔

''ٹھیک ہے مت رہنا۔پہلے تم یہ جوس پی لو۔تمہاری طبیعت کے لیے اچھا ہے۔''رضا کسی نروٹھے بچے کی مانند اسے پچکارا مگر افتی نے گلاس ہاتھ سے پرے دھکیلا۔

اب میں اس وقت تک کچھ نہیں کھاؤں گی جب تک اس گھر سے نکلوں گی نہیں۔مجھے کیا خبر تھی وہ مجھے آپ سے شادی کرنے کی اتنی بڑی سزا دیں گی۔میرے کردار کی دھجیاں بکھیری ہیں انہوں نے رضا۔میں خود سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں رہی کجا دنیا والوں اور عامر کا سامنا کرنا۔مجھے پلیز میرے میکے واپس چھوڑ آئیں۔پلیز رضا۔روتے روتے وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ بیٹھی رضا کا سر جھک گیا بے حد ملول سے وہ یہ سب سوچنے پر مجبور ہو گئے ماں کو ایسی کیا پڑی تھی جو اتنی بڑی بات کہہ گئیں ڈیڑھ سال ہو گیا شادی کو انہیں تو ایک دن نہ محسوس ہوا کہ افتی نے ان کے علاوہ کسی اور کو بھی توجہ دی ہے عامر کے ساتھ تو اس کا رویہ بہت الگ سا رہتا تھا انہوں نے تو اکثر ایسا ہی دیکھا

تھا بالکل ویسا افتی نے دکھایا تھا ایسے میں ماں جو جو بیس گھنٹے گھر میں رہ رہی ہے۔ اس کی طرف دھیان دینے کا اس نے سوچا ہی نہیں۔ افتی۔ پاگل مت بنو اور یہ جوس پیو اب اس وقت کیوں ان لوگوں کو مشکل اور پریشانی میں ڈال رہی ہو۔ رضا سر تھامے بیٹھا رہا افتی نے ایک بھی بات دھیان سے نہ سنی تھی۔

وہ میرے ماں باپ ہیں رضا۔ جو مجھ سے پیار سے زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ افتی نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا رضا کو جتلاتی نگاہوں سے دیکھا۔

"افتی پلیز۔ گھر کی بات گھر میں ہی رہے تو بہتر ہے تم خوامخواہ میں۔"

"گھر کی بات۔ واہ رضا جس گھر میں رہنے والی بات کیا تمہاری ماں نے کی ہے اور کیا ایسی باتیں گھر میں دبائی جا سکتی ہیں؟ وہ سراپا سوال بنی ہمت سے زیادہ طاقت صرف کرنے کی وجہ سے ہانپ رہی تھی۔

"افتی پلیز۔ میری خاطر۔" رضا منمنایا۔

"آپکی خاطر ہی آج تک ہر کڑوی کسیلی کو پیا ہے یہاں تک کہ اب بات کردار پر پہنچ گئی۔ اب نہیں۔ کسی صورت نہیں قطعاً نہیں۔" نفی میں زور زور سے ہلتا سر مختلف الفاظ میں ایک ہی مطلب واضح کر رہا تھا۔

"اتنی نفرت اور کینہ دبا تھا ان کے اندر۔ کاش مجھے رَتی بھر اندازہ ہو جاتا تا کم سے کم آج اتنی کلفت تو نہ اٹھانا پڑتی۔" سوں سوں کر کے ناک صاف کرتی وہ رضا کو مسلسل شرمندہ کر رہی تھی۔

"رضا۔ بہو کو اس کے میکے چھوڑ آؤ۔ طاہرہ بیگم دروازہ میں کھڑی خشمگیں نظروں سے ان دونوں کو دیکھتی بہت سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔

"امی جان" رضا حسن سراسیمگی کے مارے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ باہر نکل گئیں۔

"وہ تمہیں کتنی دیر سے کہہ رہی ہے کہ اسے اس کے میکے چھوڑ کے آؤ۔ اسے چھوڑ ہی آؤ رضا۔ یہاں رہی تو ضد میں نجانے اپنا کیا نقصان کر بیٹھے۔ وہ اپنے اندر کی پریشانی چھپائے بظاہر لاپروائی برت رہی تھیں سچ تو یہ تھا کہ وہ خود بھی دم بخود تھیں اندازہ نہ تھا کہ بہو اتنا بڑا ڈرامہ رچا کے خود کو مظلوم ظاہر کرنے کی ہر ممکن کوشش بلکہ سر توڑ کوشش کرے گی۔ بہر حال وہ اس کی طبیعت کے پیش نظر اب پریشان تھیں انا اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ خود جا کے اسے کچھ کھلا سکیں یا کھانے کو کہہ ہی دیں مگر وہ غلطی پر بھی تو نہیں تھیں اگر وہ انہیں آج نہ روکتیں تو جانے کونسی قیامت آجاتی۔ اور قیامت تو قیامت ہی ہوتی ہے چھوٹی یا بڑی نہیں۔

"امی جان۔ آپ نے اچھا نہیں کیا۔" رضا حسن نے پہلی بار زبان کھولی۔

"مجھے کوئی شرمندگی نہیں۔ بہر حال میں نے جو بھی کیا ہے اپنے بچوں کی دائمی خوشیوں کے لیے ہی کیا۔ یہ کہہ کر وہ رکی نہیں باہر

چلی گئیں۔ رضا حسن بالوں میں انگلیاں پھنسائے لب بستہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ افتی کی دگرگوں حالت کے پیش نظر اسے میکے چھوڑ آیا۔ وجہ یہی بتائی کہ اکیلی وہاں گھبرا رہی ہے اسی لیے چند دن یہاں رہنے کے بعد واپس چلی جائے گی۔ مگر افتی نے اسے اپنی ماں کا بھرم رکھنے نہیں دیا چیخ چیخ کر اس کی ماں کا کیا دھرا سب کچھ کہا گیا رو پیٹ کے گھر والوں کو سنایا اور انہیں اتنا سنایا کہ جب چار روز کے بعد رضا حسن افتی کو لینے کے گئے تو سسر صاحب نے خود داماد کے ساتھ جرح کی رضا حسن کو بہت کچھ کہا گیا۔ انہوں نے سنا بھی اور تحمل و برداشت کا مظاہرہ بھی کیا بالکل ایسا ہی جیسا چار روز قبل ماں کے سامنے کیا تھا۔ افتی اس ٹھنڈی مٹی کے انسان کو دانت پیس کر دیکھتی رہ گئی۔ پر اس کے ساتھ واپس نہیں گئی رضا کی امید اور آس بھری نظروں کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود بھی۔ ویسے بھی بات تو اب سسر کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تھی کہ کنارے لگ کے ہی ختم ہونا تھی۔ رضا حسن خالی ہاتھ و خالی دل واپس پلٹ گیا۔

عامر الگ ماں سے ناراض تھا ان کے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتا۔ بھوک ہڑتال جاری تھی مگر طاہرہ بیگم نے زیادہ توجہ نہیں دی بس اتنا ہی کہا۔

"میرا شمار غلطیوں پر پردہ ڈلنے والی ماؤں میں نہیں ہوتا عامر۔ گریبان میں جھانک کے دیکھو۔ سچ جھوٹ اور زیادتی سب نظر میں آجائے گا کچھ غلطیاں عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتی ہیں اور پچھتاوے ہمیشہ خسارے بھرتے ہیں زندگی میں۔ کیا تمہیں زندگی میں خسارے شمار کرنے ہیں۔ عامر کا سر جھک گیا آنکھیں بھر آئیں ماں نے سوال نہیں کیا تھا جوتا بھگو کے مارا تھا۔ وہ بلک بلک کے رویا۔ ساری رات رویا ماں نے آگے بڑھ کے گلے سے نہیں لگایا بس کندھے پر تسلی کے لیے ہولے سے تھپکی دی دلاسہ بھی ملا اور غلطی کرنے کے باوجود ماں کے ساتھ کی شہ بھی نہ ملی۔ طاہرہ بیگم کو عامر کی شرمندگی بے حد اچھی لگی وہ بے حد ہلکی پھلکی ہو گئیں قیامت کو قیامت نہیں بننے دیا تھا پہلے مرحلے پر ہی روک دیا تھا اس کے بعد رضا کو الگ گھر لے کر رہنے پر راضی کرنے والی بھی وہ خود ہی تھیں عبداللہ کی پیدائش کے سوا مہینہ بعد افتی نے اپنے اور رضا کے علیحدہ گھر میں ہی گئی تھی مگر اکیلی بچہ سنبھال نہیں سکی دوبارہ پھر واپس آ گئی طاہرہ بیگم نے پرانی باتیں بھلا کر بہو اور پوتے کی جی جان سے خدمتیں کیں لاڈ اٹھائے۔ افتی نے بھی اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے اپنا رویہ نرم اور لچک دار بنا لیا ویسے بھی اس کا شمار موقع سے فائدہ اٹھانے والوں میں ہوتا تھا جو دل میں بغض و عناد تو پالتے ہیں مگر انا کا پرچار نہیں کرتے۔ بس اپنا الو سیدھا رکھتے ہیں۔

عامر اب کی بار افتی سے کھینچا کھینچا رہا۔ شاید اپنی غلطی کا احساس دل میں ہی ہو گیا تھا۔ مگر اس کی یہ احتیاط افتی کو اپنی ہتک محسوس ہوئی وہ جان بوجھ کے اسے زچ کرتی عبداللہ کی ضروریات کی لسٹ اسے بنا کر تھما دیتی ناچار اسے لانا پڑتی۔ مگر ماں کا خوف ہمیشہ دامن گیر رہتا افتی کے دل میں چنگاری آگ پکڑنے لگتی وہ کیوں تھا اپنی ماں کا اتنا فرمانبردار۔ اس کے لیے افتی کی جنبشِ ابرو کی اہمیت کیوں نہیں تھی۔ جیسے پہلے ہوا کرتی تھی۔ اسے اب بھی ایسا ہی کرنا تھا مگر وہ موقع کی تلاش میں تھی۔

☆............☆............☆

اور پھر اسے موقع نہیں مواقع ملے اور ایک بار نہیں کئی بار......!

افتی نے ان مواقع سے خوب خوب فائدے اٹھائے اور بار بار اٹھائے۔ عامر کا التفات پھر سے افتی کی طرف ہو گیا گھر میں ویسے ہی فساد دوبارہ سر اُبھارنے لگے طاہرہ بیگم کی ہر دکھتی رگ کو افتی نے پکڑا اور پکڑ کر مسلا۔ ان کے دونوں بیٹے افتی کے دیوانے تھے اور طاہرہ بیگم انہیں اس کا دیوانہ ہوتے دیکھ رہی تھیں مگر وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھیں۔

عبداللہ ڈیڑھ سال کا ہو گیا جب افتی دوبارہ اُمید سے ہوئی۔ انہی دنوں عامر افتی کے سامنے آ کے ٹھہر گیا۔ وہ ڈھائی سال سے آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتے تھک گیا تھا۔

ماں کی لعن طعن اور ملامتی نظریں اس کو اپنے دامن کو داغدار ہو جانے کا بخوبی احساس دلاتیں مگر وہ مجبور تھا اپنے دل کے ہاتھوں اور افتی کی زندگی اور مجبوریوں کی خاطر۔ وہ اپنے بھائی سے متنفر تھا جس نے افتی جیسی امیر اور حساس لڑکی کی زندگی اجیرن کر رکھی جو اتنی خوبصورت بیوی کو چھوڑ کر باہر کی عورتوں میں دلچسپی لیتا تھا جو افتی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے سب۔ ایک ہی ٹیبل پر کھانا بھی کھایا جاتا مگر۔ عامر کو نظر نہیں آتا اس کی آنکھیں تھیں مگر چشم بصیرت افتی کی عطا کی ہوئی تھی۔ اسے وہی نظر آتا جو افتی دکھاتی رضا حسن کا التفات، محبت اور والہانہ پن واضح ہونے کے باوجود بھی عامر دیکھ نہیں پاتا۔

افتی عبداللہ کو تیار کر کے سیڑھیاں اُتر رہی تھی۔ خود بھی خوشبوؤں میں بسی تر و تازہ سی مہکتا ہوا گلاب بنی ہوئی تھی۔ عامر چند لمحے مبہوت ہو کے کھڑا رہا۔

”تم رضا سے طلاق لے لو افتی۔ میں تمہیں اپنانے کو تیار ہوں؟ وہ اس کے سامنے ٹھہرا تھا مگر افتی پورے قد سے گری۔ کھیل ہی کھیل میں بات یہاں تک جا پہنچی تھی۔

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟“ افتی کا غصہ عود کر آیا۔

”یہ بکواس نہیں ہے افتی۔ میں سچ کہہ رہوں رضا کو نہ تم نظر آتی ہو نہ تمہاری خدمت اور وفائیں تو پھر کیا ضرورت ہے تمہیں کہ تم اپنی زندگی تباہ کرو۔ دیکھو میں تمہارا قدردان ہوں میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ افتی کا دماغ بکل سے اڑ گیا۔ وہ اسے کیا جواب دے کیسے سمجھائے مذاق ہی میں عامر اس نہج پر بھک گیا کہ اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ بات بگڑ رہی تھی عامر کی جذباتیت اس کے آشیانے کو جلا سکتی تھی۔ افتی نے آنے والے وقت کا حساب کتاب لمحوں میں کیا اور پھر اسے سمجھایا۔

”پاگل پن کی باتیں مت کرو عامر۔ تمہاری ہمدردی ایک طرف مگر زمانہ تو میرے پر ہی تھو تھو کرے گا ناں۔ وہ سنبھل کر پیچھے ہٹی عامر دو قدم آگے بڑھ آیا۔ اس کی چال متوازن اور مضبوط تھی یوں جیسے وہ فیصلہ کر کے آیا ہو۔ افتی کو پہلی بار اس کی جرات سے خوف محسوس ہوا۔

”کیوں کرے گا زمانہ تھو تھو۔ آپکی اپنی زندگی ہے آپ اسے جیسے مرضی گزاریں یہ آپکا قانونی و شرعی حق ہے۔

''رضا جیسا بھی ہے میرا شوہر اور میرے بچوں کا باپ ہے عامر۔ میں ایسا نہیں کر سکتی پلیز۔اس نے ڈرامے میں رنگ بھرا۔

''مگر افتی۔تمہاری زندگی کا کیا ہو گا جو تم اتنی اذیت سے گزار رہی ہو۔ عامر بضد تھا۔عورت کی زندگی اسی وقت ختم ہو جاتی ہے عامر۔ جس وقت وہ ماں بن جاتی ہے اب میں صرف ایک ماں ہوں اور مجھے اپنے بچوں سے ان کا باپ نہیں چھیننا اور پھر تم جانتے ہو دنیا والے کیا کہیں گے کہ ایک بھائی کو چھوڑ کر میں نے دوسرے کو پھانس لیا اور پلیز عامر۔ میں سب کچھ سن سکتی ہوں مگر اپنے کردار کے حوالے سے ایک لفظ نہیں اس نے ہاتھ اٹھا کر عامر کو ٹوکا اس کا لہجہ قطعی اور خشک تھا تمہیں اپنی نہ سہی مگر مجھے تمہاری ضرور پرواہ ہے افتی۔ میں تمہیں اس برزخ میں نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے ہم باہر شفٹ ہو جائیں یہ محلّہ شہر کیا یہ ملک ہی چھوڑ دیں گے تم بس ایک دفعہ حامی تو بھرو۔ وہ لجاجت سے کہتا اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''عامر۔ رضا حسن میرا شوہر ہے جس سے میں بے پناہ محبت کرتی ہوں اتنی کہ اس پر اپنی جان وار دوں۔تم نہیں سمجھو گے کیونکہ تم نے ابھی کسی سے محبت جو نہیں کی۔'' اس نے ایکدم ہنستے مسکراتے لہجے میں اپنی ٹون بدلتے کہا تھا رضا حسن نے افتی کے کہے الفاظ آخری سڑھیوں پر کھڑے ہو کے سنے اور مسکرا دیے۔انہیں اپنے انتخاب محبت پہ فخر محسوس ہوا۔دل گداز ہو کے دھڑ کا ایسی محبت کرنے والی بیوی نصیب والوں کو ملتی ہے۔

''السلام علیکم ایوری باڈی!'' عامر کے جواب میں کچھ کہنے سے پہلے ہی رضا حسن آگے بڑھ آئے عامر نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کچھ بولا نہیں ورنہ ان دونوں بھائیوں کے تعلقات خوامخواہ میں خراب ہوتے۔

''وعلیکم اسلام! ابھی آپ کا ہی ذکر ہو رہا تھا۔'' آگے بڑھ کے عبداللہ کو رضا حسن کی گود میں بٹھاتے افتی نے کھنکتے ہوئے لہجے کہا تھا۔

''اس کا مطلب ہے دل کو دل سے راہ ہوتی ہے میں ابھی سوچ رہا تھا کہ کہیں میں لیٹ تو نہیں ہو رہا کیونکہ اگر میں لیٹ ہو گیا تو بیگم صاحبہ کا موڈ خراب ہونے میں لمحے کی تاخیر بھی نہیں ہو گی کیوں عامر۔ بشاش لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے عامر کو بھی زبردستی گفتگو میں شامل کیا اور عامر اتنا بے وقوف تو تھا نہیں کہ دل کی بربادی عیاں ہونے دیتا خاموشی سے بھائی کی ہاں میں ہاں ملاتے پلٹ گیا۔لیکن اس روز کے بعد افتی نے دوبارہ سے رضا حسن کو الگ گھر لینے کے لیے زچ کر دیا اور رضا حسن اتنا زچ ہوئے کہ اسود کی پیدائش سے پہلے ہی اپنے الگ گھر میں شفٹ ہو گئے افتی نے عامر جیسے بے وقوف مرد سے جان چھوٹنے پر جیسے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

☆............☆............☆

''بیس تاریخ کو میں صبح یہاں سے نکلوں گا افتی۔ اور اسی شام پلیز تم مجھ سے ملنے کی کوشش کرنا۔'' بدر کے لہجے میں واضح تڑپ اور جدائی کی باس تھی۔ ''میں یور پی کوشش کروں گی بدر مگر آپ بھی جانتے ہیں کہ شام کو میرا گھر سے نکلنا کتنا مشکل ہوتا ہے بھیا بھابھی گھر واپس آ چکے ہوتے ہیں پھر رات کے کھانے کی تیاری الگ کرنی پڑتی ہے۔ بہت مشکل ہو گی۔'' افتی نے لہجے کو حتی الوسیع رقت آمیز بنانے

کی سعی کی گویا اسے بھی ملنے کی ہڑک ہے مگر مجبوری دامن گیر ہے۔

''تو تم نہیں ملوگی۔؟ بدر کا لہجہ ٹھہر گیا خشک اور کھردرا''

''میرے بس میں ہو تو اڑ کے آپ کے پاس آجاؤں اور بس آپ کو سامنے بٹھا کر تکتی رہوں بالکل کسی داسی کی طرح۔'' بدر اس کی بے تابی پہ محظوظ ہوا۔

''میں اس دفعہ تمہارے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں ہمارے رشتے کی بات کے لیے۔

''ابھی نہیں پلیز۔افتی بولی۔

''کیوں۔'' بدر کی ابرو تن گئی۔

''ابھی حالات ہمارے حق میں موافق نہیں ہیں بدر۔ بھیا خاصے پریشان ہیں ان دنوں۔ بھیا اور بھابھی کے درمیان کشیدگی چل رہی ہے ایسے میں بھیا کوئی فیصلہ نہیں کر پائیں گے بہتر یہی ہے کہ تھوڑا صبر کر لیا جائے اور مناسب وقت کا انتظار کیا جائے۔افتی نے اسے سمجھایا۔

''پچھلے چھ ماہ سے وہ مناسب وقت نہیں آرہا تمہاری زندگی میں افتی اور ادھر میں تڑپ رہا ہوں تمہاری ایک جھلک پانے کو۔کمال ہے یار تم بھی حد کرتی ہو بے اعتنائی کی۔'' وہ حسب عادت جلد ہی ناراض ہوا۔افتی نے اس گھامڑ کو دل ہی دل میں ایک عدد موٹی گالی سے نوازا اور بظاہر نرمی سے مسکرائی دفعتاً بولی آپکو صرف اپنی محبت اور بے تابی نظر آتی ہے بدر۔ میری تڑپ مجبوری اور بے کسی نہیں۔ میں اس زندان میں کتنی مشکل اور تکلیف دہ زندگی جی رہی ہوں صرف میں ہی جانتی ہوں۔ میری نمازیں لمبی اور سجدے طویل ہونے لگے ہیں ایک ہی دعا کی قبولیت مانگتے کہ جلد از جلد مجھے آپکا ساتھ مل جائے۔اور آپ ہو کے ہر وقت مجھ پر مشکوک رہتے ہیں۔ بے حد افسردہ اور نروٹھا لہجہ اپنائے افتی نے بدر کو شرمندہ کیا تھا اسے اپنے الفاظ کی سنگینی کا فوری ادراک ہوا۔

''سوری جان۔ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں مگر تم خود سوچو دو سال سے ہمارا ریلیشن تب شروع ہوا ہوا ہے اور تم ان دو سالوں میں ایک دفعہ بھی اپنے بھیا بھابھی سے ہمارے رشتے کے لیے بات نہیں کر سکی ہو۔ وہ اُلجھا ہوا بولا یوں جیسے ذہنی طور پر انتشار کا شکار ہو۔

''دو سال سے ہم فقط اچھے دوست'' تھے بدر۔ پرپوز تو آپ نے مجھے چھ ماہ پہلے کیا ہے۔

افتی نے نروٹھے پن سے کہتے اس کی تصحیح کی تو بدر نا چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔

''چلو پرپوز چھ ماہ پہلے کیا تھا مگر محبت تو دو سال سے کرتا ہوں اس کا تو تمہیں پتا تھا پھر تم میری مزاج شناس ہو تمہیں معلوم نہیں تھا کیا کہ میں تمہیں ہی اپنا شریک سفر چنوں گا۔؟'' وہ زیر لب مسکراتا شوخی سے کہتا بظاہر سنجیدہ تھا۔

''جی نہیں۔ مجھے غیب کا علم نہیں ہوتا۔افتی کی ناک چڑھ گئی نروٹھے پن سے کہتے بدر کو اپنی ناراضی کا بخوبی احساس بھی دلایا۔

''ناراض ہوگئی ہو۔'' وہ متبسم لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔

''تو کیا ناراض ہونے کا ''حق'' صرف آپکو ہی ہے؟'' وہ جواباً سوال کررہی تھی۔

''میں نے ایسا تو نہیں کہا۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں غصہ بالکل بھی نہیں کرنا چاہیے غصہ حسن کو کھا جاتا ہے برباد کردیتا ہے۔'' وہ مائل بہ شرارت تھا۔

''اچھا بس بس۔ اب زیادہ چکنی چپڑی باتیں نہ کریں۔ دل جلا کر زبردستی مسکرانے پر مجبور کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔'' افتی اپنی تعریف سن کے ٹھنڈی پڑتے ہوئے بظاہر ناراضی سے بولی۔

''یار۔ بس تمہیں پتا تو ہے کہ میں شارٹ ٹمپرڈ بندہ ہوں مگر بخدا میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں ہوتا بس غصے میں الٹا سیدھا بول جاتا ہوں تم دل پر مت لیا کرو پلیز۔'' اب کی بار وہ واقعی میں سنجیدہ تھا۔

''بدر۔ مجھے آپکا شک تکلیف دیتا ہے۔ میرا دل دکھتا ہے آپ کی بدگمانی پر۔ کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ میرا خود کا اپنا ایک گھر ہو جہاں مجھے سکون اور محبت کے ساتھ ساتھ آپ کا پیار اور ساتھ ملے۔ ہمارا ساتھ ہماری خوشیاں دائمی ہوں اور پائیدار ہوں۔ مجھے اس برزخ سے نجات مل جائے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ جہاں میری قدر ہو میری وفاؤں اور خدمتوں کا اعتراف کیا جائے تاکہ مجھے اور میری ذات کو فار گرانٹڈ لیا جائے۔'' وہ جذباتی ہو کے رونے لگی تھی اداکاری میں تو خیر اسے ملکہ حاصل تھا بدر کا دل پسیج گیا شرمندہ الگ ہوا۔

''پلیز افتی مت رو۔ میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا میں بس اپنی تنہائی سے تنگ آ گیا ہوں یار۔ اکیلے رہتے رہتے اب تھک گیا ہوں بارہ سال ہو گئے مجھے تنہا رہتے ہوئے۔ بارہ سال کی تنہائی مجھے عمر قید لگتی ہے اب جب سے تمہارا ساتھ ملا ہے میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل کر کے اپنی زندگی ''جینا'' چاہتا ہوں اپنی تنہائی کو الوادع کہنا چاہتا ہو ہمیشہ کے لیے...... ہاں بس میں تھوڑا جذباتی ہو جاتا ہوں اور پھر اپنی جذباتیت میں تمہیں بھی دکھی کر دیتا ہوں۔ پلیز میری محبت کی خاطر ہی مجھے معاف کر دیا کرو تم۔'' وہ سچے دل سے معافی مانگ رہا تھا سچائی، کھراپن اس کی خصوصیات تھیں۔

''آپ بالکل بھی شرمندہ مت ہوں بدر۔ آپکی شرمندگی مجھے تکلیف دے رہی ہے۔ میں آپ کی محبت سمجھتی بھی ہوں اور اس کی قدر بھی کرتی ہوں بلکہ مجھے خود پر فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں آپکی پسند ہوں اور آپ تو ہو ہی کامل اور یکتا دولت و وجاہت کے ساتھ ساتھ اتنا خوبصورت دل بھی رکھتے ہیں آپ کی خواہش تو ہر دوسری لڑکی کو ہوگی۔'' افتی نے کچھ اتنے خوبصورت انداز میں اپنے دل کی بات بدر تک پہنچائی کہ وہ چند لمحے پہلی کی کلفت و سنجیدگی برطرف کیے دل سے افتی کی محبت پر فخر محسوس کرتے ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ وہ خود صاف نیت کا کھرا بندہ تھا اسی لیے دوسروں کی نیت کو بھی ویسا ہی سمجھتا تھا۔

''اچھا بس میں نے تمہارے لیے کچھ شاپنگ کی ہے مگر میں مطمئن نہیں ہوا۔ اصل میں تمہین پتہ تو ہے کہ مجھے خواتین کی شاپنگ کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے سو پلیز تم مجھے بتا دو کہ تمہیں کیا پسند ہے میں تمہارے لیے وہی خرید کر لے آؤں گا۔'' وہ بات بدلتے افتی کے

پسندیدہ موضوع پر آ گیا۔

''بدر پلیز...... مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے آپ کو ایک جھلک دیکھ لوں تو میرے لیے وہی ہفت اقلیم کی دولت سے کم نہیں ہوگا۔'' دل میں پھوٹتے لڈوؤں کو چھپائے بہ ظاہر اس نے عاجزی و محبت کا مظاہرہ کیا تھا بدر دلکشی سے ہنس کے مسکرایا۔

اور میں ہرگز بھی نہیں چاہوں گا کہ میں تمہیں خالی ہاتھ ملنے آؤں۔'' بدر نے افقی کو لا جواب کیا۔

''تو آپ خالی ہاتھ کہاں ہوں گے۔ اپنا ڈھیر سارا ٹائم اور محبت ہو گی ناں آپکے ہاتھوں میں میرے لیے.....'' اس نے اب کی بار بدر کو لا جواب کرتے ہوئے کہا۔

''باتوں میں میں تم سے نہیں جیت سکتا۔'' وہ گہری سانس لیتے جیسے ہار مانتے ہوئے بولا۔ افقی دل سے مسکرائی اپنی اسی خوبی پر تو اسے تکبر کی حد تک ناز تھا۔

☆............☆............☆

بچوں کو سلانے کے بعد وہ رضا کے پاس آئی تھی جو اپنے فوکل گلاسز لگائے نگاہیں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر جمائے بیٹھا بہت مصروف نظر آ رہا تھا۔

افقی نے نائٹ ڈریس پہن کر بالوں میں خوب ڈھیر سارا تیز تیز برش پھیرا اور نائٹ کریم کا مساج چہرے پر کرنے کے بعد بیڈ روم کی لائٹس آف کر دیں۔ رضا نے لمحہ کے لحہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا وہ جان گیا تھا کہ افقی کا موڈ اب آرام کرنے کا ہے اور وہ رضا کو بھی کام کسی طور نہیں کرنے دے گی۔

''پلیز یار ایک منٹ۔ رضا کے جب اچانک افقی نے آ کے فوکل گلاسز اتارے تو وہ بے ساختہ کہے بغیر رہ نہیں پایا تھا۔

''بالکل بھی نہیں۔ آدھ سیکنڈ بھی نہیں سارا دن آفس میں کام ہی کرتے ہیں جناب گھر آ کے بھی اسی کام میں مصروف رہیں گے تو پھر ہم تو چلے ہی جائیں یہاں سے۔ نہ آپکو ہماری پرواہ ہے نہ ہی اپنی صحت کی۔'' وہ ناراضی سے منہ پھلائے کہہ رہی تھی اور رضا حسن شرارت اور مسکراہٹ کو باہم لبوں میں پیوست کیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی محبوبہ بیوی کے محبوبانہ انداز میں بہت پیار آ رہا تھا اسے افقی کا یہی فکرمندانہ انداز بہت پسند تھا اس کا یہ انداز اس کی ساری کلفت تھکاوٹ دور کر دیا کرتا تھا۔

''تم لوگوں کے لیے ہی تو اتنی محنت کر رہا ہوں یار۔'' آنکھیں مسلتے رضا نے آہستگی سے دل ہی دل میں اپنے بے حد تھکے ہونے کا اعتراف کرتے کہا۔ وہ واقعی میں بہت تھک چکا تھا بس زبردستی خود کو بشاش کرنے کی کوشش میں کام میں جتا ہوا تھا۔

''ہمیں ایسی سہولتیں اور آرام دہ زندگی ہرگز نہیں چاہیے رضا۔ جو آپ اپنی نیند اور آرام تج کر ہمیں پہنچائیں ہم تھوڑے میں بخوشی گزارہ کر سکتے ہیں مگر آپکو انسان کی بجائے مشین بنا کر خود کو مصروفیات کے حوالے نہیں کر سکتے۔'' رضا اس کی پریشانی دیکھ کر بے حد ہلکا پھلکا ہو گیا۔

''میرا دل چاہتا ہے کہ میں تم لوگوں کی ہر خواہش پوری کروں دنیا بھر کی ہر آسائش تم سب کے قدموں میں لا کے ڈھیر کر دوں۔تم شہزادیوں جیسی آن بان رکھنے والی میری بیوی ہی نہیں محبوبہ بھی ہو اور اتنے چھوٹا گھر میں رہنا تم ہرگز بھی ڈیزرو نہیں کرتیں۔افتی پہلے بھی جانتی تھی رضا حسن کی اپنی فیملی کے لیے پالی جانے والی خواہشات اور ان کی تفصیل۔اس وقت تو اسے نیند آ رہی تھی اور وہ اس قصے کو ختم کر کے سونا چاہتی تھی۔تبھی بات کو سمیٹتے ہوئے بولی تھی۔

''میرا جو نصیب تھا اور جو میری اوقات تھی اس کے حساب سے میرے رب نے مجھے نوازدیا ہے اور میں اس کی رضا میں ہر آن خوش رہتی ہوں۔اب پلیز اٹھ جایئے بہت نیند آ رہی ہے صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے پھر سارا دن میں کسلمندی کا شکار رہتی ہوں۔'' رضا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے اس نے بات ختم کی!

مگر رضا شاید بات ختم کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''تم دنیا کی سب سے اچھی بیوی ہو۔'' رضا نے والہانہ انداز میں اٹھ کے اس پر جھکتے اعتراف کیا تو وہ بے ساختہ ہنس دی۔ایک پرفیکٹ بیوی۔صورت سیرت میں کامل اور بھرپور وہ مزید شوخ ہوا تو افتی کو بدر یاد آ گیا وہ بھی تو یہی کہتا رہتا تھا۔

''ہم ایک پرفیکٹ کپل ہوں گے افتی...... دنیا والے ہمیں دیکھ دیکھ کے رشک کیا کریں گے جب ہم ایک ساتھ چلا کریں گے تو لوگ ہمیں کھڑے ہو کے دیکھا کریں گے'' افتی نے سر جھٹک کر خود کو کمپوز کیا۔

''کیا وہ اتنے پیارے دل کو توڑ سکتی ہے۔افتی نے اپنے اندر گونجتے سناٹے سے سوال کیا۔''

☆............☆............☆

کچھ دن اس کی یہی کیفیت رہی اس پر عجیب سی یاسیت اور ملال طاری رہا۔بدر اب بھی ویسے ہی سارا سارا دن آفس ٹائمنگ کی پرواہ کیے بغیر اسے کالز کرتا مگر وہ ٹھیک طرح سے اس سے بھی بات نہ کر پاتی تھی ایک عجب سا احساس اس کے اردگرد گھیرا ؤ ڈالنے لگا تھا۔وہ اپنی کیفیات خود بھی نہیں سمجھ پا رہی تھی۔رضا نے اس کی گھر بچوں اور خود میں عدم دلچسپی دیکھی تو استفسار کیا بے اسے جیسے تیسے کر کے مطمئن کر ہی لیا تھا۔مگر یہ ایک وقتی فیز تھا بہت دنوں کی سوچ بچار کے بعد وہ ایک فیصلے پر آ کے مطمئن ہو گئی تھی اور پھر پہلے جیسی افتی بن گئی تھی وہ ایک اچھی کہانی کار تھی۔کہانی کو کس وقت کونسا اور کیا موڑ دینا ہے اس کے زرخیز ذہن میں سارا لائحہ عمل واضح اور مکمل تھا۔وہ فطرتاً خود غرض اور خود پسند تھی سو احساسات بہت کم وقت کے لیے اس پر حاوی رہ پاتے تھے رضا حسن اسے پہلے جیسی افتی بنا دیکھ کے مطمئن ہو گیا۔بدر الگ خوش تھا وہ آجکل کراچی آنے کی تیاری میں مصروف تھا۔وہ افتی سے ملنے آ رہا تھا۔جو اس کی زندگی کی پہلی خواہش تھی۔ایک ایسی لڑکی جس کے ساتھ اس نے زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔وہ زندگی جینا چاہتا تھا خوش رہنا چاہتا تھا خوشیوں کے ہنڈولے میں افتی کے ساتھ جھولنا چاہتا تھا۔وہ ایک کامیاب ازدواجی زندگی بسر کرے گا وہ ایک اچھا اور ذمہ دار حساس شوہر ثابت ہوگا وہ اپنے والدین جیسی زندگی نہیں

گزارے گا اس نے سوچ لیا تھا۔ وہ اپنے والدین کی طرح کبھی بھی اونچی آواز میں جھگڑا نہیں کریں گے۔ بچوں کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ وہ بالکل بھی گھر کو آفس کی ذمہ داریوں میں مگن ہو کے بھولے گا نہیں۔ وہ کام کو صرف آفس میں کرے گا۔ گھر پر سارا وقت افتی اور بچوں کے لیے رکھے گا۔ وہ خود ایک بروکن فیملی کا حصہ تھا اور اپنی ذات کے اندر ڈیرہ ڈال کے بیٹھی ساری محرومیوں کو اپنے بچوں کی تمام حسرتیں پوری کر کے ختم کرے گا۔ مستقبل کی ساری خواہشیں سارے خواب اس نے پلکوں کی مانند اپنی آنکھوں میں سجا لیے تھے وہ خواب کراچی آ کے اسے افتی کی مانگ میں سجانے تھے۔ صرف وہی اس بھری دنیا میں مخلص اور خالص لڑکی تھی جو ان خوابوں کو سینت کر رکھ سکتی تھی۔ جوان خوابوں کی قدر کر سکتی تھی جو اسے ویسی ہی زندگی فراہم کر سکتی تھی جیسی زندگی وہ خود اپنے بچپن میں اپنے والدین کو گزارتا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا افتی اس کے خوابوں سے واقف ہے اس کے دل سے بھی اور اس کی محرومیوں سے بھی۔ وہ اسے نا اُمید نہیں کر سکتی تھی بدر کے خیال میں وہ اسے مایوس کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ بہت اچھی تھی دنیا کی سب سے پیاری لڑکی جو خود غرض بھائی بھابھی کے در پر پڑی ان کی نوکری کر رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مخلص ساتھی وہمدرد تھے دونوں ہی اپنی اپنی زندگی سے دکھی تھے خوشیوں سے محروم تھے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو خوش رکھ سکتے تھے یہ بدر کا ذاتی خیال تھا جو روز بروز پختہ یقین میں بدل رہا تھا۔ وہ افتی سے محبت کرتا تھا۔ اور محبت کی تمام حدیں پار کر چکا تھا۔

☆..........☆..........☆

اس نے پارکنگ میں گاڑی پارک کرتے ہی افتی کو کال ملائی تھی۔ لبرٹی میں حسب معمول بہت زیادہ رش تھا وہ یہاں افتی کے لیے شاپنگ کرنے آیا تھا۔ ساری دنیا خوش تھی کیونکہ وہ خود خوش تھا۔ اس کا دل چاہتا وہ ایک ایک بندے کو پکڑ پکڑ کر بتائے کہ افتی نے اس سے شادی کے لیے ہاں کر دی ہے۔ اسے پرپوز کرنے کے لیے کراچی بلا رہی ہے۔ اس نے سیل فون کان سے ہٹا کے دیکھا بیل جا رہی تھی مگر افتی کال نہیں پک کر رہی تھی۔ وہ یونہی فون کان سے لگائے ایک بوتیک میں داخل ہو گیا تھا سارے شوخ رنگ جیسے اس بوتیک میں قوسِ قزاح کی مانند جمع ہو گئے تھے۔ بدر کو لگا ہر رنگ مسکرا مسکرا کر اسے اپنی جانب راغب کر رہا ہے کہ دیکھو میں کتنا شوخ ہوں میں افتی کے تن پر دوسرے رنگوں کے مقابلے میں زیادہ جچوں گا بدر مسکرا دیا۔

سارے رنگ مسکرا دیئے۔ بدر نے وہ تمام شوخ رنگ پیک کروا لیے تھے۔ اور سیل فون کان سے ہٹا کے جیب میں رکھ لیا حالانکہ وہ افتی کو فون کر کے اس کی پسند ناپسند پوچھنا چاہتا تھا وہ اس کے لیے وہ سب خریدنا چاہتا تھا جو اسے پسند تو تھا مگر اس سب چیزوں کے لیے افتی کو پیسے نہیں ملتے تھے۔ کپڑے۔ میچنگ جیولری جوتے پرفیومز اس نے اپنے کریڈٹ کارڈ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اعلیٰ برانڈ کی ساری چیزیں خریدی تھیں آپ نے خوامخواہ اتنا تکلف کیا بدر۔ میں وہ ساری چیزین آپ کی خوشی کی خاطر اگر آپ سے لے بھی لوں تو استعمال نہیں کر پاؤں گی۔ میں گھر میں کیا بتاؤں گی کہ مجھے کس نے یہ سب چیزیں گفٹ کی ہیں۔'' افتی نے بدر کے اندازے کے مطابق ویسے ہی کہا تھا جیسا اس

نے سوچا تھا بدر اپنے ٹھیک اندازے پر مسکرایا افتی کے معاملے میں اس کے سارے اندازے ساری سوچیں ہمیشہ درست ہوا کرتی تھیں۔

''آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟'' وہ شاکی ہوئی وہ اور بھی مسکرایا۔

میں وہ ساری چیزیں تمہارے لیے اپنے دل کی خوشی کی خاطر خرید کر لایا ہوں میں آٹھ روز وہاں رہوں گا اور ہر روز ساری چیزیں تم پہن کر میرے پاس مجھ سے ملنے آیا کرو گی' بدر نے تصور میں اسے اپنے من پسند روپ میں سجا سنورا دیکھ کر کہا تھا۔

''مگر میں کیسے مل پاؤں گی روز آپ سے۔ میرے لیے روز گھر سے نکلنا بہت مشکل ہو گا بدر۔''

''تو سعدیہ کس روز تمہارے کام آئے گی۔ ایسے وقت میں تو دوست ہی کام آیا کرتے ہیں۔'' بدر نے لاپروائی سے کہتے افتی کوئی راہ سمجھائی تھی۔ بدر کے مشورے پر افتی دل کھول کے ہنستی تھی بروقت اس نے بہت اچھا مشورہ دیا تھا۔

''آپکے اور میرے درمیان جو رشتہ ہے اس کی خبر میں نے کبھی ہوا کو بھی نہیں لگنے دی۔ پھر سعدیہ تو۔ بھابھی کو بھی جانتی ہے میں روز اس سے بھی ملنے کے لیے نہیں آتی اور اگر بھابھی نے سعدیہ سے پوچھ لیا تو وہ صاف کہہ دے گی کہ میں اس سے ملنے کے لیے نہیں آئی'' افتی مکمل کردار میں ڈوبی ہوئی تھی دل ودماغ کی منتشر سوچوں کو کبھی بھی اس نے لہجے سے عیاں نہیں ہونے دیا تھا۔

''تو تم سعدیہ کو اپنے راز میں شریک کر لوں۔ ان فیکٹ کل کو جب میں اپنا رشتہ لے کر تمہارے گھر آؤں گا تو سعدیہ کے توسط سے ہی ناں۔ سعدیہ مجھے اپنے جاننے والوں کے توسط سے تمہارے گھر والوں سے ملوائے گی تبھی تو وہ لوگ مانیں گے ورنہ تو تم خود ہی کہتی ہو کہ تمہارے بھیا کبھی بھی تمہاری پسند سے تمہیں نہیں بیاہیں گے۔'' افتی نے اس کی پوری بات سن کے اپنے گھومتے دماغ کو بمشکل کنٹرول کیا وہ اگر ذہین یا چالاک تھی تو بدر بھی کم نہیں تھا وہ دنیا اور دنیاداری کا شعور رکھتا تھا افتی کو یہ بات کم از کم بھولنی نہیں چاہیے تھی۔

''واہ جی۔ کیا کہنے آپ کی ذہانت کے۔ میں تو معترف ہو گئی کیا فول پروف پلاننگ کی ہے آپ نے......'' دانت کچکچاتے بظاہر اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو بدر دلکشی سے مسکراتے ایک کان سے سیل فون دوسری جانب منتقل کرتے ہوئے بولا تھا۔

''ہاں تو ٹھیک ہے ناں۔ گھی اگر سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو مجبوراً انگلیاں ٹیڑھی تو کرنی ہی پڑتی ہیں ناں۔'' اس کے انداز میں لاپروائی تھی۔

''ہاں یہ بات بھی ہے''۔ افتی نے تائید کی۔

''تو پھر ڈن ہوا ناں کہ سعدیہ کے گھر آنے کا بہانہ کر کے تم مجھ سے روز ملو گی۔ ٹھیک ہے ناں۔'' وہ بہت آس سے پوچھ رہا تھا۔

''کوشش تو پوری کروں گی۔ افتی نے اپنے زرخیز ذہن میں بہانے تراشتے بے توجہی سے کہا تھا وہ کوئی ایسا بہانہ سوچ رہی تھی جو رضا حسن کو مطمئن کر سکے۔

☆............☆............☆

"خیریت تو ہے ناں تم نے مجھے اتنی ایمرجنسی میں کیوں بلایا۔" اتنی شدید گرمی میں ہانپتی کانپتی سعدیہ اس کے فلیٹ تک پہنچتے ہی پھٹ پڑی تھی۔ افتی اسے دیکھ کے مسکرائی۔

"بیٹھو تو سہی۔" اس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میری تو مت ماری گئی اتنی سڑھیاں چڑھ چڑھ کے آخر تمہارے فلیٹ کی لفٹ کب ٹھیک ہوگی۔" ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرتے ہوئے اس نے ناگواری سے پوچھا تھا وہ خود ڈیفنس میں رہتی تھی سو وہاں ایسی صورتحال کم ہی پیش آرہا کرتی اور اگر آتی بھی تو چند گھنٹوں میں ہی اس کو حل کردیا جاتا تھا۔

"پتہ نہیں یار۔ میں تو خود اس صورتحال سے بہت تنگ ہوں عبداللہ کو اسکول لینے جانے کے لیے کم ازکم مجھے ڈیڑھ سو سڑھیاں چڑھنا اُترنا پڑتی ہیں"۔

"پھر رضا بھائی بے چارے تو صبح کے گئے جب تھکے ہارے گھر آتے ہوں گے تو دماغ کا تو وہی بن جاتا ہوگا ظاہر ہے کراچی کی بے ہنگم ٹریفک سے نبرد آزما ہونے کے بعد ڈیڑھ سو سڑھیاں چڑھ کے آنا خاصے جگر کا کام ہے۔" سعدیہ نے اس کے ہاتھ سے ٹھنڈی ٹھار کوک کا گلاس پکڑ کر سپ لیتے افسوس سے کہا تو افتی کھلکھلا کے ہنسی تھی سعدیہ نے اس کی ہنسی کو تعجب سے دیکھا۔

"وہ تو عادی ہیں یار...... بلکہ وہ تو جب تک گھر پہنچتے ہیں بس اتنے فریش ہوجاتے ہیں کہ چہرے پر تھکن کا شائبہ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔

"اچھا۔ سعدیہ متاثر ہوئی اس کا مطلب ہے خاصے ہارڈ ورکنگ ہیں رضا بھائی افتی نے مسکرا کر اثبات میں سرہلاتے تائید کی تھی حالانکہ اگر وہ جان پاتی تو اسے احساس ہوتا کہ رضا شدید محنت کا عادی نہیں تھکتا وہ بھی ہے ہاں اس کی تھکن اپنے بیوی بچوں کو دیکھ کر ختم ہوجاتی ہے وہ انہیں مسرور دیکھ کے فریش ہوجاتا ہے۔ مگر سمجھنے کے لیے من کی آنکھ چاہیے ہوتی ہے جو کہ افتی کے پاس فی الحال موجود نہیں تھی۔

"خیر تم بتاؤ۔ اتنی ایمرجنسی میں مجھے کس لیے بلایا ہے؟" کوک کا ٹھنڈا ٹھار سپ اپنے اندر اتارتے اس نے پوچھا تو افتی انگلیاں مرڑوتے الفاظ ترتیب دینے لگی۔

"مجھے جو بات تم سے کہنی ہے سعدی۔ پلیز بُرا مت ماننا اور نہ ہی مجھے غلط سمجھنا۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے جو تم اتنی تمہید باندھ رہی ہو؟" سعدیہ کو حیرت ہوئی کیونکہ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرنے والی تھی۔

"بدر مجھ سے ملنے کے لیے آرہا ہے۔ اور مجھے تمہاری مدد چاہیے۔" سعدیہ اس کی بے ربط سی بات پر استفہامیہ نگاہوں سے اسے بس دیکھ کے رہ گئی۔

"یہ بدر کون ہے افتی۔ اس کی آنکھوں میں بھی واضح سوال تھا۔

''بدر میرا دوست ہے لاہور میں رہتا ہے اور۔'' افتی ایک مرتبہ پھر گڑبڑائی کتنا مشکل تھا اس کا تعارف کروانا۔ بلکہ ایسا کوئی بھی تعلق جو معاشرے کی نظر میں آپکو معتوب ٹھہرا دے مشکل ہی ہوا کرتا ہے۔

''کھل کے کہو افتین حیدر۔ یہ بدر صاحب کون ہیں اور تمہارا ان کے ساتھ کیا تعلق ہے۔'' سعدیہ نے اسے جانچتی نگاہوں سے دیکھتے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا وہ اس کی بچپن کی دوست تھی سو اس کی تمام عادات سے واقفیت رکھتی تھی۔

''پچھلے سے پچھلے سال جب میں تمہارے گھر آئی تھی تب زبیدہ آنٹی (سعدیہ کی ہمسائی) کے گھر سے نکلتے ہوئے ہماری مختصر ملاقات ہوئی تھی تب اس نے مجھے اپنا نمبر دیا تھا۔ ہمارا رابطہ ہو گیا اور پھر دوستی گہری دوستی۔ اور اب وہ مجھ سے ملنے کے لیے یہاں آرہا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ جتنے دن یہاں رہے ہیں اس سے روز ملوں۔''

''تو......'' سعدیہ نے اسے رکتے دیکھ کر پوچھا۔

''سعدی پلیز۔ آخری بار پلیز میری مدد کر دو۔ اس کے بعد میں یہ قصہ ہی ختم کر دوں گی۔'' وہ لجاجت سے کہتی اس کے پاس آ بیٹھی سعدیہ نے اسے تاسف سے دیکھا۔

''کالج والی حرکتیں ابھی تک نہیں چھوڑیں تم نے......''

''وہ صرف میرا دوست ہے لیکن......'' افتی ایک مرتبہ پھر گڑبڑائی کیا کہتی ایک شادی شدہ دو بچوں کی ماں کے لیے ایسے کسی بھی تعلق کا تعارف اس کو کس قماش کی عورت ظاہر کر سکتا ہے وہ اچھی طرح سے جانتی تھی مگر سمجھتی نہیں تھی۔

''رضا بھائی کی محبت میں کہاں کمی رہ گئی تھی افتی کہ تم نے ایسے چور دروازے ڈھونڈ لیے۔'' سعدیہ نے تاسف سے کہتے اسے ڈانٹا مگر افتی بُرا مان گئی۔

''یا تو میری پوری بات سن لو یا پھر مجھے لعن طعن کر لو......'' وہ ٹھیک ٹھاک ناراض ہوئی۔

''اچھا ٹھیک ہے بولو۔'' سعدیہ نے اسے بُرا مانتے دیکھ کے ہتھیار پھینکے ویسے بھی اپنے عمل کا ہر بندہ خود ہی ذمہ دار ہوتا ہے اس کا کام سمجھانے کی کوشش کرنا تھا اگر سامنے والا نہ سمجھے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔

''وہ بہت آگے نکل چکا ہے سعدی۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن تم جانتی ہو کہ وہ نہیں جانتا کہ میں میریڈ ہوں نہ ہی میں اس کی خاطر رضا کو چھوڑ سکتی ہوں اس لیے میں نے سوچا ہے کہ اسے کسی نہ کسی طرح سے انکار کر کے خود کو بھولنے پر مجبور کر دوں۔''

''تو تمہیں لگتا ہے کہ تم اسے خود کو بھولنے کے لیے کہو گی اور وہ بھول بھی جائے گا۔''

''تھوڑا مشکل تو ہو گا مگر میں اپنی پوری کوشش سے سارا معاملہ ہینڈل کر لوں گی اس میں مجھے تمہاری تھوڑی سی ہیلپ چاہیے ہو گی۔''

''اور مجھے کیا کرنا ہوگا؟ اس نے بے حد سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''وہ میں تمہیں وقت آنے پر بتاؤں گی۔تم ابھی پلیز آٹھ روز کے لیے بیمار ہو جاؤ۔''

افتی نے اس کی ٹھوڑی چھوتے منت کے سے انداز میں کہا۔

مطلب۔افتی اس کے پاس بیٹھی اب مطلب سمجھا رہی تھی۔

''تمہیں ڈر نہیں لگتا افتی اگر رضا بھائی یا کسی اور کو پتہ چل گیا تو۔'' ساری بات سننے کے بعد اس نے افسردگی سے اس ناعاقبت اندیش لڑکی کو دیکھتے پوچھا تھا جو اس کی بات سن کے کھلکھلائی تھی۔

ڈر کیسا۔میں کونسا سیریس ہوتی ہوں یار۔بس ٹائم پاس۔'' اس نے لاپروائی سے کہتے کندھے اچکائے۔

''کبھی کبھار ٹائم پاسنگ زندگی کا روگ بن جاتے ہیں افتی یہ آگ کا کھیل ہے جسے تم بلا خطر کھیل رہی ہو یہ آگ تمہارے آشیانے کو بھی جلا سکتی ہے۔''

''خدا کا نام لو یار۔کیوں ڈرا رہی ہوں مجھے......کچھ نہیں ہوگا میرے گھر کو۔رضا مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں ہماری زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے''۔افتی نے کانوں کو ہاتھ لگا کے ڈرتے ہوئے اسے ڈانٹا تھا سعدیہ افسردگی سے سر ہلا کے رہ گئی۔

''کب آرہا ہے بدر''۔سعدیہ نے اسکی بات کو نظر انداز کرتے اگلا سوال پوچھا۔

پرسوں شام کی فلائٹ ہے تم پلیز پریشان مت ہو۔ایک آخری بار اس کے بعد میں بدر کا قصہ ہی ختم کردوں گی۔ظاہر ہے میرے بھیا بھابھی نہیں مانیں گے میری برادری سے باہر شادی پر اور وہ زبردستی میرا رشتہ کہیں بھی طے کر سکتے ہیں۔'' افتی نے شرارت سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے انگلیاں مروڑتے سعدیہ کو آنکھ ماری سعدیہ اس کی بات سن کے نا چاہتے ہوئے بھی مسکرادی اگر وہ لکھتی تو یقیناً'' ایک نامور مصنفہ ہوتی اداکار ہوتی تو خوب نام کماتی مگر وہ حقیقت میں رنگ بھرنا پسند کرتی تھی فقط فینٹسی میں نہیں جیتی تھی۔

☆............☆............☆

''کیسے ہو عامر!'' افتی نے ایک عرصے کے بعد عامر کو کال کی تھی عامر حیران ہوا کیونکہ افتی کسی وجہ کے اسے کال نہیں کیا کرتی تھی۔

''ٹھیک ہوں۔آپ کسی ہو۔؟'' اس واقعے کے بعد سے عامر ذرا محتاط ہو گیا تھا لہجے میں ایک فطری جھجک آپ ہی آپ در آئی تھی۔

''میں تھوڑا سا پریشان تھی'' اور تو کوئی ہے نہیں ایسا جو میری پرابلم سمجھ سکے اس لیے سوچا کہ تمہیں کہہ دوں۔تم ایٹ لیسٹ مجھے سمجھتے ہو۔افتی نے بڑی آس وامید سے لہجے میں حسرت سی پیدا کرتے ہوئے کہا تھا عامر کھل اٹھا بالکل ویسے جیسے پہلے کھول اٹھتا تھا وہ آج بھی افتی کا مطیع تھا افتی باخبر تھی اور اکثر اس بات کا ناجائز فائدہ اٹھایا کرتی تھی۔

''کیوں نہیں آپ حکم کریں افتی......آخر میں کس دن آپ کے کام آؤں گا۔'' وہ فوراً بچھا افتی اس کی سعادت مندی دیکھ کر مسکرائی۔

"بہت شکریہ عامر۔ تم سچ میں بہت اچھے ہو میں تمہاری دل سے قدر کرتی ہوں"۔

"خیر یہ بات تو آپ نہ ہی کریں اگر میری قدر ہوتی تو ویسا سلوک نہ کرتیں میرے ساتھ اور میری محبت کے ساتھ۔" اتنے عرصے سے دبا شکوہ آج عامر کی زبان سے بالآخر پھسل ہی گیا تھا۔

"قدر کرتی ہوں تمہاری۔ اسی لیے تو تمہارا بھلا سوچتی ہوں ہمیشہ۔ تمہیں ابھی تک اس بات کی سمجھ نہیں آپائی۔ آخر کب سمجھو گے اب تم ایک کامیاب پولیس آفیسر بن چکے ہو۔" اس نے اسے ہولے ڈانٹا۔

"کیا پولیس لائن میں کام کرنیوالوں کا دل نہیں ہوتا افتی۔! عامر کا لہجہ ٹھہر کر گھمبیر ہو گیا مگر افتی کے لیے یہ صورتحال نئی ہر گز نہ تھی۔

"نہیں......ان کے لیے دل سے زیادہ ان کا پیٹ اہم ہوتا ہے۔" وہ شرارت سے کہتے آخر میں ہلکا سا مسکرائی تو عامر بھی ہنس دیا۔

"ویسے تم نے پوچھا ہی نہیں کہ میں نے کال کس لیے کی تھی؟" افتی نے اسے ٹریک سے ہنستے دیکھ کر شکوہ کیا۔

"اوہ۔ آئم سوری کیا کروں آپ کے علاوہ کسی اور طرف دھیان جاتا ہی نہیں میرا۔" وہ جیسے شرمندہ ہوا اور افتی تو جی بھر کر محظوظ ہوئی اس کے اندر براجمان خود پسند عورت کو مردوں کی اپنے لیے رکھی جانے والی حسرت اور بے بس بہت لطف دیا کرتی تھی۔

"مجھے کچھ پیسے چاہیے تھے۔ زیادہ نہیں بس دس ہزار رضا کی سیلری آتے ہی تمہیں لوٹا دوں گی۔ اصل میں پچھلے دنوں عبداللہ کی بیماری کی وجہ سے سارا بجٹ ڈسٹرب ہو گیا ورنہ میں تمہیں کبھی نہ کہتی"۔ لجاجت سے کہتے افتی کا لہجہ آپوں آپ ہی شرمندہ ہو گیا۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں افتی۔ میں کما کس لیے رہا ہوں اگر اپنوں کے ہی کام نہ آسکا تو پھر فائدہ۔ میں شام کو دے جاؤں گا آپ نیچے والے پارک میں آجایئے گا۔"

"اور پلیز رضا کو پتا نہ چلے۔ ورنہ وہ بہت ناراض ہوں گے۔"

"ڈونٹ وری۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا یہ بتائیں اور تو کچھ نہیں چاہیے آپکو۔؟"

وہ مؤدب سا پوچھ رہا تھا۔

"نہیں بس آتے وقت ڈومی نوز کا لارج سائز پیزا اور فریش جوسز لیتے آنا ہاں میرے موبائل کے دو کارڈز بھی۔ بس اور کچھ نہیں۔" افتی نے احساس تشکر کا واضح والہانہ اظہار کرتے فون رکھ دیا تھا۔ عامر اس کے لیے ایک بلینک چیک کی حیثیت رکھتا تھا وہ جب چاہتی تھی من پسند رقم لکھ کر اسے کیش کروالیا کرتی تھی۔ اور عامر ایسا پاگل کہ کبھی حساب کتاب رکھتا ہی نہ تھا۔

☆............☆............☆

نائٹ کریم کا مساج کرتے اس نے آئینے میں نظر آتے رضا حسن کے عکس پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور کریم کا ڈھکن بند کر کے رضا کے پاس آبیٹھی رضا حسب معمول اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف تھا نگاہ اٹھا کے اس کے چاندی جیسے روپ کو دیکھا اور مسکرا دیا افتی اسے بہت

سنجیدگی سے دیکھ رہی تھی رضا حسن سمجھ گیا کہ اسے کوئی خاص بات کرنی ہے اس نے اپنا لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کیا اور مسکرا کر اپنی نصف بہتر کو دیکھا اور مسکرایا۔

''جی جناب۔ کہیے کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں'' وہ آنکھوں میں محبت کے دیپ روشن کیے مائل بہ شرارت اس کی طرف متوجہ ہوا افتی نے سوچے سمجھے پلان کے مطابق اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کو انگلیاں چٹخائیں۔

''شام کو سعدی کی کال آئی تھی۔'' پریشانی افتی کے لہجے سے بھی ترشح تھی۔'' آجکل بہت بیمار ہے پچھلے چند دنوں سے میرا اس سے رابطہ نہیں ہو پایا اسی لیے مجھے پتہ نہیں چل سکا لیور پرابلم کر رہا ہے اور وہ آجکل بیڈ ریسٹ پر ہے۔''افتی نے آدھی ادھوری بات کرتے توقف کیا۔

''اوہ۔ وری سیڈ اب کیسی ہے وہ؟ رضا حسن کو حقیقتاً دکھ ہوا۔

''فی الحال تو بیڈ ریسٹ پر ہے اور ستم بلائے ستم کہ ادھر ہے بھی بالکل اکیلی۔ اس کی مما آجکل جرمنی گئی ہوئی ہیں اپنی بڑی بیٹی کے پاس اور واپسی کے لیے انہیں فلائٹ نہیں مل رہی۔ رضا۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں روز اس کے پاس چلی جایا کروں۔ زیادہ نہیں بس چار پانچ گھنٹوں کے لیے۔'' وہ اٹھ کے رضا کے بالکل پاس آ بیٹھی اس کے گھٹنوں پر نرمی سے ہاتھ رکھتے اس نے متفکرانہ انداز سے اسے دیکھا۔

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے افتی میں تو مینج کر لوں گا مگر بچوں کا کیا کرو گی عبداللہ سکول جاتا ہے اسود ابھی بہت چھوٹا ہے اور دونوں بچے تو مل کے اودھم مچا دیتے ہیں ایسے میں تو سعدیہ اور ڈسٹرب ہو گی۔''

''میں ایسا کروں گی گیارہ بجے گھر کا کام ختم کر کے عبداللہ کو امی کے گھر چھوڑ دیا کروں گی اور اسود کو ساتھ لے جاؤں گی اور اسود ڈھائی سال کا ہے ابھی اتنا بھی نہیں چھوٹا کہ تنگ کرتا پھرے مجھے۔ رضا۔ سعدیہ میری بیسٹ فرینڈ ہے اور اسے اس وقت میری ضرورت بھی ہے۔'' افتی نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہتے آس و امید سے رضا حسن کو دیکھا۔

''چلو ٹھیک ہے جناب۔ جیسے آپکی مرضی ہم کون ہوتے ہیں آپکی کسی بھی بات سے اختلاف کرنے والے۔'' رضا حسن نے ہتھیار پھینکنے والے انداز میں اس کی طرف مسکرا کر دیکھا وہ کتنے خوش قسمت تھے کہ اتنا دردمند دل رکھنے والی لڑکی ان کی شریک حیات تھی۔ افتی خوشی کے مارے ان سے لپٹی تھی تبھی انہوں نے خود پر رشک کرتے سوچا تھا۔

☆............☆............☆

دوسرے روز اس نے صبح ہی گھر کا کام نہایت پھرتی سے نپٹایا اور اسود کو تیار کر کے جلدی جلدی لاک لگا کر رضا کو ٹیکسٹ کرتے گھر سے نکل آئی۔ بدر کو آج تین بجے کی فلائٹ سے کراچی آنا تھا اور وہ اس کے آنے سے پہلے ایک چکر پارلر کا لگانے کے ساتھ اپنے لیے کچھ شاپنگ بھی کرنا چاہتی تھی۔ راستے میں ٹیکسی لینے کے ساتھ ہی اس نے رضا کو اپنا سعدیہ کے گھر جانے کا بتایا اور سعدیہ کو جلدی تیار ہو کے اس کا انتظار کرنے کا ٹیکسٹ سینڈ کرتے اسود کو امی کے گھر پر اس کی ضرورت کی تمام مطلوبہ اشیاء کا بیگ تھماتے چھوڑا کہانی وہی دہرائی

جو رضا حسن کے سامنے دہرائی تھی وہ بہت شاطر لڑکی تھی سوا سے اپنے بولے جھوٹ اور کی گئی غلط بیانیاں ہمیشہ یاد رہا کرتی تھیں۔ سو اس کے منصوبے میں کوئی کمی یا کجی نہ رہے اس نے امی کو بھی وہی کہا جو رضا کو بتایا تھا۔ تاکہ خدانخواستہ اگر رضا کا رابطہ امی جان سے ہو بھی تو وہ اسے وہی بتائیں جو رضا جانتا ہو۔ طارق روڈ اور زمزمہ کی بوتیکس چھان کر اس نے اپنے لیے دو بہترین جوڑے خریدے۔ سینڈلز اسکے پاس پہلے ہی بے شمار تھیں۔ اتنا سب کچھ کس لیے خرید رہی ہو۔ تمہارا رومیو لے کے آ تو رہا ہے اتنا کچھ......" سعدیہ نے حیرت سے اسے اپنے لیے خریداری کرتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

تو کیا اس کے تحفے کے انتظار میں ہی رہوں کیا۔ اور کیا پتا وہ کیا لائے اور میں کیا ندیدوں کی طرح وہ سب چیزیں فوراً استعمال کرلوں گی کیا......" افتی نے قدرے نروٹھے سے سعدیہ کو ڈپٹا۔

"ہاں ۔ ہاں تمہاری ظالم بھابی تو تمہیں سب پہننے نہیں دیں گی۔ سوال و جواب کریں گی کہ کس نے کروائی یہ اتنی مہنگی شاپنگ۔" بات کے اختتام پر خود ہی قہقہہ لگائے ہنس پڑی تھی۔

اب ظاہری بات ہے سعدی۔ رضا کو بھی حیرت تو ہوگی کہ میں نے اتنا سب کچھ کہاں سے لے لیا جبکہ ابھی تو انہوں نے خود ہی مجھے پچھلے دنوں چار جوڑے دلوائے تھے وہ بھی اپنی پسند کے۔ اور نہ ہی تم اتنی دیالو ہو کہ تمہارا نام برملا لے سکوں"۔ آخر میں اس نے "تم" پر زور دیتے سعدی کو چھیڑا تھا۔ وہ دونوں اس وقت ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھی تھیں بچوں کا کیا کروگی۔ انہیں کس کے پاس چھوڑو گی؟ سعدیہ نے برگر کا پیس توڑ کر منہ میں رکھتے اچانک یاد آ جانے پر پوچھا تھا۔

"عبداللہ کو امی جان اسکول سے لے لیا کریں گی اور اسود کو تم اپنے پاس رکھو گی۔" افتی نے مزے سے بتایا مگر سعدیہ کو تو جیسے اچھو رگ گیا۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔ بچے پالنے کا مجھے کوئی تجربہ نہیں کم از کم۔ پھر اسود تو مجھے پہچانتا بھی نہیں ایک لمحہ بھی نہیں ٹکے گا میرے پاس۔" سعدیہ نے افتی کی خوش فہمی دور کی۔

"یار۔ وہ بہت نائس بچہ ہے بالکل بھی تنگ نہیں کرتا رہ جانے گا تمہارے پاس۔ افتی نے بے زاری سے اس کی طرف دیکھا اسے اچھا نہیں لگا کہ تھا سعدیہ کا آنا کانی کرنا۔

"افتی ڈیئر۔ اسود مجھے بہت عزیز ہے مگر خود سوچو میں اسے اپنے پاس رکھ لینے سے انکاری نہیں ہوں۔ مگر تم خود سوچو وہ مجھ سے بالکل بھی ہلا ہوا نہیں۔ ڈھائی سال کا بچہ بڑا ہی کتنا ہوتا ہے۔" سعدیہ نے افتی کے ہاتھ پر اپنا نرم ہاتھ رکھتے اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو پھر کیا کروں یار۔ اسود تو بڑا مسئلہ کر رہا ہے اسے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔ بہت باتیں کرنے لگا ہے پھر مجھے وہ مما پکارے گا تو بدر کے سامنے میرا پول کھلنے میں لمحہ بھی نہیں لگے اور میں اس کہانی کو خوبصورت موڑ دے کر ختم کرنا چاہتی ہوں۔!" وہ حقیقتاً پریشان ہو اٹھی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے تم پریشان مت ہو۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گی۔ تم یہ بتاؤ تمہارا رومیو کب تک آجائے گا کیا تم خود اسے ائیر پورٹ لینے جاؤ گی۔؟'' برگر ختم کرتے ہی کوک کا بڑا ڈسپوزیبل پیپر گلاس اٹھا کر اس نے منہ سے لگاتے کہا تھا ڈھیر ساری کرشڈ برف پیپسی کے ساتھ اس کے منہ میں گئی تھی اسٹرا وہ استعمال نہیں کرتی تھی۔ افتی نے براساختہ بنا کے اس کی اِل میز ڈ حرکت کو دیکھا۔

''شام کو چھ بجے پہنچ جائے گا اور میں کیسے جاسکتی ہوں اسے ریسو کرنے۔ رضا پانچ بجے گھر آجاتے ہیں یار......'' افتی نے اس طرح دل گرفتگی سے کہا گویا اسے بدر کو پک نہ کرنے کا بہت افسوس ہو جیسے۔'' اور ایسا کچھ غلط بھی نہیں تھا۔

☆............☆............☆

''تمہارے شہر کی فضا میں سانس لے رہا ہوں افتین حیدر......! وہ رضا کو کافی بنا کے دے رہی تھی جبھی اسے بدر کا ٹیکسٹ موصول ہوا افتی میسج پڑھ کے مسکرائی۔

''تبھی تو فضا میری سانسیں معطر کر گئی ہے'' مسکراتے ہوئے اس نے جواب لکھا اور بدر نے مسکراتے ہوئے ہی اس جواب کو پڑھا تھا وہ کھل کے مسکرایا اور جی بھر کے مسکرایا۔ محبت کا جواب وہ محبت سے ہی لینے کا قائل تھا اور اس معاملے میں افتی نے اسے ہرگز بھی مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی محبت کو اپنے سامنے دیکھنے کے لیے بے تاب تھا ابھی کل ملنے میں ایک رات باقی تھی اور وہ ایک رات بدر پر بہت بھاری تھی! ہمارے ملنے میں ابھی پندرہ گھنٹے کا طویل وقت ہے افتی اور یہ وقت مجھ پر پندرہ صدیوں کی طرح بھاری ہے جو گزرنے میں ہی نہیں آرہا ہے'' اگلا میسج پڑھ کے افتی مسکرا نہیں سکی بدر کی والہانہ بے تابی کو عیاں کرتا یہ میسج افتی کو سن کر گیا تھا لمحہ بھر کو ہی سہی اس نے خود کو لاجواب اور بے بس محسوس کیا تھا۔

''کب صبح ہوگی اور کب میں تمہیں دیکھ پاؤں گا میں اپنی زندگی کی ہر صبح اٹھنے کے بعد سب سے پہلے تمہارا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔'' اگلا میسج واضح انداز میں افتی کی جان فنا کر گیا بدر اپنے جذبات کی ترجمانی کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتا تھا افتی نے مختصر لکھ بھیجا۔

''صبر''

''صبر کا پھل بہت میٹھا ہوتا ہے میں جانتا ہوں مگر صبر بہت طویل اور صبر آزما بھی تو ہوتا اور کبھی کبھی جان لیوا بھی۔'' باتیں بنانے میں تو اسے ملکہ حاصل تھا بنے بنائے جوابات اس کے ذہن کی پٹاری میں ہمہ وقت موجود رہا کرتے تھے۔

''اُف۔ افتی بے ساختہ ہنسی بس کر دیں کیوں مجھے رُلانے پر تلے ہوئے ہیں''

میسج سینڈ کر کے اس نے کافی کا تیار کپ رضا کو جا کے پکڑایا جو حسب معمول اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف تھا افتی کو کبھی اچھا نہیں لگا تھا گھر آنے کے بعد اس کا آفس کے کام کرنا مگر آج اسے بے حد اچھا لگا تھا وہ رضا کی موجودگی میں بدر سے فون پہ بات نہیں کرسکتی تھی مگر میسج تو کرسکتی تھی ناں۔'' وہ کچن میں واپس آئی تو بدر کا ریپلائے آچکا تھا اللہ نہ کرے کہ کبھی میری وجہ سے تمہاری آنکھوں میں آنسو آئیں۔ وہ دن

میری زندگی کا تاریک دن ہوگا۔افتی نے اس میسج کو پڑھا اور جواب لکھا۔

”اگر کبھی میری وجہ سے آپ ہرٹ ہوئے تو۔؟“اس نے سوال کیا تھا مگر بدر نے اسے محض ایک سوال ہی سمجھا تھا۔

”تو وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔“اور بدر جانتا ہے کہ اس کی افتی اسے کبھی ہرٹ نہیں کر سکتی محبتوں میں شدتوں کا قائل ہوں افتی۔محبت میرے لیے صرف ایک جذبہ نہیں بلکہ پوری زندگی ہے جنون ہے۔بدر نے نجانے ایسا کیوں لکھ کے بھیجا تھا وہ مسیج سینڈ کر کے خود بھی حیران ہوا حالانکہ اس نے تو محض ایک سوال پوچھا تھا وہ محض اس سوال کا ویسا ہی سادہ جواب کیوں نہیں دے پایا تھا۔وہ حیران تھا۔

”آپ تھک گئے ہوں گے ابھی آرام کریں صبح پھر ملتے ہیں“۔ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ افتی کے اگلے مسیج نے اسے رات گہری ہونے کا احساس دلایا تھا وہ واقعی تھکا ہوا تھا افتی سے ملنے کے لیے اسے واقعی نیند کی ضرورت تھی تا کہ صبح فریش اٹھ سکے!

☆............☆............☆

”آج میں واپسی پر آؤں گا سعدیہ کا پتہ کرنے ساتھ ہی تمہیں بھی پک کرلوں گا ناشتے کی میز پر رضا حسن نے افتی سے کہا تو چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔

”ارے۔آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں میں خود ہی آجاؤں گی آپ کے آنے سے بھی پہلے؟ شکر ہے رضا نے افتی کو پہلے ہی بتا دیا تھا اگر اچانک رضا وہاں اس سے ملنے کے لیے پہنچتا تو وہ کیا جواب دے پاتی وہ تو پکڑی جاتی۔

”چلو ٹھیک ہے پھر سعدیہ کی میری طرف سے بھی خریت دریافت کر لینا۔اور شام کا تکلف مت کرنا میں آتے ہوئے بازار سے کچھ لیتا آؤں گا۔“اٹھتے سے انہوں نے افتی کے آرام کے خیال سے کہا تھا۔

”لیکن میں بنالوں گی رضا......بس چار پانچ گھنٹوں کے لیے ہی تو مجھے جانا ہوگا روزانہ۔اب کیا آپ روز ہی ہوٹل سے خرید کے لائیں گے۔رہنے دیجیے اتنا خرچ۔پہلے ہی مہینے کی آخری تاریخیں چل رہی ہیں“ رضا کو افتی کا پر تفکر خیال اور احساس اچھا لگا۔

”کراچی کی ٹریفک پہلے ہی دن بھر کے تھکے ہارے بندے کو ادھ موا کر دیتی ہے اوپر سے کسی بھی ہوٹل کی سروس اللہ کی پناہ۔ رہنے دیجیے میں خود ہی بنالوں گی کچھ ہلکا پھلکا۔رات کا سالن بھی ابھی پڑا ہوا ہے۔“اس نے منٹوں میں مینیو ترتیب دیا۔

مگر تمہیں رات کا سالن کھانا پسند نہیں ہے افتی......!رضا کو اس کی فکر تھی افتی بدقت مسکرائی وہ کتنے پیارے انسان کو دھوکا دے رہی تھی کبھی کبھار اس کا ضمیر اسے بڑا اور کڑا املامت کرتا کہ اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا وہ لپک کر رضا کے شانے پر سر ٹکا گئی۔

”(بس آخری بار۔بدر کے بعد میں زندگی میں کبھی رضا حسن کو چیٹ نہیں کروں گی)

وہ دل میں عہد کر رہی تھی جبکہ وہ رضا سے کہہ رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں میں مینج کرلوں گی اتنا خیال نہ رکھا کریں میرا۔بگڑ جاؤں گی۔"

آنسوؤں کی نمی اس کی آنکھوں میں اور لہجے میں ایک ساتھ ابھری تھی۔

"تم بگڑ بھی گئیں تو میری محبت تمہیں سنوارے گی؟" وہ اس کا تھپتھپاتے ہوئے یقین سے بولا اس کا یقین کراچی کی فضاؤں نے سنا اور محفوظ کرلیا۔

☆............☆............☆

افتی کے بتائے مطلوبہ مقام پر پہنچتے ہوئے اس نے ٹائم دیکھا وہ پورا ایک گھنٹہ پہلے وہاں پہنچ گیا تھا آتے ہوئے اس نے خود پر ڈھیر سارا اسپرے انڈیلا تھا بہترین ڈریسنگ ہیئر اسٹائل اور قیمتی کلون کی خوشبو اسے وجاہت کا شاہکار بنا گئی تھی وہ بلاشبہ ایک ہینڈسم پرسنالٹی رکھتا تھا پھولوں کا سرخ بکے پکڑے وہ افتی کا محوانتظار تھا اسے افتی کا انتظار کرنا اچھا لگ رہا تھا وہ خوش تھا بہت خوش۔

جس جگہ وہ کھڑا تھا وہاں بہت رش تھا وہ ایک پبلک پیلس تھی اسے ایسی جگہیں پسند نہیں تھیں مگر افتی نے ایسی جگہ کو چنا تو وہ اسے روک نہیں پایا وہ افتی کی خوشی میں خوش تھا افتی اسے جہاں سہولت سے مل سکے اسے قبول تھا بس وہ آ کے اس سے مل لے۔وہ اسے جی بھر کر دیکھ لے پلکیں جھپکے بنا سانس لیے بنا بس دیکھتا ہی رہے۔اور اس نے ایسا ہی کیا بھی جب اس نے سرخ رنگ کی لمبی قمیض اور سرخ کھلے ٹراؤزر میں سلیقے سے کیے ہوئے میک اپ میں نظر آتی قیامت جیسی پر اعتماد لڑکی کبھی پزل ہوگئی افتی کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔اس نے صنم بکم کیفیت میں اسے اس طرح سے دیکھا کہ افتی اس طرح اور کتنی دیر گھوریں گے مجھے بدر......یا کوئی بات بھی کریں گے۔" افتی نے بظاہر ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے اپنی جھنجلاہٹ چھپائی بدر جی بھر کے مسکرایا۔

"میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں یونہی دیکھتے دیکھتے اپنی عمر بتا دوں اور بلک تک نہ جھپکوں!" بدر کا خواب آ گئیں لہجہ خمار آلود تھا افتی دل کھول کے ہنسی۔

"میرے پاس صرف دو گھنٹے کا وقت ہے بدر۔اور میں اسے آپکے ساتھ بھرپور انداز میں گزارنا چاہتی ہوں اور آپ اسے ایسے ویسٹ کرنا چاہتے ہیں اتنا قیمتی وقت۔اسکے لہجے میں ہلکی سی ناراضگی در آئی بدر اسکے نروٹھے بن کو دیکھ کے مسکرایا۔

"تم ابھی سے گھبرا رہی ہو۔میں تو شادی کے بعد تم سے کوئی بات ہی نہیں کیا کروں گا صرف تمہیں پیار سے دیکھتا رہوں گا۔" وہ مزید شوخ ہوا۔

"جی نہیں......آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے مجھے تو ساری زندگی دیکھتے ہی رہنا ہے آپ نے کام پہ کون جایا کرے گا۔" وہ بیویوں والے انداز میں اسے ڈپٹ رہی تھی اور بدر برابر مسکرایا تھا۔

"میرے ڈیڈ میرے لیے اتنا کما چکے ہیں کہ اب میری سات نسلیں آرام سے بیٹھ کے کھا سکتی ہیں۔انہوں نے ساری زندگی کام

ہی تو کیا ہے اور اتنا کیا کہ......فیملی کے لیے ان کے پاس کبھی ٹائم ہی نہیں بچا۔'' بات کرتے کرتے بدر کے لہجے میں دکھ کا الاؤ دہک گیا اسکے اندر کے دکھ اس کے لہجے سے عیاں ہونے لگے افتی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

میں ایک گھر بنانا چاہتا ہوں افتی۔ ایک ہنستا بستا گھر جہاں خوشیاں ہوں بہار ہو اور سب سے بڑھ کر سکون ہو۔'' بدر کے لہجے میں اضطراب اور خواہش یکجا تھی افتی کو اس لمحے وہ دنیا کا سب سے پیارا انسان لگا اس کے لیے فیملی کی اہمیت تھی۔

''انشاء اللہ آپ ایسا گھر بنائیں گے بدر۔ آپ کی بیوی آپ سے بہت پیار کرے گی اور آپ بہت خوش رہیں گے۔'' افتی نے اسے دل سے دعا دی۔

میں تمہارے ساتھ اپنی دنیا بسانا چاہتا ہوں افتی۔ تمہارے ساتھ اپنا گھر بنانا چاہتا ہوں اور میں وعدہ کرتا ہوں میں ڈیڈ کی طرح صرف اور صرف پیسہ نہیں کماؤں گا بلکہ تمہیں اور بچوں کو پراپر ٹائم دیا کروں گا۔'' وہ مستقبل پر نگاہیں جمائے بڑے یہ خیال انداز میں بول رہا تھا اس کے لہجے سے محبت ٹپک رہی تھی اس کی آنکھوں میں خواب تھے اس کے چہرے انداز اور لب و لہجے میں سچائی تھی افتی کو وہ حسرتوں کا مارا شخص لگا جس کی ساری زندگی ٹوٹے خوابوں سے عبارت تھی صحیح تو یہ تھا کہ وہ خوشبوں کو ترسا ہوا انسان تھا۔ جس کے لیے دولت سے زیادہ رشتے اہم تھے اور رشتوں کو ترسے ہوئے انسان ہمیشہ محبت کی قدر کیا کرتے ہیں ایسے لوگ کسی نعمت سے کم نہیں ہوتے اور نعمتوں کی قدر کرنی چاہیے!

''لیکن بدر۔ افتی کو پہلی بار اس کے جذبوں سے خوف محسوس ہوا'' اگر بھیا بھابھی نہ مانے تو۔'' بدر کو اس کے لہجے میں خدشات محسوس ہوئے ویسے ہی خدشات جو محبت کرنے والوں کے دلوں میں پنپتے ہیں۔

''میں انہیں منالوں گا۔ کسی بھی قیمت پر۔'' اس کے لہجے میں اس کی محبت کا عزم بول رہا تھا افتی بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''مجھے بہت ڈر لگتا ہے بدر۔ اگر ہم نہ مل پائے تو۔'' موٹے موٹے شفاف موتی اس کی آنکھوں میں جگمگائے آواز بھرا سی گئی بدر نے اس کی پریشانی اپنے دل سے محسوس کی۔

''ڈونٹ وری۔ میں ہوں نا۔'' تسلی کے لیے اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں بدر۔ آپ کے بغیر زندگی بالکل بے معنی ہے میرے لیے۔'' بدر ہولے سے مسکرایا۔

''یہ پل میری زندگی کا خوبصورت ترین پل ہیں افتی۔ میں بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے تمہاری جیسی لڑکی کی محبت ملی اور میں چاہتا ہوں کہ ہمارا ساتھ دائمی ہو جائے اور میں ایسا یقیناً جلد کرنا چاہوں گا۔'' بات کے اختتام پر وہ ہلکا سا مسکرایا محبت دل کی بات کرنے کے بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ دھیمی مسکان اس کے خوبصورت و جیہہ چہرے پر ٹھہر گئی تھی افتی ایسی صورتحال کے لیے پہلے سے تیار تھی سو وہ بالکل بھی نہیں گھبرائی اور مسکرا دی۔

"آپ نے میرے جذبات کو ترجمانی کردی ہے بدر۔ آپکا ساتھ میرے لے کسی اعزاز سے کم نہیں ہوگا۔"

"تھینکس" بدر کا سارا وجود احساس تشکر میں ڈوب گیا۔

"میں نے تمہارے لیے کچھ شاپنگ کی ہے آؤ تمہیں دکھاتا ہوں۔" وہ اسے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے وہ لوگ اسی ہوٹل میں آئے تھے جس میں بدر ٹھہرا ہوا تھا۔

"یہ کیا پوری بوتیک اٹھالائے میرے لیے بدر۔" ڈھیر ساری شاپنگ دیکھ کے افتی کی تو آنکھیں پھٹ گئیں پندرہ بیس تو صرف سینڈلز کے پیئر تھے اور وہ سب بھی اعلیٰ برانڈ کے اور ڈریسز کی تو گنتی ہی نہیں تھی۔

یہ تو کچھ بھی نہیں میرا بس چلتا تو پورا مال اٹھا کر یہاں لے آتا۔

"یہ سب تو بہت زیادہ ہے بدر۔ میں یہ سب نہیں لے سکتی" افتی کو اتنی اچھی چیزوں سے دستبردار ہونے کا واقعی میں افسوس تھا۔ بدر کے سوالیہ انداز پر اس نے خود اسی وضاحت کی تھی "میں گھر والوں کو کیا بتاؤں گی کہ یہ سب مجھے کس نے دیا ہے اور کیوں۔ بہت سے سوال اٹھیں گے اور بھابی تو میرا جینا حرام کردیں گی۔" افتی کے لہجے میں واضح پریشانی تھی مگر جو وہ کہہ رہی تھی اس وجہ سے بہر حال نہیں وجہ کوئی اور تھی۔

"یہ بات میرے دماغ میں کیوں نہیں آئی"۔ بدر بھی سنجیدہ سا ہو گیا۔

"اس لیے کیونکہ آپ کا دماغ خالی ہو چکا ہے محبت نے آپکو نکما کر دیا ہے" افتی شرارت سے کہتے ہوئے مسکرائی تو بدر کھسیانا ہو کے ہنس دیا۔

بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ بدر نے جاتے سے تعریف کی۔

"بڑی جلدی خیال آ گیا تعریف کرنے کا۔" اس نے منہ بنایا تھا بدر کو اس کا ناراض ہونا اچھا لگا تھا۔

"تمہارے علاوہ کسی اور بات کی طرف دھیان ہی نہیں گیا ورنہ سب سے پہلے تمہاری تعریف ہی کرتا۔" وہ بے بسی سے رہنے بالوں میں انگلیاں جلاتا ہنسا افتی بھی اس کی بات سمجھ کے مسکرائی تھی۔ ان دونوں کے قہقہے کے ساتھ کاتب تقدیر بھی مسکرایا تھا۔

☆..........☆..........☆

ساری شاپنگ اس نے سعدیہ کے گھر اس کے پاس امانتاً رکھوائی تھی۔ سعدیہ اس کے چمکتے دمکتے روپ کو بس نگاہ بھر کے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ افتی شروع دن سے ہی ایسی تھی اور وہ اسے کبھی بھی نہیں سمجھا پائی تھی۔ ابھی بھی اس نے اسے ایک نظر دیکھا اور افسوس سے سر ہلا کر رہ گئی اسے افتی کی ایسی حرکتیں ہمیشہ ہی اب نارمل لگتی تھیں۔

"مل آئیں۔" سعدیہ نے اسے ڈھیر ساری شاپنگ بیگز سے نبرد آزما دیکھ کر پوچھا خوشی کے مارے اس کا سارا چہرہ دمک رہا تھا۔ افتی نے آنکھیں میچ کر اثبات میں سر ہلایا سعدیہ دو قدم آگے بڑھ آئی۔

''سچ میں سعدیہ......اتنا زبردست بندہ میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا......'' وہ پرجوش سے انداز میں کہتے صوفے پر سینڈل اتار کر بیٹھ گئی۔

وہ تو تمہارا چہرہ بتا ہی رہا ہے افتی......سعدیہ سنجیدہ سے انداز میں بول رہی تھی۔

''اسود کدھر ہے......'' افتی نے اس کے انداز کو نظر انداز کرتے اسود کا پوچھا۔

''ابھی سویا ہے تھوڑی دیر پہلے......'' سنجیدہ انداز ہنوز قائم تھا۔

''اس نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا ناں سعدی......سچ مجھے وہاں بھی وہم سا رہا تھا کہ کہیں وہ تمہیں تنگ نہ کر رہا ہو۔'' افتی اس کے دونوں ہاتھ تھام کر شرمندہ سے انداز میں بولی تو سعدیہ کو اس لمحے جانے کیوں مگر افتی سے کراہت محسوس ہوئی۔کوئی عورت اتنا بھی گر سکتی ہے اور اس حد تک بھی......؟''

اس نے اپنی سوچوں کے بے لگام گھوڑے کو فکر و دانش کی سرزمین پر دوڑاتے سوچا تھا۔

یہ باتیں تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھیں۔جس وقت تم نے اسود کو میرے پاس چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا تھا اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔بچہ ہی ہے ناں اور بچے تو بہل ہی جایا کرتے ہیں کسی بھی بہانے سے۔سعدیہ نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے جتایا مگر افتی کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی وہ سعدیہ کا طنز سمجھ نہیں پائی۔شاپنگ نہیں دکھاؤ گی مجھے جو تمہارا رومیو تمہارے لیے کر کے آیا ہے۔وہ ہلکا سا مسکرائی۔

''ہاں کیوں نہیں۔افتی نے جلدی سے اسے ساری شاپنگ دکھائی تھی سعدیہ نے پوری دلجمعی سے ساری چیزیں دیکھیں اور دل کھول کے تعریف کی۔

جو بھی ہے پر بندہ ہے بڑا دل والا'' سعدیہ نے ساری چیزیں دیکھنے کے بعد بے لاگ تبصرہ کیا۔

''ہاں یہ تو ہے......ویسے بھی تم اسے ایک نظر دیکھو تو میسمرائز ہو جاؤ گی وہ اتنا ہینڈسم ہے کہ چند لمحوں کے لیے میں خود بھی سوچ میں پڑ گئی سعدی۔میں افتین حیدر......جو مردوں سے کبھی متاثر نہیں ہو پائی۔'' افتی کے لہجے میں احساس برتری سمٹ آیا۔

''ہاں خیر وہ دکھ ہی رہا ہے۔'' سعدیہ نے بھی اس کی تائید کی: ''اچھا خیر یہ بتاؤ کہ کیا موڈ ہے اب تمہارے رومیو کا۔یا پھر تمہاری کوئی اسٹیریٹا جی میری اسٹریٹا جی تو وہی ہے کہانی کا ڈراپ سین بھی تیار ہے ہاں رومیو کا موڈ تو مجھے پرپوز کرنے کا ہے اور شاید وہ یہاں آیا بھی اس لیے ہی ہے'' افتی نے لاپروائی سے اس قدر اہم بات بتائی یوں جیسے کسی اور کی بات کر رہا ہو۔

''افتی......تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ تم آگ سے کھیل رہی ہو۔؟'' سعدیہ کا لہجہ کسی بھی قسم کے طنز سے پاک تھا ہاں ہلکی سی حیرت کی خو محسوس کی جا سکتی تھی۔

خطروں کے کھلاڑی آگ سے نہیں ڈرا کرتے میری جان۔افتی جیسی قیامت کے سامنے آگ کوئی معنی نہیں رکھتی۔افتی کے

چہرے کے عضلات میں احساس تفاخر سج گیا۔

"کیا کہو گی اپنے رومیو سے...... وہ تمہارے پیار میں تو بہت آگے جا چکا ہے؟" سعدیہ نے اسے جانچا اب جو بھی کرنا ہے وہ تمہیں کرنا ہوگا؟ افتی نے بڑے آرام سے کہتے سعدیہ کے سر پر دھماکہ کیا۔

"کیا مطلب......" وہ چونکی۔

"وہ میں تمہیں بعد میں سمجھاؤں گی پہلے تم مجھے اچھی سی چائے پلاؤ میں تب تک اسود کو دیکھ لوں...... اٹھا کہ نہیں" مزے سے آرڈر کرتے وہ بڑے آرام سے سعدیہ کو حیرت میں گھرا چھوڑ کے اسود کے کمرے کی طرف بڑھ گئی سعدیہ بس اس کو دیکھ کے رہ گئی تھی۔

☆............☆............☆

"افتی...... کیا ہوا تمہاری طبیعت خراب لگ رہی ہے؟" وہ نڈھال و پژمردہ سی کچن میں کھڑی شام کا کھانا تیار کر رہی تھی جب رضا نے اچانک ہی اس کے پیچھے آ کے کہا تھا افتی چونک کے پیچھے مڑی رضا متفکر سا اس کے پیچھے کھڑا تھا افتی نے جلدی سے خود کو سنبھالا اور اپنی آنکھیں صاف کیں جو شام ہی سے بے سبب ہی برس رہی تھیں۔

"کیا ہوا۔تم رو کیوں رہی ہو۔" رضا پریشان ہوا تھا۔

"نہیں۔ میں رو تو نہیں رہی بس پیاز کاٹ رہی تھی تو اسی کی وجہ سے آنکھوں میں پانی آ گیا۔" اس نے چھری والا ہاتھ فوراً آگے کر کے دکھایا رضا نے اسے غور سے دیکھا افتی تم پیاز نہیں ٹماٹر کاٹ رہی ہو......" رضا نے واضح طور پر اپنی مسکراہٹیں دبانے کی سعی کی۔

"اوہ......افتی فوراً چونک کے سیدھی ہوئی تو نظر ہاتھ میں پکڑے ٹماٹر پر جا ٹکی بے ساختہ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا رضا دو قدم آگے بڑھا اسے بازوؤں میں بھرتے اپنی ٹھوڑی اس کے شانے پر ٹکائے اس کے وجود کی خوشبو کو اپنی سانسوں میں اتارنے لگا افتی کے وجود کی مہک اس کی پر کیف قربت اسے مسحور کر دیا کرتی تھی وہ بے خود ہونے لگتا وہ ہوش کھونے لگتا تھا افتی کو خود پر اور اپنی قربت پر ناز تھا وہ جانتی تھی کہ کسی بھی مرد کو گھائل کرنے کے تمام تر ہتھیاروں سے وہ لیس تھی اور وہ ایسا کر سکتی تھی وہ رضا کی بے خودی کے محظوظ ہوتے محسوس کرتی مگر اس وقت وہ کوئی بھی احساس رضا کی قربت سے کشید نہیں کر پائی وہ بدر کے خیالوں میں اُلجھی تھی اور اسی میں غلطاں تھی تبھی تو رضا کی چھیڑ خانی پر بھی بت کی مانند کچن رینج کے سامنے ایستادہ تھی۔

"اے...... کیا ہوا......" رضا اس کے بالوں میں مہکتی شیمپو کی خوشبو کو سانسوں میں ارتارتے خمار آلود لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں......بس سر میں ذرا سا درد ہو رہا ہے آپ لاؤنج میں جا کے بیٹھیں میں کھانا تیار کر کے روم میں آ رہی ہوں۔" افتی اس وقت رضا کی قربت سے خائف تھی اور نہ ہی اس کے سوالوں کا جواب دینے کے موڈ میں تبھی اس نے اسے وہاں سے جانے کو کہا تھا۔

"پر مجھے تمہاری طبیعت خراب لگ رہی ہے......" وہ ابھی بھی اسی بات پر اٹکا تھا۔ کچھ نہیں ہوا مجھے......بس ذرا سی تھکاوٹ ہے

اور کچھ نہیں تھوڑا ریسٹ کرلوں گی تو سب ٹھیک ہو جائے میں بالکل فریش ہو جاؤں گی۔ وہ رضا کو وہاں سے ہٹانے کے لیے اس کی تسلی کروا رہی تھی حالانکہ اس کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کوئی بھی کام کرنے کو وہ بہت پریشان تھی بدر نے بات ہی ایسی کردی تھی کہ اسے پریشانی کا آسیب چمٹ گیا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے...... جا رہا ہوں تم جلدی فری ہو کے آجاؤ بلکہ سبزیاں مجھے دے دو میں سلاد بنا دیتا ہوں...... جاتے جاتے بھی وہ دھلی ہوئی سبزیاں ٹوکری میں رکھ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا افتی نے اس کے جاتے ہی شکر کی سانس لی تھی وہ جس وقت سے لوٹی تھی بدر کا ایک بھی میسج ہیں آیا تھا وہ آٹھ روز کے لیے آیا تھا اور وہ یہ آٹھ روز بدر کے ساتھ بہت خوشگوار انداز میں گزارنا چاہتی تھی مگر بدر کی بڑھتی وارفتگی اور ڈیمانڈز وہ پوری کرنے سے خود کو قاصر و معذور پا رہی تھی۔ بدر آج واپسی پر اسے گھر ڈراپ کرنا چاہتا تھا اور افتی کے بھیا بھابھی سے ملنے کا خواہشمند بھی...... مگر افتی اسے گھر نہیں بلا سکی اپنے فرضی بھیا بھابھی سے وہ اگر بدر کو نہ بھی ملواتی تب بھی بدر کو اس کے گھر کا پتہ معلوم پڑ جاتا...... وہ کبھی بھی کسی بھی وقت اس کے گھر آسکتا تھا اور اس کو یہ کسی طور پر گوارہ نہیں تھا وہ فول پروف پلان بنانے میں مہارت رکھتی تھی اور ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ افتی ایسی کوئی بھی حماقت جذبات کے دھارے میں بہہ کے کر گزرتی اس بات کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا مگر ایسا وہ بدر کو نہیں سمجھا سکتی تھی بدر اپنی دھن کا پکا جذبات کے دھارے میں اندھا دھند تیرنے اور بہنے والا بندہ تھا وہ وہی کرتا جو اس کی من مرضی ہوا کرتی مگر افتی کو اس کی جذباتیت فائدہ نہیں دے سکتی تھی نہ ہی اسے اس کی ضرورت تھی۔ اسی لیے اس نے بدر کو صاف منع کر دیا تھا بدر موڈ سنتے ہی آف ہو گیا تھا افتی کے لیے بدر کے منہ زور جذبات کے دھارے پر بند پر باندھنا مشکل ہو رہا تھا جتنا اس قصے کو ختم کرنے کی کوشش کرتی اتنا ہی بدر کے جذبوں کی آگ مزید دہکتی جذبات کا ایک الاؤ تھا جو بدر کی آنکھوں میں دہکتا نظر آتا تھا، محبت اس کے انگ انگ سے لہو بن کے ٹپکتی تھی پالینے کی چاہ اور حاصل کرنے کی جستجو کا عزم اس کی نیلی آنکھوں کے سمندر میں موجزن ہلکورے جیسا نظر آتا تھا۔ افتی کو اس کی آنکھوں سے خوف محسوس ہوا۔ تبھی وہ اس کی ناراضگی کی پرواہ کیے بغیر لوٹ آئی مگر اپنا دل شاید کہیں وہیں بدر کے آس پاس ہی چھوڑ آئی تھی اس نے پہلی بار ایک خود غرض اور خود پسند عورت کے علاوہ ایک عورت بن کے سوچا اسے بدر کے بارے میں سوچ کے بُرا لگا اس نے بدر کے ساتھ زیادتی کی تھی...... پوری رات اس کی سوچتے گزری وہ بدر کو سچ سچ بتا دے اور اس سے معافی مانگ لے۔ وہ بہت اچھا اور نرم دل کا مالک ہے وہ اسے معاف کردے گا اور افتی اس کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گی۔ وہ رضا کے ساتھ وفا کرے گی اور ہمیشہ اس کی وفادار بن کے ہی رہے گی مگر اس سمے وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس کی زندگی میں موجود دونوں مرد بھلے نرم دل رکھتے ہوں مگر وہ دماغ بہرحال نرم اور پلپلا نہیں رکھتے تھے افتی نے کچھ سوچ کے بدر کو سچ لکھا اس وقت رات کے تین بج رہے تھے پوری رات افتی کی آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔

''سوری...... آپ کو دکھی کر کے میں بھی سکون میں نہیں ہوں''۔ افتی نے موبائل سائڈ میں رکھ کر دونوں بازو اپنے سینے کے گرد لپیٹے اسے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ بدر کا جواب آئے گا مگر اسے حیرت ہوئی جب اگلے پانچ سیکنڈ میں اس کے موبائل پر میسج ٹون کی آواز

سنائی دی تو......اس نے لپک کر موبائل فون اٹھایا۔

''اداس مت ہو اور سو جاؤ......میں بالکل بھی ناراض نہیں ہوں تم سے؟''مسکراتے چہرے کے ساتھ آیا رپلائی افتی کو متحیر کر گیا۔

''تو پھر آپ جاگ کیوں رہے ابھی تک......''افتی کے دماغ میں شک کا کیڑا کلبلایا۔

''اب سو جاؤں گا اور تم بھی سو جاؤ صبح گیارہ بجے پہنچ جانا مجھے کچھ خاص بات کرنی ہے تمہارے ساتھ......''اس کا سوال بڑے مزے سے گول کرتے اس نے افتی کو سو جانے کی ہدایت کی تھی افتی گہرائی میں نہیں گئی اس کے لیے بس بدر کا مان جانا ہی بہت تھا۔

☆............☆............☆

افتی نے بدر کا لایا کاہی رنگ کا فراک اور چوڑی دار پاجامہ پہنا ہلکا سا میک اپ کرتے اس نے بال کھلے چھوڑ دیے تھے کاہی رنگ کی فراک پر سلور رنگ کا ڈائمنڈ کا نغوں کا کام بنا ہوا تھا ڈائمنڈ نگوں کی جھلمل روشنی افتی کے صبح چہرے کو روشن کر رہی تھی۔افتی نے خود کو آئینے میں ناقدانہ نگاہ سے دیکھا اور مسکرا دی وہ ہمیشہ ہی خوبصورت دکھتی تھی کیونکہ وہ خوبصورت اور حسین تھی۔اس نے زندگی میں جس مرد کو بھی اپنے زیر بار کرنا چاہا تھا اپنے حسن سے کر لیا تھا کوئی بھی مرد اس کے حسن کے تیر سے گھائل ہوئے بغیر نہیں بچ پایا تھا بچ ہی نہیں سکتا تھا افتی اسے ایسا کرنے کا موقع دیا ہی نہیں کرتی تھی۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھی بار بار گھڑی کی جانب دیکھ رہی تھی گیارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے اور ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے ٹیکسی میں بیٹھی تھی۔گاڑیوں کا سیلاب تھا جو کسی بند ٹوٹنے کی مانند سڑک پر بکھرا تھا افتی کو انتظار سے بڑی کوفت ہوا کرتی تھی کیونکہ اسے انتظار کروانا پسند تھا کرنا نہیں......تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک بائیک اسکے قریب سے گزری اور آگے جا کے رُک گئی بس صرف ایک لمحے کے لیے عامر نے دیکھ لیا تھا وہ سو فیصد افتی تھی مگر وہ اتنی صبح اکیلی کہاں جا رہی تھی عامر نے چند لمحے کے لیے سوچا اور پھر سر جھٹک کر رہ گیا ٹیکسی آگے گزر چکی تھی۔

عامر کو واضح انداز میں لگا کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے بھلا افتی اتنی صبح اور اکیلی کہاں جا سکتی ہے......ٹیکسی آگے بڑھ گئی رش چھٹنے لگا مگر عامر افتی کے خیال کو ذہن سے جھٹک نہیں سکا وہ آفس جا رہا تھا مگر ذہن کام میں نہیں لگا یا شاید وہ اپنا دماغ اپنی سوچ ٹریفک جام والی اسی سڑک پر ہی چھوڑ گیا تھا۔

''میں بھی کتنا شکی ہو گیا ہوں پولیس جوائن کرنے کے بعد......!اس نے خود کو سرزنش کرتے مسکراتے ہوئے سوچا''کیسی کیسی باتیں سوچنے لگ گیا ہوں انہونی باتیں''۔

وہ خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش میں لایعنی باتوں پر مسکرایا مگر دماغ نے اس کی ایک بھی دلیل کو نہیں مانا......اچانک وہ اٹھا اور تھانے سے باہر نکل گیا باہر آ کے اس نے افتی کے نمبر پر کال ملائی بیل جا رہی تھی مگر کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا پھر اس نے گھر کے پی ٹی سی ایل پر

کال ملائی مگر اسے بھی کسی نے بھی ریسیو نہیں اب اس کا شک یقین میں بدل رہا تھا مگر وہ حتمی بات نہیں کر سکتا تھا کہ افتی گھر میں نہیں ہے وہ بار ہا اس کے میکے جا چکا تھا ان کا گھر ایک مختلف روٹ پر تھا افتی کہیں اور جا رہی تھی مگر کہاں۔سوچ کی ساری حدیں بس اس لفظ پر آ کر ختم ہوئی تھیں۔تبھی ایک خیال برقی کوند کی مانند اس کے دماغ کی سرزمین سے ٹکرایا اور وہ پرسکون ہو گیا اس نے اپنے سیل نمبر پر اپنے بھائی کا نمبر ملایا۔

''السلام علیکم رضا بھائی......کیسے ہیں آپ؟'' وہ دل کی پریشانی چھپائے بظاہر شگفتگی سے پوچھ رہا تھا۔

وعلیکم اسلام۔کیسے ہو عامر آج اتنی صبح یاد کیا خیریت ہے ناں؟

وہ جانتا تھا رضا حسن کو حیرت ہو گی تبھی اس نے جلدی سے بہانہ گھڑا۔

''جی وہ اصل میں امی جان بچوں کے لیے بہت اداس ہو رہی تھیں ملنے کے لیے گھر آنا چاہ رہی تھیں مگر گھر میں کوئی فون پک نہیں کر رہا بھابی کا سیل آن تو ہے مگر وہ بھی کال نہیں ریسیو کر رہیں تو میں نے سوچا آپ سے پوچھ لوں کہ بھابی اور بچے گھر پر تو ہیں ناں......؟''

''ارے ہاں......اصل میں افتی کی سہیلی بیمار ہے ناں تو وہ اس کے پاس جاتی ہے اسی لیے فون نہیں پک کر رہی اس کا نمبر سائلینٹ پر ہو گا۔تم پریشان مت ہو اور امی جان سے کہنا کہ ہم خود آئیں گے دو تین روز میں ملنے......بس ذرا فرصت مل جائے'' رضا حسن نے بے حد مطمئن انداز میں کہہ کے عامر کی تشفی کروائی۔

''جی بھائی ٹھیک ہے میں کہہ دوں گا۔ابھی رکھتا ہوں پھر بات کروں گا!'' اس نے خود پر نفرین بھیجتے فون بند کیا۔

''لوگوں کو عشق نکما کرتا ہے اسے پولیس لائن نے کر دیا تھا......فون بند کرتے اس نے سوچا تھا۔

☆..........☆..........☆

وہ اس کے کمرے کے سامنے کھڑی تھی اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور شعلہ جوانی سمیت اس نے دروازہ ہلکے سے ناک کیا اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا دونوں فریقین ایک دوسرے کو دیکھ کر ساکت رہ گئے لمحے صدیوں کے تخیل میں ڈوب گئے دونوں ایک ٹرانس کی کیفیت میں تھے آتی جاتی سانسیں ان برف کے مجسموں کے زندہ ہونے کا پتا دے رہی تھیں۔بدر نے نظر بھر کر اور نگاہ ٹھہرا کر اپنے سامنے کھڑے چاندی کے مجسمے کو اپنے پسندیدہ روپ میں دیکھا اور مسمرائزڈ ہو گیا اس کا مسحور ہونا بنتا تھا مگر افتی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا تھا وہ جو کسی بھی مرد کی وجاہت سے متاثر ہو جانے والوں میں سے نہ تھی اس وقت ایک اُجڑے بکھرے حلیے والے مرد سے ہار گئی تھی۔شدت گریہ سے بدر کی آنکھیں سرخ تھیں بکھرے بال اور اجاڑ ویران حلیہ ایسا لگتا تھا وہ ساری رات سو نہیں پایا وہ ہرٹ ہوا ہے شدید ہرٹ۔افتی کو لمحوں میں احساس ہوا اور شدید ہوا......اور پھر بھی وہ افتی کو پریشانی سے نکالنے کی خاطر خود پر جبر کرتے ہوئے اسے پرسکون کر رہا تھا افتی کو رات کی کہانی یاد آئی تو پہلی بار تکلیف کا احساس ہوا......اس کے اندر کی عورت نے اسے ملامت کی۔

وہ کیا کھیل کھیل رہی تھی اس قدر اچھے معصوم انسان کے ساتھ......وہ اس کے اعتماد سے کھیل رہی تھی وہ بدر جیسے محبت کے پیکر کو توڑ رہی تھی وہ کس قدر غلط کر رہی تھی......کوئی افتی کے اندر بے دردی سے چلایا اس کی آنکھ سے آنسو گرا وہ آنسو شرمندگی اور ندامت کا تھا مگر بدر نے اس آنسو کو اپنے مطلب کے معنی پہنائے تھے وہ سراپا محبت تھا اور محبت بدگمان نہیں ہوتی وہ وہم بھی نہیں ہوتی وہ زندگی ہوتی ہے وہ زندگی کا سکون ہوتی ہے۔ وہ جینے کا جواز ہوتی ہے وہ زندہ رہنے کا محرک ہوتی ہے اور ہمیشہ رہتی ہے بہت خوبصورت لگ رہی ہو......اس نے اسے دیکھتے ہی پہلی بات ہی یہی کی تھی۔

"ایسا لگتا ہے کہ دنیا کا ہر رنگ اور ہر خوبصورت چیز صرف بنی ہی تمہارے لیے ہے ہر وہ چیز جنہیں تم استعمال کرتی ہو خود پر ناز کرنے لگتی ہیں" وہ مسکراتے ہوئے اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا مگر افتی مسکرا نہیں سکی۔

"اندر آؤ ناں...... باہر کیوں کھڑی ہو؟ بدر اس کی خاموشی پر حیران ہوا مگر جتایا نہیں پھر بھی افتی کچھ نہیں بولی بس اندر آ کے کھڑکی کے ساتھ پڑی کافی ٹیبل کے گرد رکھی چیئرز پر جا کے بیٹھ گئی کافی ٹیبل پر سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑوں کا بھرا ہوا ایش ٹرے سامنے رکھا تھا اور کافی کے کئی خالی مگ......اس کے رت جگے کے گواہ اس کی بے تابی اور درد کے امین۔

افتی نے ایش ٹرے سے یکبارگی نگاہ اٹھا کر شکایتی نظر بدر پر ڈالی بدر ایک بے بس نگاہ دیکھ کے رہ گیا افتی اپنی حالت سے خود بھی ڈر گئی ایسا کبھی نہیں ہوا تھا وہ تو بہت سخت دل عورت تھی وہ تو اندر سے کبھی نہیں روئی تھی کبھی نہیں بکھری تھی پھر آج اسے اپنے اندر کیا کرچی کرچی ہوتے محسوس ہو رہا تھا اور کیوں......؟

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے بدر!" بہت دیر خود کو سنبھالنے کے بعد بالآخر افتی نے کچھ کہنے کے لیے اپنے لب کھولے تھے بدر کی ساری حسیں کان بن گئیں۔

"مجھے بھی تمہیں کچھ بتانا ہے افتی!" بدر اس کے پاس دوزانوں ہو کے بیٹھ گیا مگر پہلے تم بولو...... میں پہلے تمہارے دل کی بات سننا چاہوں گا مجھے تمہیں سننا ہمیشہ ہی اچھا لگتا ہے" بدر کے لہجے میں ہی محبت نہیں تھی اس کے ہر انداز میں محبت تھی۔ افتی نے بدر کی بات سن کے اپنی سسکی کا گلا گھونٹا۔

مجھے غلط مت سمجھئے گا بدر......مگر آج میں آپ کو خدا حافظ کہنے آئی ہوں ہمیشہ کے لیے ہمارا ساتھ بس یہی تک تھا۔ افتی کو آج آنسو لانے کی ضرورت نہیں پڑی آنسو بدر کی دیوانگی دیکھ کے خود ہی امڈ رہے تھے۔ بدر پر ساتوں آسمان قہر بن کے ٹوٹے وہ جہاں کا یہاں پر بیٹھا ساکت رہ گیا۔

"یہ......تم کیا کہہ رہی ہو افتی......ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ دم بخود تھا کل مجھے آپ کے ساتھ میرے بھائی نے دیکھ لیا تھا......اور مجھے انہوں نے بہت مارا بھی جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی ہے۔ افتی سسکی مجھے اپنی پرواہ نہیں ہے بدر مگر کوئی آپ کی طرف انگلی بھی

اٹھائے میں برداشت نہیں کروں گی میں نے اپنی جان دے دوں گی مگر آپ پہ آنچ نہیں آنے دوں گی۔"

"کوئی تمہیں ہاتھ لگا کے تو دیکھے میں ہاتھ کاٹ دوں گا" بدر لمحہ میں آگ بگولہ ہوا یہ احساس ہی باعث تکلیف تھا کہ افتی کو کسی نے اتنی بے دردی سے مارا ہے اور اس کی وجہ بدر کی ذات ہے۔

"میں ساری رات روتی رہی ہوں بدر...... بھیا کبھی نہیں مانیں گے اس بات کا اندازہ مجھے رات ان کے رویے سے اچھی طرح ہو گیا ہے، ہم کبھی مل نہیں سکتے بدر...... آپ پلیز چلے جائیں یہاں سے میں نہیں چاہتی کہ عامر بھائی کو آپ کو کوئی نقصان پہنچائیں۔

افتی اس کے دونوں ہاتھ تھامے لجاجت سے کہہ رہی تھی۔

"میں اتنا کمزور نہیں ہوں افتی کہ تمہارے بھیا سے ڈر جاؤں۔ موت تو ایک دن آنی ہی ہے۔ تمہاری محبت میں مرا تو محبت کے سامنے سرخرو ہو جاؤں گا۔"

وہ افتی کے ہاتھوں سے دونوں ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولا تو افتی نے بے ساختہ تڑپ کر اپنا مخروطی انگلیوں والا سپید ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

"اللہ نہ کرے کہ آپکو کچھ ہو بدر۔ آپکو میری عمر بھی لگ جائے۔" بدر نے اس کا اپنے دہکتے لبوں سے لگا ٹھنڈا یخ ہاتھ چوم لیا اپنے ہونٹوں کی ساری گرمی جذبات کی ساری جدت اس جسارت کے ذریعے افتی نے اپنے بدن میں برقی کوندی کی مانند سرایت کرتی محسوس کی مگر میں ایسے ہار نہیں مانوں گا افتی...... میں اپنی آخری سانسوں تک تمہیں پانے کی کوشش کروں گا۔ اس کے لہجے کا عزم اور محبت کی طاقت اس کے مضبوط ارادے کا پتہ دے رہی تھی افتی کو بیک وقت اس پر پیار بھی آیا اور غصہ بھی۔

"زندگی میں ہم بہت ساری خواہش پا لینے میں بدر...... مگر ضروری نہیں کہ وہ سب ہمیں حاصل ہوں میں سمجھ لوں گی کہ آپ بھی میری ایسی ہی ایک لاحاصل خواہش تھے شاید میں نے اپنی اوقات سے بڑھ کے خواب دیکھ لیے تھے"...... افتی نے ہچکی لی اور آنکھوں سے ڈھیر سارے موتیوں کو پانی بنا کے گرایا۔

"ہم ابھی بھی اپنے خوابوں کی تکمیل کر سکتے ہیں افتی...... اگر تم میرا ساتھ دو تو؟" بدر کے لہجے میں آس تھی اور اس کا پورا وجود کشکول بن گیا افتی کی ہاں کی بھیک کے لیے۔"

"میں ایسا کچھ نہیں کر سکتی بدر...... جو میرے بھائی کی عزت پر حرف لانے کا سبب بنے۔" وہ جانتی تھی کہ بدر کی بات کا مقصد کیا ہے اسی لیے اس کا لہجہ دوٹوک اور اٹل تھا۔ تو پھر مجھے اپنے طور پر کوشش کرنے دو۔ اب کی بار وہ ہلکے سے جھنجھلایا۔

"ہر کوشش بے کار جائے گی بدر...... میں چھ ماہ سے بھیا کو منانے کی کوشش کر رہی ہوں مگر وہ نہیں مانے اور کل تو حد ہی ہو گئی غصے میں آ کے انہوں نے میرا نکاح زبردستی بھابھی کے بھائی کے ساتھ طے کر دیا ہے۔ آج بھی میں بڑی مشکل سے آپ سے ملنے کے لیے آئی

ہوں۔ ہمارا ساتھ شاید یہیں تک تھا مجھ سے وعدہ کریں بدر آپ اپنا گھر بسائیں گے کسی بہت اچھی لڑکی کے ساتھ...... آج کے بعد مجھ سے رابطہ نہ کرنا میں نمبر آف کر رہی ہوں آپ کی یادیں میری زندگی کا سرمایہ حیات ہیں میں انہیں کے سہارے اپنی زندگی گزار سکتی ہوں مگر آپ کو خوش رہنا ہے ویسا ہی گھر بسانا ہے جیسا ہم نے سوچا تھا۔" وہ بیگ کاندھے سے لٹکائے آگے ہی آگے بڑھ رہی تھی اس کا بڑھتا ہر قدم بدر کو اس سے دور کر رہا تھا۔ اس نے بدر کی نہیں سنی تھی نہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھا تھا شاید اس لیے کہ پیچھے مڑ کے دیکھنے والے پتھر ہو جایا کرتے ہیں مگر کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی افتی اور بدر کی کہانی تو ابھی شروع ہوئی تھی۔

☆............☆............☆

اسود کو سعدیہ کے گھر سے لینے کے بعد وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی گھر کی جانب بڑھی تھی۔ ایک طویل دلچسپ اور مشکل کھیل کا اختتام آج بالآخر افتی کے پلان کے مطابق ہو ہی گیا تھا اس نے جیسا سوچا تھا ویسا ہی ہوا تھا مگر وہ خوش اور مطمئن نہیں تھی ایک عجیب سی تھکن اس کی رگ وپے میں سرایت کرتے اسے حال سے بے حال کر رہی تھی۔ شاید کہیں نہ کہیں اس کھیل کو کھیلنے وہ "بدر حیات" سے اپنائیت محسوس کرنے لگی تھی وہ اس کی ذات کے دکھوں سے آشنا ہو گئی تھی وہ اس کا درد جاننے اور محسوس کرنے لگی تھی اور آشنائی چاہے چار دن کی ہو اپنا اسیر کر لیتی ہے اور اس اسیری سے رہائی اکثر عمر بھر مل نہیں پایا کرتی۔ وہ گھر پہنچی تو ایک سرپرائز اس کا منتظر تھا۔ وہ گھر کے کھلے دروازے میں کھڑے ہو کے اندر کا منظر دیکھ رہی تھی وہ ساکت وصامت اسود کو کندھے سے لپٹا کے کھڑی تھی جبھی مصروف سے رضا حسن کی نگاہ اس پر پڑی تھی وہ جو گھر کو سجانے میں از حد مصروف نظر آ رہا تھا لپک کر اس کی طرف بڑھا اسے محبت سے دیکھا اور مسکرا دیا۔

"ہیپی اینیورسری ڈیئر وائف۔ وہ اسے بازوؤں کے حلقے میں لیے گھر کے اندر لے آیا۔ افتی کو دھچکا لگا اسے یاد نہیں تھا مگر رضا حسن کو کیسے یاد رہ گیا تھا کہ آج ان کی شادی کی سالگرہ ہے وہ تو اکثر ایسی باتیں بھول جایا کرتا تھا۔

کیسا لگا میرا سرپرائز۔ صبح سے گھر سجا رہا ہوں وہ تو شکر ہے امی جان اور عامر آ گئے ورنہ میں اکیلے کیسے اتنا سارا کام کر پاتا۔ وہ خوش خوش سا اسے بتا رہا تھا افتی اپنی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کو نظر انداز کر کے بدقت تمام مسکرائی۔

تھینکس آ لاٹ رضا۔ آپ ہمیشہ میری خوشی کا خیال رکھتے ہیں" افتی کے حلق میں نمکین پانی کا پھندا لگنے لگا آنکھیں ڈبڈبا گئیں نجانے وہ رو کیوں رہی تھی اور اندر تڑپ کس بات کی تھی۔ شاید کہیں کچھ کھو دینے کا احساس شدید تکلیف دے رہا تھا۔

"تم بھی تو میری اتنی پرواہ کرتی ہو۔ تمہیں سرپرائز اچھے لگتے ہیں ناں میں نے آج تمہارے لیے ایک سرپرائز پلان کیا ہے شکر ہے تمہیں پسند آ گیا۔" رضا خوش تھا افتی مسکرائی تبھی وہ امی جان کے پاس بڑھی تھی جو کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھیں آج تو عامر بھی آیا ہوا تھا افتی کو اسے اپنے گھر میں دیکھ کر اچنبھا ہوا مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا وہ بڑے اخلاق واحترام سے طاہرہ بیگم سے ملی۔

"میں نے چائے دم پہ لگا دی ہے تم فریش ہو آؤ پھر مل کے مٹھائی کھاتے ہیں اور چائے بھی۔ آج تو ویسے بھی اسپیشل مٹھائی لائے

ہیں ہم لوگ۔'' ہنستا مسکراتا ان کا چہرہ افتی کو حیرت میں مبتلا کر گیا۔

مٹھائی کس خوشی میں امی جان۔

عامر کا رشتہ طے کر دیا ہے میں نے اپنی پسند کی لڑکی سے۔طاہرہ بیگم کے لہجے میں عامر کے لیے مان اور پیار تھا افتی کو لگا انہوں نے اسے سنایا ہے کہ اب کی بار وہ اپنی پسند کی بہو لا رہی ہیں'' بہت بہت مبارک ہو امی جان۔خدا مبارک کرے'' افتی دل پر جبر کرتے مسکرائی ورنہ دل تو آج رسوا کرنے پر تلا تھا خوامخواہ میں بھر بھر کے آ رہا تھا۔ پھر اس نے ان سب کے ساتھ چائے بھی پی اور مٹھائی بھی کھائی۔کھانا بے حد خوشگوار ماحول میں لگایا گیا۔

''جاؤ اور جلدی سے تیار ہو کے آؤ۔اس قدر رَف حلیے میں کیک کاٹو گی کیا؟'' رضا نے اسے ڈانٹا۔

''اچھے خاصے تو میں کپڑے۔پھر کیا کرنے ہیں۔افتی نے منہ بنایا۔

''آج کے خاص دن کوئی بہانہ نہیں چلے گا ڈیئر وائف۔آرام سے اندر جاؤ اور تیار ہو کے آؤ تمہارا تحفہ بیڈ پر رکھا ہے۔'' رضا حسن نے اس کی ایک نہیں سنی بلکہ جلدی جلدی سے اندر کا راستہ دکھایا افتی لحہ بھر کو اس قدر محبت اور قدر پر ساکت ہو گئی ڈبڈبائی آنکھوں سے اس نے رضا حسن کو دیکھا یوں جیسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔

''میں جانتا ہوں کہ میں بہت ہینڈسم ہوں اب مزید ٹائم ویسٹ مت کرو اور جا کے تیار ہو جاؤ عامر اور امی جان نے واپس گھر بھی لوٹنا ہے۔'' وہ شرارت سے کہتے بظاہر اسے ڈپٹ رہا تھا ورنہ وہ بھی دل سے جانتا تھا کہ افتی اس کے محبت کے اس مظاہر پر سرپرائز ہو رہی ہے۔

''جاؤ۔وہ پھر بھی اسے وہیں کھڑا دیکھ کے ہلکا سا چلایا تو افتی تو اندر جانا پڑا باتھ روم بند کر کے وہ واش بیسن کے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔وہ کتنی بری عورت تھی جو اچھے لوگوں کے پیارے پیارے دلوں سے کھیلتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔اس کو خود سے نفرت محسوس ہوئی آ گہی کا در بڑے عجیب وقت پر اس پر کھلا کچھ اس طرح کہ اس کا سب کچھ بہا کے لے گیا۔اس کا خودی کا مان ہستی کا غرور اور نسوانیت کی پندار سب ایک ہی ٹھیس میں چکنا چور ہوتے اسے زمین بوس کر گئے تھے۔اس نے ایسا تو نہیں سوچا تھا بدر حیات اس کی زندگی میں آنے والے سبھی مردوں سے مختلف تھا۔وہ دل کا اچھا تھا وہ حساس تھا وہ شکی تھا نہ دقیانوسی ہاں وہ قدامت پسند تھا مگر اس کی قدامت پسندی کبھی بھی شک کے زمرے میں نہیں آئی تھی۔

وہ اتنا اچھا تھا کہ افتی کے سنائے گئے اکثر جھوٹے مظالم کی داستان و واقعات پر وہ اس کے ساتھ مل کے روتا۔دنوں اس کی دل جوئی کرتا اسے خوش رہنے کی تاکید کرتا اور اسے ہنسانے کے لیے کتنے ہی جتن کر ڈالتا۔افتی کو اپنی نجی ضروریات کے لیے بھیا سے پیسے نہیں ملتے اس لیے وہ افتی کے کہنے کے باوجود ہی اس کے پرسنل اکاؤنٹ میں اسے ماہانہ رقم بھیج دیا کرتا وہ اسے ابھی سے اپنی ذمہ داری سمجھنے لگا تھا اور ذمہ داریوں کو بخوبی نبھانا اسے آتا تھا وہ ایک اچھا کامیاب انسان ہونے کے ساتھ ایک اچھا دوست شوہر اور باپ بننا چاہتا تھا اس

نے ساری زندگی اپنے باپ کے لیے اپنی ماں کو روتے دیکھا تھا وہ خود باپ کی توجہ و محبت کے لیے ترستا رہا تھا افتی کے دکھ اسے اپنے دکھ لگتے تھے اسی لیے اس نے سوچا دو ٹوٹے بکھرے لوگ ایک مضبوط آشیانہ بنائیں گے۔ وہ اپنے آشیانے کے لیے خواب دیکھنے لگا محنت کرنے لگا اپنے اندر کی برائیاں چھوڑنے لگا افتی کے بھائی کہیں اسے سگریٹ نوشی کرنے کی وجہ سے ریجکٹ نہ کر دیں اس نے دوبارہ سگریٹ کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اس نے سگریٹ چھوڑ دی کبھی کبھار شدید ٹینشن میں پی لیتا عام طور پر نہیں افتی کے بھائی نماز روزے اور زکوٰۃ دینے کے پابند ہیں وہ نماز پڑھنے لگا اس نے روزے رکھنے شروع کر دیے اور غریب غرباء کے لیے زکوٰۃ باقاعدگی سے ادا کرنے لگا۔ اس نے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی اب مزید محتاط ہو گیا اس کی ذراسی غلطی کسی کا دل دکھا سکتی ہے اور اس شخص کی آہ کہیں افتی کو اس کی زندگی سے نکال نہ دے۔ وہ قدم پھونک پھونک کے رکھتا تھا پھر بھی تقدیر نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا تقدیر نے اس کا ساتھ کیوں نہیں دیا تھا۔ کافی ٹیبل کے پاس ویسے ہی دوزانو بیٹھے اس نے اپنے بالوں کو نوچتے سوچا تھا اس کے سر میں خون کی گردشیں معمول سے کہیں اور زیادہ جان لیوا تھی بار بار اور متواتر بجنے والا موبائل اب تھک کر خاموش تھا آخر کال کرنے والا کتنی ثابت قدمی دکھا سکتا ہے جانے کتنی دیر گزر گئی وہ وہیں بیٹھا رہا سوچتا رہا اور روتا رہا تبھی اس کا فون پھر بجا تھا۔ بدر نے نمبر دیکھے بغیر بھی جان لیا کہ فون کس کا تھا دنیا میں افتی کے علاوہ وہ صرف ایک ہی شخص کے قریب تھا اور وہی شخص یہ بات بھی جانتا تھا کہ آج وہ افتی کو باقاعدہ اور باضابطہ طور پر پرپوز کرنے والا ہے۔ دوپہر شام میں ڈھل گئی تھی اور شام رات میں تبدیل ہو رہی تھی اس شخص کو یقیناً بے چینی ہو گی وہ اپنے دوست کی زندگی میں در آنے والی حسین تبدیلی کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو گا تبھی بار بار کال کر رہا تھا بدر نے فون اٹھا کے کان سے لگایا۔

"وہ مجھے چھوڑ کے چلی گئی ہے!" فون آن ہوتے ہی بدر نے ضبط کے پل صراط پر کھڑے ہوتے مقابل کے حواسوں پر بم گرایا۔

"اور تم نے اسے جانے دیا؟" ٹھہرے ہوئے لہجے میں حیرت و دکھ سے زیادہ تھکن تھی۔

"میں اسے روک نہیں پایا" بدر کا لہجہ ٹوٹنے لگا آواز بھرانے لگی۔

"محبت کمزور نہیں ہوتی" دوسری جانب جیسے اسے تنبیہ کی گئی۔

"ہو جاتی ہے کبھی کبھار۔ جیسے مما کی ہوئی تھی۔"

"تم تاریخ دہرانا چاہتے ہو۔" اب کی بار مقابل کے لہجے میں حیرت و غصہ یکجا تھا آواز بھی قدرے بلند ہو گئی۔

"تاریخ دہرانا کوئی بھی نہیں چاہتا وہ خود اپنا آپ دہرائی ہے" بدر کی آواز بھیگنے لگی۔

"تم مرد ہو کے ایک عورت سے ہار گئے بدر حیات۔" آواز میں استہزا تھا۔

"وہ عورت میری محبت تھی اور محبت محض طاقت ور نہیں بناتی کبھی کبھار بزدل بھی بنا دیتی ہے" بدر زمین پر ویسے ہی ساکت و منامت بیٹھا تھا اس کا لہجہ سرد اور قدرے سفاک تھا۔

''حیرت کی بات ہے بدر حیات۔اس نے تمہیں کہا کہ مجھے چھوڑ دو اور تم نے اسے اتنی آسانی سے چھوڑ دیا۔تم نے تو محبت کی توہین کر دی ہے تم محبت کو پانے کی کوشش تو کرو۔پہلے مرحلے پر ہی ہار مان گئے کیا؟''

''میں اسے کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا یار۔''بدر نے اب کی بار تھکے تھکے سے لہجے میں اعتراف کیا تو دوسری جانب وحید اقبال کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

''تو تم سے جدا ہو کے وہ کونسا خوش رہے گی بدر۔تم تو اسے بیچ راہ میں چھوڑ کے اس کی مشکلات میں اضافہ کر رہے ہو۔کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ ساری عمر روتی رہے؟''وحید اقبال کے آخری جملے نے بدر حیات کی ساری ہستی ہلا دی تھی۔اس کا رواں رواں ''نہیں'' کی گردان بن گیا۔

''جاؤ''یک لفظی لفظ میں چھپی تنبیہہ بدر حیات کے اندر ایک نئی طاقت بھر گئی۔وہ تیزی سے اٹھا اور اس کے گھر جانے کے لیے ہوٹل سے باہر نکل آیا اس کے گھر کا ایڈریس وہ جانتا تھا ایک دو بار افتی کو اس نے اپنی تصویریں پوسٹ کی تھیں۔اس نے تبھی اس کا ایڈریس محفوظ کر لیا تھا۔راستے بھر اسے خود پر غصہ آتا رہا تھا اس نے کتنا غلط کیا تھا افتی کو جانے دے کے اس نے افتی کا مان توڑ دیا تھا کچھ نہ کہہ کے۔اس نے محبت کا مان توڑ دیا تھا افتی تو رو رو کے پاگل ہو چکی ہو گی بدر کو سوچ کے دکھ ہوا۔

وہ جیسے تیسے کر کے اس کے بھائی کو منا لے گا چاہے اسے اس کے پیروں پر کیوں نہ گرنا پڑے وہ افتی کے ساتھ کی بھیک مانگے گا اسے یقین تھا افتی کے بھائی مان جائیں گے وہ انہیں منا لے گا کسی بھی طرح کسی بھی طریقے سے۔اس نے سوچ لیا تھا۔

☆............☆............☆

''واؤ۔یو لک آؤٹ اسٹینڈنگ''وہ تیار ہو کے باہر آئی تو رضا کا تعریفی جملہ اس کے کانوں میں پڑا تھا وہ ہولے سے مسکرائی بے تحاشا رونے کے باعث اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے بھاری میک اپ کی تہہ بھی انہیں چھپا نہیں سکی تھی رضا لپک کے اس کے پاس آیا۔

''کیا ہوا جان تمہاری آنکھیں کیوں اتنی سرخ ہو رہی ہیں؟''رضا کے لہجے میں بے چینی بھری تڑپ تھی۔

''آنکھ میں صابن چلا گیا تھا اسی لیے۔''افتی نے فوراً بہانہ بنا لیا۔

''دھیان رکھا کرو نا''رضا کے لہجے میں فکر مندی تھی۔کہیں انفیکشن ہی نہ ہو جائے خیر تم رات کو سوتے وقت کوئی آئی ڈراپس ڈال لینا۔رضا کی تشفی نہیں ہو پا رہی تھی۔

''آپ خواہ مخواہ ٹینشن لے رہے ہیں رضا۔میں بالکل ٹھیک ہوں ڈونٹ وری؟''

''کیا کروں۔اتنی حسین بیوی اور وہ بھی بے تحاشا محبت کرنیوالی کوئی کافر ہی ہو گا جو اتنی اچھی بیوی کی پرواہ نہیں کرے گا اور میں

نہ تو کافر ہوں نہ بدبخت۔" رضا لوفرانہ انداز میں کہتے وارفتہ انداز میں اس پر جھکا افتی نے منہ بگاڑ کے انہیں دیکھا۔

"بند کردیں اب اپنی نوٹنکی۔ کچھ تو خیال کریں۔" عامر ہنستا ہوا ان دونوں پر چوٹ کررہا تھا۔ وہ دونوں انہیں دیکھ کے ایک ساتھ چونکے اور مسکرادیے۔

"ایک تو یار۔ تم نے ہمیشہ کی طرح آج بھی غلط وقت پر انٹری دی ہے میاں بیوی کے رومانس میں خلل ڈالنے والے تم جیسے ہی نالائق ہوا کرتے ہیں۔" رضا حسن نے مسکراتے ہوئے بے حد شگفتہ انداز میں عامر حسن پر چوٹ کی تھی آج تو رضا حسن کی شگفتگی عروج پر تھی وہ بات بے بات مسکرار ہا تھا اپنی خوشی کا اظہار کررہا تھا تبھی بیل ہوئی تھی اور متواتر ہوئی تھی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" افتی اس ماحول سے نکلنا چاہ رہی تھی تبھی دروازے پر ہونیوالی دستک کو اس نے غنیمت جانتے فرار کی راہ تلاش لی تھی۔ وہ دل ہی دل میں حیران ہوتی دروازے تک آئی تھی یہ ایک مکمل گھریلو فنکشن تھا تبھی افتی کو حیرت ہوئی تھی کہ کون اس وقت آسکتا تھا اس نے لپک کر دروازہ کھولا اور خود کو برف کے مجسمے میں ڈھلتے محسوس کیا تھا۔

"تم یہاں۔" وہ بدر کو وہاں اپنے گھر کے دروازے سامنے اجڑی بکھری حالت میں دیکھ کے حیران ہوئی تھی وہ خود نک سک سے تیار شعلہ جوالہ بنی اس کے سامنے کھڑی تھی مگر بدر نے نوٹس نہیں کیا وہ تو محبت کی آگ میں جل کر بھسم ہو چکا تھا بصارت رکھتے ہوئے بھی بصیرت نہیں تھی اس کے پاس۔

"میں آگیا ہوں افتی۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں خود عامر بھائی سے ہماری شادی کی بات کروں گا انہیں مناؤں گا۔ وہ دیوانگی کی حالت میں صورتحال کا اندازہ لگائے بغیر بول رہا تھا افتی کو اپنے ہاتھوں کے سارے توتے آن واحد میں اڑتے محسوس ہوئے۔

"ہمارے گھر میں فیملی فنکشن چل رہا ہے بدر۔ تم اب خدا کے لیے اس وقت یہاں سے چلے جاؤ میں صبح آؤں گی پھر مل کے بات کریں گے افتی نے اسے ٹالتے وہاں سے بھیجنے کی کوشش کی۔

"میں نہیں جاؤں گا افتی۔ تمہیں ان حالات میں چھوڑ کر۔ میں یہاں جانے کے لیے نہیں آیا"۔ بدر کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔

"آؤ افتی آکے کیک کاٹو۔ آپ تو دروازے میں ہی جم...... عامر کی زبان کو یک لخت بریک لگے تھے ایک اجنبی کو گھر کی دہلیز میں کھڑے دیکھ کر حیران ہونے سے زیادہ وہ افتی کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کر متوحش ہوا تھا۔

"تم جاؤ بدر...... میں صبح آکے بات کروں گی پلیز......" افتی نے جلدی سے بدر کو باہر نکال کے دروازہ بند کرنا چاہا دروازہ بند کرنے کی خواہش میں بدر کو پیچھے ہٹاتے افتی کا دایاں ہاتھ بدر کے سینے پر پڑا تھا عامر نے اس بے تکلفی کے مظاہرے کو سلگ کے دیکھا۔

"نہیں افتی۔ میں عامر بھائی کو آج منا کے ہی جاؤں گا۔" وہ اسے کندھے سے پکڑے پیچھے ہٹا کے اندر بڑھ آیا افتی متوحش سی

پیچھے لپکی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا وہ لاؤنج میں سب لوگوں کے درمیان پہنچ چکا تھا۔ طاہرہ بیگم بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں رضا اسود کو گود میں لیے بیٹھا تھا ایک اجنبی لڑکے کو اپنے گھر کے لاؤنج میں دیکھ کر چونکا۔

''یہ کون ہے افتی۔'' رضا اسود کو گود سے اتارنے کے بعد کھڑا ہو گیا تھا۔

افتی کو لگا اس کی موت آ چکی ہے قیامت کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے روشن تھا۔

روزِ محشر کے دن لگنے والی عدالت افتی کے سامنے آج لگی تھی اس کی شادی کی پانچویں سالگرہ کے روز۔ جس روز اس نے رضا حسن کے ساتھ اپنی زندگی کی شروعات کی۔

''میں بتاتا ہوں عامر بھائی۔ بدر لپک کے آگے بڑھا وہ رضا کو عامر سمجھ رہا تھا۔ افتی کا دل چاہا وہ کہیں سے سلیمانی ٹوپی لے کر بدر کے سر پر پہنا کے اسے ہمیشہ کے لیے کہیں غائب کر دے یا پھر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے اسے خاموش کرا دے۔

''میں اور افتی ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' بدر نے رضا حسن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دھماکہ کیا رضا حسن کی پوری ہستی ہل گئی طاہرہ بیگم بھی مارے حیرت کے اٹھ کھڑی ہوئیں بدر کے انکشاف نے وہاں موجود کھڑے سبھی افراد کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔

''یہ کیا بکواس ہے۔؟'' رضا حسن کے اندر کا غیرت مند مرد بلبلا اٹھا۔

''یہ بکواس نہیں حقیقت ہے عامر بھائی۔ پوچھ لیں افتی سے ہم ایکدوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں ساتھ گھر بسانا چاہتے ہیں؟'' بدر لپک کر افتی کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے لے آیا۔

''یہ پاگل ہے رضا۔ میں اسے نہیں جانتی؟'' افتی کو لگا اگر ابھی وہ نہ بولی تو بہت دیر ہو جائے گی اور دیر تو ہو چکی تھی افتی نے ایسا کیسے سوچا تھا کہ وہ چنے کا بیج بو کے گندم کاٹنے کی امید رکھے گی۔ ببول بو کے گلاب نہیں اُگائے جاتے۔

''افتی۔'' بدر کے لہجے سے دکھ و حیرت یکساں پنہاں ہو کے عیاں ہوا اسے لگا وہ اپنے بھائی کے سامنے ڈر گئی ہے اسی لیے مکر گئی ہے وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

''تمہیں اب ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب میں آ گیا ہوں؟'' اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے اس لیے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔

''یہ کیا ڈرامہ ہے لڑکے کھل کے کہو'' طاہرہ بیگم کسی انہونی کے خیال کے پیشِ نظر تھوڑا غصے سے بولی تھیں۔

''ماں جی۔ آپ تو یقیناً سمجھیں گی افتی صرف اپنے بھیا بھابھی کے خوف سے ایسا کہہ رہی ہے۔ میں بدر ہوں افتی کا دوست لاہور سے اس کو ملنے آیا ہوں اور ہم ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں پوچھ لیں اس سے۔'' افتی نے اپنا ہاتھ غصے سے بدر کے ہاتھ

سے چھڑایا۔

''کیا بک رہے ہو بدر۔نہیں جانتی میں تمہیں چلے جاؤ یہاں سے''

افتی ایکدم سے چیخی تھی وہ نا چاہتے ہوئے بھی خود کو عیاں کر گئی تھی۔

''کیا یہ سچ کہہ رہا ہے افتی۔طاہرہ بیگم نے سب سے پہلے خود کو سنبھالا تھا۔

''نہیں امی جان۔میں نہیں جانتی یہ مجھے کیسے جانتا ہے میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں''

افتی بے ربط سے انداز میں کہنے بدر کو حیران کر گئی بدر کو سمجھ نہیں آیا افتی ایسا کیوں کر رہی ہے۔

''بدر......تم نے سنا ابھی افتی نے کیا کہا۔'' طاہرہ بیگم اس کی جانب مڑیں بدر نے افتی کی بے اعتنائی پر اسے شکوہ کناں نظروں سے دیکھا آخر اسے اتنا ڈرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔وہ اسے اپنانے کے لیے آیا تھا اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے ساتھ نبھانے کے لیے۔

''افتی صرف آپ لوگوں کے ڈر کی وجہ سے اقرار نہیں کر رہی۔ورنہ آج صبح ہی ہم لوگ ملے ہیں اور اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس کے بھائی نے اسکا رشتہ زبردستی اس کی بھابھی کے بھائی سے طے کر دیا ہے۔مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا افتی میری زندگی ہے میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔'' آخری بات پر عامر کے کان کھڑے ہوئے۔

''کمینے انسان۔تیری تو میں زبان کھینچ لوں گا اگر اب افتی کا نام بھی لیا تو......'' اس سے پہلے کہ رضا اس پر جھپٹتا عامر نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا۔

''افتی میری بیوی ہے اور میرے بچوں کی ماں......تم اپنا یہ گھٹیا ڈرامہ کہیں اور جا کے رچانا۔'' رضا حسن نے عامر سے خود کو چھڑاتے ہوئے چلا کر کہا اور بدر نے خود پر ٹھنڈے پانی کی بالٹی پڑتی محسوس کی یا نہیں کوئی حیرت درد کا گلیشیر تھا جو اس انکشاف کے بعد بدر حیات کے جذبات منجمد کر گیا تھا۔دنیا جہان کی ساری حیرت بدر حیات کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔بدر کا انداز افتی سمیت وہاں موجود سبھی افراد کو سن کر گیا تھا۔مگر نہیں۔بدر حیات کو کسی بھی ڈرامے کے سامنے ہار نہیں مانتی تھی وہ اب آ گیا تھا اس نے افتی سے محبت کی تھی اسے اپنانے کی بات کی ہے وہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا کسی بھی قیمت پر نہیں۔وہ اپنی دھن کا پکا تھا ضدی تھا لیکن اس سے بھی بڑھ کے وہ پرعزم تھا زبان رکھتا تھا وعدے کی پاسداری کو جان دینے کی حد تک نبھانے کا قائل تھا۔

''آئم سوری بدر صاحب......آپکو شاید غلط فہمی ہوئی ہے افتی میری بھابھی ہیں آج ان کی شادی کی سالگرہ ہے اور یہ رضا حسن کی وائف ہیں......'' عامر نے ساری صورتحال کو سمجھتے ہوئے بدر حیات کو وہاں سے چلے جانے کے لیے کہا تھا اشتعال کی ایک تیز رو لہر بدر حیات کی رگ و پے میں نفرت بن کے دوڑی۔

اتنا بڑا دھوکہ اتنا بڑا جھوٹ اس قدر غلط بیانی۔بدر حیات کو آسمان سے زمین کی طرف پٹخ گیا۔افتی نے اسے بے وقوف کیوں

بنایا تھا آخر کیا وجہ و محرک کار فرما تھی اس سارے معاملے کے پیچھے۔اس نے لمحوں میں حساب لگایا اور ٹھان لی۔

''افتی سچ کیا ہے؟ رضا حسن نے افتی کے چہرے پر ہوائیاں دیکھیں تو پوچھے بغیر رہ نہیں سکا۔

''سچ بولو افتی اور بتا دو سب کچھ سچ سچ۔ابھی تھوڑا مشکل ہے مگر اس کے بعد ہم اپنی من پسند زندگی گزاریں گے۔کہہ دو سب سچ سچ چھوڑ دو ایسی ناپسند زندگی ہمارے پاس ایک اچھا موقع ہے۔'' وہ اسے اُکسا رہا تھا۔افتی بے ساختہ رو دی۔محض تفریح میں کھیلا جانے والا کھیل اسے تباہی کے دہانے پر لے آیا تھا۔نہ وہ اقرار کر سکتی تھی نہ ہی انکار۔اقرار کرتی تو گھر تباہ ہوتا انکار کرتی تو بھی گھر تباہ ہوتا بدر حیات کی ناراضی سہنا آسان کہاں تھا پھر رضا حسن جیسا شوہر چھوڑنا۔

''افتی......کیا یہ لڑکا سچ کہہ رہا ہے۔تمہارا کیا تعلق ہے اس کے ساتھ اور تم نے اسے کیا کیا بنا رکھا ہے۔؟ رضا حسن بے حد سرد اور کٹیلے لہجے میں کہتا افتی کے سامنے آ کھڑا ہوا افتی کی جان پر بن آئی افتی نے ایک نفرت کی نگاہ بدر حیات پر ڈالی اس نظر میں شکوہ تھا درد تھا غصہ تھا بدر حیات اسے دیکھ کے مسکرایا ایک انتقامی مسکراہٹ وہ اپنی ماں پر نہیں گیا تھا کہ جب اس کے باپ نے دوسری شادی کی اس کی ماں نے موت کو گلے سے لگا لیا۔اور بدر حیات کے باپ کو کبھی اندازہ ہی نہ ہو پایا کہ اس کی بیوی کو کون سا غم مار گیا ہے۔

بدر حیات ٹھان چکا تھا اس نے اپنی محبت کو کسی بھی قیمت پر حاصل کرنا تھا۔کسی بھی قیمت پر۔اپنے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو اس نے ٹھوکر پر رکھنا تھا۔اور اس وقت وہ اپنی اسی اسٹریٹجی پر عمل کر رہا تھا۔

افتی نے اس کے ساتھ اس کے جذبات کے ساتھ اس کی زندگی کے ساتھ کھیل کھیلا تھا۔بدر حیات وہی کھیل اب اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔بدر حیات زندگی میں اتنے دکھ دیکھ چکا تھا کہ اسے اپنا ہر دکھ اب اپنے قد سے چھوٹا لگنے لگا تھا وہ خود کو اب سنبھالنے لگا تھا۔

''رضا۔آپ میری بات کا یقین کریں یہ لڑکا جھوٹ کہہ رہا ہے آپ تو اپنی افتی کو جانتے ہیں ناں۔آپ تو مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں میرا اعتبار کرتے ہیں۔'' افتی رضا حسن کے کندھے سے لگ کے روتے تڑپتے اپنی سچائی کا یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''یہ بات تو تم مجھے بھی کہتی ہو افتی۔ڈرومت افتی تمہاری جو بھی حقیقت ہے میں اسے قبول کرنے کو تیار ہوں۔میں نے تم سے سچی محبت کی ہے اور میری محبت کا ظرف اتنا وسیع ہے کہ تمہاری بڑی سے بڑی خطا معاف کر سکوں۔'' وہ اسے اُکسا رہا تھا آنکھوں میں محبت کے دیپ روشن کیے۔

''سوری بدر۔میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا مگر مجھے تمہارے اتنے گہرے جذبات کا پتہ نہیں تھا مجھے جیسے ہی اندازہ نے کھیل ختم کر دیا پلیز یہاں سے چلے جاؤ میں اپنی زندگی میں بہت خوش ہوں۔'' افتی رضا حسن کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر بدر حیات کی منت سماجت کر رہی تھی ایک وقت انسان پر آتا ہے جب سارے راستے مسرور ہو جاتے ہیں۔اپنے بنائے جال میں افتی خود ہی پھنس رہی تھی بُرائی مکڑی کے جال کی مانند ہے بظاہر بہت پر کشش باریک اور نفیس مگر ریشم کے گچھوں کی مانند جو اُلجھتا ہے مگر ٹوٹتا نہیں بالکل اسی طرح بُرائی سے بچ

نکلنا مکڑی کے جال سے زندہ وسلامت باہر نکلنے جیسا ہے وہ جتنا آسان دکھتا ہے اتنا ہی پر پیچ اور گھمبیر ہوتا ہے۔اور گناہ کبھی چھپتا نہیں وہ کبھی نہ کبھی ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے افتی یہ بات بھول گئی تھی اکثر لوگ بھول جاتے ہیں۔

''میں نے تمہیں اپنانے کی بات کی تھی افتی......آج تمہیں یہاں اپنے ساتھ لے کے ہی جاؤں گا۔بدر حیات نے دوٹوک لہجہ اپنا یا رضا حسن نے افتی کو دیکھ کے زمین پر تھوک دیا۔افتی نے دہل کے دیکھا وہ غضبناک ہو رہا تھا اس کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں وہ خود زہر آلود ہو رہا تھا۔

''آج میں نے تمہیں تھوک دیا افتی۔میری طرف سے تم آزاد ہو اب چاہے جہاں مرضی اپنے جس عاشق کے ساتھ رہو۔میں غلط تھا جو تم پر اتنا اندھا اعتماد کرتا رہا۔'' رضا حسن بول نہیں پھنکار رہا تھا اعتماد کی بہت اونچی مسند سے وہ گرا تھا اپنے وجود کے پرخچے سمیٹنے کو ایک عمر نا کافی تھی اپنے آنسو اندر گرائے وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔

''آپ ایسا نہیں کر سکتے رضا۔آپ تو میری محبتوں کے امین ہیں میرے صادق جذبوں کے گواہ ہیں۔یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔'' وہ روتے روتے بے حال ہوگئی اور بے حال ہو کے رضا حسن کے قدموں پر جھک گئی وہ نہیں جانتی تھی کہ اب کی بار جو وہ گری ہے تو اب ساری عمر اسے گرے ہی رہنا ہے وہ کبھی سر نہیں اٹھا پائے گی سر اٹھا کر چلنا تو دور کی بات۔رضا حسن نے اس کے ہاتھوں سے اپنے پیر فوراً چھڑائے انداز ایسا تھا بدکنے کا گویا اسے کسی پلید چیز نے چھو لیا ہو۔

''یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا افتی......اس بات کی گواہی میں دے سکتا ہوں آج صبح میں نے تمہیں خود اس سے ملنے کے لیے جاتے دیکھا ہے اور میں پہلے تمہارے کھیل اور تمہاری چالاکی نہیں سمجھ پایا مگر اس وقت آج یہاں اس شخص کو دیکھ کر مجھے یقین آ گیا کہ امی جان کتنا صحیح کہا کرتی تھیں۔'' عامر نے بھی اپنے حصے کی آگ اگلی۔

''تم بیچ میں مت بولو۔تم تو خود میرے پیچھے پھرتے تھے تم کہاں کے حاجی ثناء اللہ ہو۔'' افتی روتے روتے بپھری تو طاہرہ بیگم نے عامر حسن کو خاموش رہنے کی آنکھوں ہی آنکھوں میں تلقین کی۔

''بہت شوق ہے ناں تمہیں کہ لوگ تمہارے حسن کے قصیدے پڑھیں۔جاؤ اب کسی بازار کی زینت بن کے بیٹھ جاؤ وہاں بہت آئیں گے تمہارے چاہنے والے'' عامر حسن ماں کی تنبیہ بھولے زہر اگل رہا تھا۔

''کہاں کمی رہ گئی تھی میرے پیار میں افتی کہ تم نے باہر دوستیاں پالنی شروع کی کر دیں۔'' رضا حسن کے لہجے میں شکوہ تھا طاہر بیگم کا دل کٹ کر رہ گیا کوئی اور عورت ہوتی تو اس شکوے پر کٹ کے مر جاتی مگر افتی زندہ کھڑی رہی اسے اپنی صفائی دینا تھی۔

''میں قسم کھا کے کہتی ہوں رضا۔میں نے آپ سے کوئی بے وفائی نہیں کی ہاں جس میں کچھ دیر اس سے بات......

''کیا بات کر رہی ہو افتین حیدر ہماری محبت پاکیزہ ہے ہمیں ان لوگوں کو کوئی صفائی نہیں دینی۔بدر حیات اس کی بات کاٹتے افتی

کو بال نوچنے کی حد تک زچ کرتے مجبور کر رہا تھا۔تبھی کب سے خاموش کھڑی طاہرہ بیگم کو بولنا پڑے۔

''رضا حسن......تمہاری رگوں میں ایک باکردار ماں کا خون دوڑ رہا ہے کیا تم چاہو گے کہ تمہاری اولاد کی پرورش ایک ایسی عورت کے ہاتھوں ہو جس کا کردار مشتبہ ہو۔اچھی طرح سے سوچ لو اور فیصلہ کر لو کیونکہ جو کچھ تم آج دیکھ رہے ہو وہ سے میں پانچ سال پہلے دیکھ چکی تھی۔ مجھے اب اس عورت کو تمہارے گھر نہیں رکھنا تمہاری خواہش ہو آنکھوں دیکھی مکھی نگلنے کی تو پھر میری وصیت ہو گی کہ تمہیں میری مری ہوئی کا منہ بھی نہ دکھایا جائے۔''افتی نے خوف سے آنکھیں بھینچ لیں ورنہ دیکھتی کہ بدر حیات مسکرا رہا تھا۔

''میں رضا حسن بقائمی ہوش و حواس تمہیں طلاق دیتا ہوں۔طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں......افتین حیدر ساکت ہو گئی بہت دیر گزر گئی کچھ دیر پہلے خوشیوں کا گہوارہ بنا گھر اب موت کی سسکیوں میں ڈوب گیا طوفان آ کے تباہی مچا کے گزر گیا بچے رضا حسن نے چھین لیے افتی نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا بدر حیات نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر باہر لا کے گاڑی میں بٹھایا رضا حسن کی تکلیف میں اس فحاشی کو دیکھ کے اور بھی اضافہ ہوا۔افتی سے اس نے سچی محبت کی تھی ہمیشہ اس کی خوشی کی پرواہ کی تھی مگر افتی نے اسے اتنا بڑا زخم دیا تھا کہ پچھلی عمر اس کی بھرپائی ممکن نہیں تھی۔وہ ٹوٹ کے بکھر گیا تھا اس کا اعتبار و اعتماد کرچی کرچی ہوا تھا۔کوئی پوجا بھی کرتا ہے کسی کے ساتھ یوں بھی ہوتا ہے جیسا افتین حیدر نے رضا حسن کے ساتھ کیا تھا۔اپنے بچھائے جال میں افتی نے خود ہی پھنس گئی تھی بدر حیات کے لیے کچھ دیر قبل محسوس کیا جانے والا درد اب یکسر ختم ہو گیا تھا اس کی جگہ اب غصے اور نفرت نے لے لی تھی اسے بدر حیات کی کمینگی پر غصہ تھا اس نے اس کا گھر تباہ کر دیا تھا اپنا گناہ وہ بھول گئی تھی۔بدر اسے لے کر سیدھا لاہور آیا تھا ماں باپ کے گھر بدر نے جانے نہیں دیا نہ ہی انہوں نے اب اسے قبول کرنا تھا اس کے والدین کی ایک عزت تھی۔معاشرے میں وہ اپنی نیک نامی کی وجہ سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔افتی کی لگائی کالک وہ ساری عمر دھونہ پاتے بدر حیات نے ایک طرح سے نادانستہ ان پر احسان کیا تھا......راستے بھر افتی خاموش رہی اور بدر حیات بھی۔مگر وہ بدر کی خاموشی سے اس کے موڈ کا اندازہ نہیں لگا پائی۔اس کے اندر ہی خود پسند عورت نے زیادہ دیر اسے رضا حسن کی بے اعتنائی و بے اعتباری کا غم منانے نہیں دیا۔ اس کے زرخیز دماغ نے بہت جلد تمام حقیقت کو قبول کرتے آئندہ کے لائحہ عمل کو تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔اس نے ایک نئی چال چلنی شروع کی تھی۔بدر حیات افتی کے خیال میں اس سے محبت ہی نہیں بلکہ دیوانگی کی حد تک عشق کرتا تھا وہ یقیناً اس کی خطا معاف کر دے گا وہ اس سے معافی مانگے گی بدر کا غصہ اترتے ہی وہ دونوں شادی کریں گے پھر وہ دونوں ساری زندگی ایکدوسرے کے وفادار رہیں گے افتی کبھی اسے شکایت کا موقع نہیں دے گی۔مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ بدر حیات نے اس افتی سے محبت نہیں کی تھی جو دغاباز تھی جھوٹی اور مکار تھی اس نے اس افتی سے محبت کی جیسی اس نے بدر حیات کے سامنے خود کو بنا کے پیش کیا تھا۔نفرت کا ایک بے کراں سمندر تھا جو آن کی آن میں بدر حیات کے وجود میں امڈا تھا مگر وہ اس طوفان کو اپنے اندر سموئے بظاہر پرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا......افتی اسے خاموش اور پرسکون دیکھ دیکھ کے نئے نئے منصوبے بناتی رہی کبھی انہیں توڑتی کبھی انہیں جوڑتی رہی......اس جوڑ توڑ

میں سارا سفر کٹ گیا بدر حیات اسے اپنے گھر لے آیا۔ وہ گھر جہاں اس نے افتی کے ساتھ رہنے کے خواب دیکھے تھے افتی کی سوچ سے بھی زیادہ بدر حیات کا گھر حسین تھا۔ دنیاوی آسائشوں سے ہر لحاظ سے مکمل اور بھرپور اور بے حد خوبصورت...... گھر پہنچنے کے بعد افتی جب بدر فریش ہو کے باہر آیا تب اسکے پاس آئی تھی۔

''سوری بدر...... میں آپکو سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہتی تھی مگر آپ کو کھو دینے کے خوف سے میں آپکو اپنی اصلیت بتا نہیں پائی۔ میں آپ سے محبت کرنے لگی تھی......'' بدر کا لفظ محبت پر خون کھولنے لگا۔ اس کے سارے جسم کی رگیں تن گئیں وہ جو بھی کہتی مگر اسے محبت کا نام دوبارہ اپنی کہانی میں نہیں جوڑنا چاہیے تھا یہ اس نے بہت بڑی بھول کی تھی اور اس کی خمیازہ یقیناً اسے بہت عبرتناک بھرنا تھا۔ بدر حیات نے اس کے خوبصورت چہرے پر اپنی پوری طاقت لگا کے تھپڑ مارا وہ چکنے فرش پر پھسلتی دور جا گری۔

''جتنا چاہیں مار لیں...... جیسی چاہیں سزا دے لیں مگر میری بات کا یقین کریں میں آپ سے محبت کرتی ہوں میں آپکا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی تبھی وہ جھوٹ بول کے آپکو چھوڑ آئی تھی ہمیشہ کے لیے......'' افتی کو لگا اب وہ کچھ سمجھے گا بدر حیات خاموش کھڑا کچھ دیر سوچتا رہا۔ افتی کی ہمت بندھی وہ اس کے قریب آئی۔

''آئی۔ لو۔ یو بدر جو ہوا اسے بھول کے ہم ایک اچھی اور بہتر زندگی کا آغاز کریں گے۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے یہ بات کر کے بدر حیات کے اندر بسے درندے کو آواز دی ہے بدر حیات نے اس پر ایک وحشت کے عالم میں اپنے گھونسوں لاتوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی تھی وہ ہذیان بک رہا تھا اس کے اندر کا فرسٹریٹڈ اور کامپلیکیٹڈ مرد باہر نکل آیا تھا۔

''کیوں کیا میرے ساتھ ایسا...... آخر کیوں؟'' وہ ہذیانی انداز میں اسے ٹھوکروں کی زد میں رکھتے چلایا۔ افتی مار کھا کھا کے ادھ موئی ہو گئی اس کا ہونٹ پھٹ گیا خون رسنے لگا۔

''تمہیں پتہ تھا میری محرومیوں کا...... میرے دکھوں کا پھر کیوں کیا میرے جذبات سے کھلواڑ......''

وہ اس کے خون آلود چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑے آنکھوں میں وحشیانہ پن بھرتے پوچھ رہا تھا افتی کا جبڑا سختی سے اس کے دونوں ہاتھ میں بھنچا تھا وہ بول نہیں پائی بدر کو اور تاؤ چڑھا اس نے غصے سے اس کے خوبصورت چہرے پر تھوکا۔ افتی نڈھال ہو کے گر گئی وہ اسے مارتا رہا اس نے اسے اتنا مارا کہ بدر حیات کے ہاتھ دکھنے لگے۔

''بہت ناز ہے تمہیں اپنے خوبصورت ہونے پر۔ اب میں تمہیں خراج پیش کروں گا؟'' اس نے وسفاکیت سے کہتے ادھ موئی فرش پر لیٹی افتی کو گھسیٹا اور تیز دھار بلیڈ کی مانند تیکھی چھری سے اس کے گالوں پر نقش و نگار بنانے شروع کر دیے۔ تکلیف کے اتھاہ احساس سے افتی کی چیخیں نکل گئیں اس کی چیخیں بدر حیات کو غیر معمولی طور پر پرسکون کرنے لگیں۔

''بول...... کیوں کیا میرے ساتھ ایسا۔ بول۔'' وہ اس کے نازک ہونٹوں کو سختی سے پکڑتے اسے بولنے پر اکسا رہا تھا افتی بلبلا

کے رہ گئی۔

یا پھر ہر ایک کے ساتھ ایسا کرتی ہے بول...... ورنہ جان سے ماردوں گا۔ جلدی بتا حرافہ تجھے کس نے کہا تھا کہ میرے دکھوں و محرومیوں سے کھلواڑ کر...... بول؟" وہ نوکیلی تیز دھار چھری اس کی گردن پر رکھے اس سے پوچھ رہا تھا سفاکی و بربریت اس کے انگ انگ سے مترشح تھی افتی کو حیرت ہوئی یہ وہی شخص تھا جو محبت کا مجسمہ ہوا کرتا تھا۔

شدید محبت کرنیوالوں کی نفرت بھی شدید ہوا کرتی ہے...... وہ اپنے ہر جذبے میں مخلص اور کھرے ہوتے ہیں بدرحیات بھی انہیں لوگوں میں سے تھا۔

"میں نے تمہارے ساتھ جان بوجھ کے ایسا نہیں کیا" افتی کو بولنا پڑا نہ بولتی تو اور مار کھاتی بدرحیات اس کی بات سن کے قہقہہ لگا کے ہنسا پھر دیر تک ہنستا رہا افتی کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہوا وہ اس کے سامنے کرسی ڈال کے بیٹھ گیا۔

"کتنے مردوں کو بے وقوف بنایا میرے سمیت وہ پیر کی جوتی سے افتی کے گال مسلتے بولا وہی گال جن پر کچھ دیر پہلے اس نے چھری سے نقش و نگار بنائے تھے۔

"کسی کو نہیں...... میں نے تمہیں بھی بے وقوف نہیں بنایا۔" افتی درد کو چھپاتے بمشکل تمام بولی اس کے سارے چہرے پر چھری سے کٹ لگے تھے پورے چہرے سے خون رس رہا تھا اور بہت درد کر رہا تھا۔

"جھوٹ مت بول حرافہ...... تجھے شوق ہے نامردوں کو الو بنانے کا۔ اور تو کامیاب بھی ہوتی ہے لے اب میں تجھے انہیں عورتوں کے لیے نشان عبرت بناؤں گا جو یہ سب ایک دوسرے کے دیکھا دیکھی میں کرتی ہیں......" وہ ایک دفعہ پھر اسے مار رہا تھا۔ مارتے مارتے افتی نیم بے ہوش ہوگئی لب سوکھ گئے حلق میں پیاس سے کانٹے اُگ آئے۔

"پانی......" افتی نیم بے ہوشی میں کراہی بدرحیات کے زخم ادھڑنے لگے اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اسے جان سے مار ڈالتا مگر اسے اتنی جلدی اسے نہیں مارنا تھا وہ اسے تڑپا تڑپا کے مارنا چاہتا تھا تاکہ پھر دوبارہ وہ کسی اور مرد کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش نہ کرسکے بلکہ وہ اس قابل ہی نہ رہے۔ وہ ایسے لوگوں میں سے نہیں تھا کہ افتی اسے دھوکا دیتی اور وہ اس دھوکے اور بے وفائی کا بدلہ بے گناہ دوسری عورتوں سے لیتا...... اسے اپنا بدلہ افتی سے ہی لینا تھا اور اسی سے لے رہا تھا۔ اس نے جتنی شدید اور گہری محبت کی تھی اتنی ہی نفرت بھی کرتا تھا کر رہا تھا۔

"پانی" افتی دوبارہ کراہی...... بدرحیات بے ہنگم سفاک قہقہہ لگا کے ہنسا۔

"پانی چاہیے ناں تمہیں...... ہاہاہا...... نہیں ملے گا یہاں کچھ نہیں ملے گا تمہیں نہ پانی نہ کھانا یہاں صرف مار اور نفرت ملے گی تمہیں۔ تمہارے گناہوں کی سزا، وہ پانی کی بوتل کھول کے پانی پیتے اسے للچا رہا تھا افتی کو صحیح معنوں میں اپنا آپ دوزخ میں محسوس ہوا مجھے معاف کردو...... مجھے جانے دو......؟ افتی بمشکل تمام خود کو گھسیٹتی اس کے قدموں تک پہنچی پانی پیتے بدر کو اچھو لگ گیا وہ پانی پیتے پیتے

ہنسا خوب ہنستا اور دیر تک ہنستا ہی رہا۔ معافی۔ اتنی جلدی۔ ابھی تو تمہارے حسن کا خراج باقی ہے میری جان۔ وہ ایکدم سے اپنا لہجہ بدل کے اس پر جھکا پھر اسے گھسیٹتے ہوئے بیڈ پر لے گیا چھری کی نوک سے اسے برہنہ کیا اور اسے نہایت سفاکیت سے اپنی درندگی کی بھینٹ چڑھایا۔ ایک وحشت و بربریت کے عالم میں ساری رات وہ اسے تار تار کرتا رہا اور اس کے منہ پر تھوکتا رہا۔ وہ پہلے اسے چومتا پھر اس کے چہرے پر تھوکتا۔ افتی نے زندگی میں کی جانے والی اس فاش غلطی کو اذیت سے دیکھا اسے رضا حسن کا التفات یاد آیا وہ ان لمحات میں اسے کسی نازک کلی کی مانند نرمی سے چھوا کرتا تھا۔ وہ اتنی مار کھا چکی تھی کہ اب اس میں رونے کی ہمت بھی نہیں تھی۔

☆............☆............☆

صبح وہ اٹھی تو بدر کمرے میں نہیں تھا...... اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا...... وہ بمشکل تمام اٹھی اور واش روم جا کے پانی کے دو چار چھینٹے مارے جو گزشتہ رات پورے سیاق وسباق کے ساتھ اس کے ذہن کے پردے پر نمودار ہوگئی۔ باہر جانے کا اپنا ارادہ ملتوی کرتے اس نے غسل کیا اور دوبارہ وہی پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اپنا تن ڈھانپنے کی کوشش کی۔ جو کہ کچھ ایسی کامیاب بھی نہیں گئی تھی۔ اسکے بدن کی ہڈیاں چور چور ہو رہی تھیں چہرے پر لگنے والے زخموں پر اب خون جم گیا تھا پانی کے چھینٹے زخموں پر تیزاب بن کے گرے افتی کے رہ گئی اتنا درد ہوا کہ آنکھیں بھر آئیں کسی کی زندگی سے کھیلنے والوں کا یہ شوق جتنا عجیب ہوتا ہے اسکی سزا و بدلہ بھی اتنا ہی عجیب اور اذیت ناک ہوتا ہے۔ افتی کو پہلے اندازہ نہیں ہوا مگر جب ہوا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ دو دن کی بھوکی تھی اسے بے حد بھوک لگی تھی وہ باہر نکل آئی کچن میں بدر کھڑا اپنے لیے چائے بنا رہا تھا۔ بدر نے افتی کو دیکھا اس کی موجودہ حالت اس کی نفرت کی بھڑکتی آگ پر پھوار کی مانند برسی۔

"اوہ سویٹ ہارٹ۔ کیا ہوا تم باہر کیوں آگئیں آرام کرتیں ناں"۔ وہ چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے اس کی طرف گھوما وہ نک سک سے تیار شاید آفس جا رہا تھا۔

"مجھے بھوک لگی ہے" افتی نے اپنے درد چھپائے اپنی انا کو بالائے طاق رکھتے بتایا۔

"اچھا...... آؤ آؤ...... تمہارا اپنا گھر ہے ویسا ہی گھر اور وہی گھر جو تم نے اور میں نے بنانے کی خواہش کی تھی...... آؤ یہ کچن ہے سنبھالو اسے......" وہ طنز کی آمیزش لیے بظاہر محبت سے لبریز ہو کے کہہ رہا تھا افتی کبھی گہرائی میں نہیں جاتی تھی اس نے ابھی بھی نہیں سمجھا اسے صرف بھوک لگی تھی اور اپنا پیٹ بھرنا تھا کسی بھی قیمت پر...... وہ آہستہ آہستہ چلتی اس کے پاس آئی۔

"تمہیں کھانا چاہیے نا۔ لو کھاؤ خود ہی پکا کے......" بدر نے افتی کا ہاتھ پکڑ کر جلتے چولہے پر رکھ دیا تھا افتی کی دلدوز چیخیں پورے گھر میں گونجنے لگی تھی آنکھیں دہل کے باہر کو آرہی تھیں درد ہی درد تھا اور اذیت ہی اذیت...... بدر حیات نے ایک بے ہنگم اور طنزیہ قہقہہ لگایا۔

"بس اتنا ہی برداشت کر سکی ہو...... جب مجھے درد دیا تھا تو تب کیوں نہیں سوچا کہ درد کبھی مجھے بھی سہنا پڑ سکتا ہے......" وہ اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لاؤنج میں لے آیا ساتھ ساتھ وہ چلا بھی رہا تھا۔

"مجھے جانے دو...... خدا کے لے مجھے جانے دو......؟ افتی درد سے بے حال بمشکل تمام الفاظ مجتمع کر پائی۔ بدر حیات نے اس کے زخمی چہرے پر کس کے تھپڑ مارا۔

"یہ سوچ اب نکال دو کہ کبھی تم واپس جا پاؤ گی۔ تمہیں واپس جانے دوں تا کہ تم پھر کسی بدر حیات کی زندگی خراب کرو۔ اس کی خواہشوں سے کھیلو اس کے خوابوں کو رسوا کرو۔" وہ ہزیانی انداز میں اسے پیٹ رہا تھا اس نے اسے اتنا مارا کہ تھک گیا۔

"تم ایک پاگل شخص ہو......" افتی نے خود کو اپنی ساری ہمت مجتمع کرتے خود کو چھڑاتے چیخ کر کہا بدر حیات لمحہ بھر کو اس کی جرات پر حیران رہ گیا اتنی مار اور تشدد سہہ لینے کے بعد بھی وہ تن فن کر رہی تھی اسے اس کی ہمت و جرات پر داد دینے کو جی چاہا اور اس نے دی بھی ہاں اس کا انداز اور طریقہ ذرا مختلف تھا۔

"ہاں ہوں میں پاگل...... اور مجھے پاگل بنانے والی تم ہو"۔ وہ چلایا۔

"مگر میں نے تم سے معافی مانگی ہے......" افتی نے جرح کی۔

"تو تمہیں لگتا ہے کہ تم معافی مانگو گی تو میں تمہیں معاف کر دوں گا افتی نے اس کی طرف دیکھتے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے اس کا دایاں ہاتھ بری طرح سے جل گیا تھا اوپر سے سارا گوشت اُتر گیا تھا نیچے سے ہڈیاں تک دکھ رہی تھیں افتی اپنے ہاتھ دیکھ کر خود بھی ڈر گئی اس کے ہاتھوں کا یہ حال تھا تو اس کے چہرے کا کیا حال کیا ہو گا اس پاگل شخص نے......؟

"اب تمہارا بدلہ پورا ہو گیا ہو گا مجھے جانے دو میرا گھر تم تباہ کر چکے ہو میرا وجود بھی۔ اب میرے اندر تمہاری مار سہنے کی طاقت نہیں ہے خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو میرے زخم بہت درد کر رہے ہین اور مجھے بہت بھوک لگی ہے پلیز یا تو مجھے جانے دو یا پھر مجھے کچھ کھانے کو دے دو۔" وہ ظلم کرنے والے سے رحم کی امید کر رہی تھی۔

"نہ تو میں تمہیں یہاں سے جانے دو گا نہ ہی تمہیں کھانا ملے گا۔ یہی تمہاری سزا ہے اب میں آفس جا رہا ہوں تم اپنا گھر سنبھالو میں واپس آؤں تو سارا گھر مجھے صاف کیا ہوا ملے......" وہ سفاکی کی حد تک بے بہرہ بنا ہوا تھا۔ وہ غلط بھی نہیں تھا ہر عمل کا ردعمل شدید ہی ہوا کرتا ہے۔

☆............☆............☆

رضا۔ طاہرہ بیگم نے اندر کمرے میں جھانکا رضا حسن کمرے میں اندھیرا کیے لیٹا تھا رضا اٹھو بیٹا۔ کھانا کھا لو۔ میں نے لگا دیا ہے! طاہرہ بیگم نے اندر آ کے کمرے کی لائٹ جلائی رضا نے بے ساختہ بازو آنکھوں پر رکھا طاہرہ بیگم نے دیکھا وہ رو رہا تھا ان کا دل کٹ کٹ کے گرا۔ اپنے بیٹے کی حالت ان سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

"بھوک نہیں ہے امی جان...... آپ پلیز بچوں کو کھلا دیں۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"ایسا کب تک چلے گا رضا...... کیا وہ عورت اس قابل ہے کہ اس کے لیے آنسو بہائے جائیں۔" وہ کتنے دنوں سے اس کی ایسی

حالت دیکھ دیکھ کے پریشان ہورہی تھیں جب سے وہ واقعہ ہوا تھا رضا حسن ٹوٹ کے بکھر سا گیا تھا۔ بچے الگ ماں کے لیے رو رہے تھے جگ ہنسائی الگ ہورہی تھی۔ کھانا گھر میں پکایا جاتا ٹیبل لگائی جاتی مگر کوئی بھی نہیں کھا پاتا۔ عامر الگ اس سارے واقعے سے اُلجھا ہوا تھا اسے رہ رہ کہ خود پر غصہ آتا رہا کتنی آسانی سے افتی کے ہاتھوں استعمال ہوتا رہا۔ وہ اس کا دیور تھا اس کا پہلا شکار یہ مانا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی ناجائز رشتہ نہیں تھا مگر پھر بھی پیار محبت کے والہانہ مظاہرے دونوں طرف سے چلتے رہتے تھے۔ ہاتھ پر ہاتھ مارنا۔ بازو گلے کے گرد بات کرتے کرتے حمائل کر دیتا۔ غیر اخلاقی لطائف کا تبادلہ اخلاق سوز حرکتیں جنہیں دوستی کے لبادے میں لپیٹ دیا جاتا۔ وہ کردار کے حوالے سے نہ ہی مگر ذہنی پراگندگی میں اس کے ہمراہ چلا تھا وہ بھی Spriualprostitusion کا شکار ہوا تھا اور رہا تھا۔ افتی ایک ایسی ساحرہ تھی جو ایک ہی نظر میں مقابل کو چاروں شانے چت کر ڈالتی ہے۔

اس پر بھی افتین حیدر کا سحر چلا تھا اور کئی سال چلا تھا ابھی بھی چل رہا تھا تبھی تو وہ مضطرب تھا بے چین تھا۔

''رضا۔ اٹھ جاؤ آ کے کھانا کھالو۔ آج میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی میں بوڑھی جان سارا دن ہڈیاں چٹخاتی ہوں اور تم لوگوں کا نخرہ ہی ختم نہیں ہوتا۔'' وہ رضا حسن کی غیر معمولی خاموشی سے تنگ آ کے خواہ مخواہ میں اُلجھ پڑی تھیں۔

''آپ چلیں میں آتا ہوں'' رضا نے منہ پر ہاتھ مار کے خود فریش کرنے کی کوشش کی۔

''نہیں تم فریش ہو آؤ۔ میں تمہارا میں انتظار کرتی ہوں؟'' انہیں پتا تھا وہ صرف ٹال رہا ہے تبھی انہوں نے اسے یہ جواب دیا تھا رضا حسن کے پاس اب کوئی چارہ نہیں تھا وہ ان کے ساتھ آ کے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا بچے پہلے ہی وہاں موجود تھے ملازمہ انہیں کھانا کھلا رہی تھی اسود ماں کے بغیر بہت چڑچڑا ہو رہا تھا۔ وہ افتی کے ساتھ بہت مانوس تھا بار بار ماں کو پکارتا۔

''عامر نہیں آیا ابھی تک۔'' رضا حسن نے عامر کی غیر موجودگی کو محسوس کرتے پوچھا تھا۔ گھر میں کتنے لوگ تھے پھر بھی خاموشی موت کے سناٹے کو پیچھے کر رہی تھی افتی کا تو انگ انگ بولتا تھا وہ گھر میں ہوتی تو رونق رہتی بھلے خاموش ہوتی مگر سناٹے بھی بات کرتے تھے اس کے وجود کی مہک بے جان اشیاء کو بھی مسحور کیے رکھتی۔

نہیں۔ آجکل اس پر کام کا لوڈ بہت زیادہ ہے اسی لیے رات دیر سے پہنچتا ہے۔ تم باتیں بعد میں کرنا پہلے کھانا کھالو۔ میں نے تمہاری پسند کی مکس سبزی بنائی ہے۔ انہوں نے اس کی پلیٹ میں سالن نکال کر ہاتھ میں چپاتی پکڑائی رضا کو پکڑنی پڑی بھوک تو کب کی مر چکی تھی مگر وہ انکار کر کے ماں کو ناراض نہیں کر سکتا تھا وہ جانتا تھا اس کی ماں اپنا دکھ چھپائے سب کچھ نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''عبداللہ آپ رات کو میرے پاس سو جانا۔ دادو کو تنگ مت کرنا اسود پہلے ہی انہیں بہت تنگ کرتا ہے۔'' وہ اسود کو گود میں اٹھاتا کھانا کھاتے عبداللہ کو بول کے گیا۔

''امی۔ اسود کا فیڈر بھجوا دیں میں اسے سلا دیتا ہوں آپ کھانا کھا کے تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ اچانک اسے اندازہ ہوا کہ وہ اتنے

دنوں سے بچوں کی ساری ذمہ داری ماں پر ڈالے ہوئے تھا وہ بچوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک گئی تھیں۔

دادو۔ عبداللہ کھانا ختم کرتے ہی اٹھ کر دادی کے پاس آیا تھا۔ میری مما کب آئیں گی طاہرہ بیگم کے دل پر ہاتھ پڑا وہ اس چھوٹے سے بچے کو اس قیامت کا کیسے بتائیں کیسے سمجھائیں کہ تمہاری ماں اب تم لوگوں کی زندگیوں میں نہیں آسکتیں شیشہ ایک بار ٹوٹ چکا تھا اب اس میں بال آ گیا تھا اب سب کچھ پہلے کی طرح ٹھیک نہیں ہوسکتا تھا۔

آپ بالکل بھی اچھا ہوم ورک نہیں کرواتیں۔ میری ٹیچر ڈانٹ رہی تھیں۔ عبداللہ معصومیت سے انہیں بتا رہا تھا افتی جیسی بھی تھی مگر وہ ایک اچھی ماں تھی بچوں میں اس کی جان تھی اور وہ رضا کو بھی سنبھالے ہوئے تھی کبھی ایک لمحے کو بھی رضا سمجھ نہیں پایا کہ افتی اسے دھوکہ دے رہی ہے وہ اس سے بے وفائی کر کے کسی اور کے ساتھ افیئر چلا رہی ہے۔

''اچھا ٹھیک ہے میں آپ کے بابا سے کہوں کی وہ آپ کو ہوم ورک کروادیا کریں گے!'' طاہرہ بیگم نے اپنے آنسوؤں کا گلا گھونٹا۔

''نہیں۔ پاپا کو بھی ہوم ورک نہیں کروانا آتا۔ مجھے میری مما کے پاس جانا ہے وہ سب سے اچھا ہوم ورک کرواتی ہیں۔'' عبداللہ کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو ایک ساتھ آئے۔

''آپ کی مما اب کبھی نہیں آئیں گی عبداللہ'' طاہرہ بیگم نے محبت سے اس کے بال سنوارے۔

''لیکن کیوں دادو۔'' عبداللہ کے لہجے میں حیرت تھی آنکھوں میں ویسے ہی آنسو اٹکے تھے۔

''کیوں کہ وہ آپ کو چھوڑ کے ایسی جگہ چلی گئیں ہیں جہاں وہ چاہیں بھی تو واپس نہیں آسکتیں۔'' طاہرہ بیگم نے چونک کے دیکھا رضا حسن اسود کو کاندھے پر سلائے دروازے میں کھڑے عبداللہ سے نہایت قطعیت سے کہہ رہے تھے۔

''لیکن کیوں پاپا۔'' عبداللہ باپ کی طرف مڑا۔

ابھی آپ اس سوال کو رہنے دو جب آپ بڑے ہو جاؤ گے تب میں آپ کو ساری بات سمجھاؤں گا۔ وہ نرمی سے اسے بات ختم کرنے پر اکساتے ساتھ لے کر بچوں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا طاہرہ بیگم ان کے جانے کے بعد پھوٹ پھوٹ کے رو دیں تھیں۔

☆............☆............☆

شدید بھوک کی وجہ سے اس پر غنودگی طاری ہوگئی تھی درد سہتے سہتے اب اس کا جسم سن ہو گیا تھا اس میں اٹھ کر بیٹھنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ بدر جب آفس سے واپس آیا تو وہ وہیں بے سدھ پڑی تھی جہاں وہ اسے چھوڑ کے گیا تھا۔ بدر کو اسے ہنوز حالت میں دیکھ کر بے حد غصہ اور اشتعال آیا۔ اس نے ٹھنڈے یخ پانی کا گلاس بے سدھ پڑی افتی پر ڈالا۔ ٹھنڈا پانی اس کے اکڑے ہوئے زخموں پر تیزاب بن کے گرا وہ بلبلا اٹھی بے ساختہ اس کی چیخیں نکل گئیں۔ بدر حیات اسے بری طرح سے گھسیٹتے ہوئے کرسی پر بٹھا کر باندھنے لگا افتی

عجب وحشت کے عالم میں اس کا پاگل پن دیکھ رہی تھیں گھٹی گھٹی سسکیاں اس کے اندر ہی دب گئیں تھیں اسے کسی وجہ کی ضرورت نہیں رہی تھی افتی پر تشدد کرنے کے لیے۔ اسے بس وقت چاہیے ہوتا تھا اور وقت اب اس کے پاس تھا افتی نے نیم وا آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی آج وہ اس پر کس انداز اور کسقدر تشدد کرنے والا تھا افتی کی گردن ایک طرف کرسی پر لڑھک گئی اس کی آنکھیں غنودگی سے بند ہونے لگیں وہ بھوکی تھی اس کا بی پی حد سے زیادہ گر گیا تھا مگر یہاں پرواہ کسے تھی وہ تو اسے حد سے زیادہ اذیت دینا چاہتا تھا اور دے رہا تھا۔

''بول ...... کیا کہہ کے گیا تھا میں ......'' گرم گرم اُبلتا پانی اس نے اچانک ہی افتی کے پیروں پر گرایا تھا افتی نے تڑپ کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا جو بے حد سرخ ہو رہے تھے اذیت سی اذیت تھی جو رگ جاں کو چیر گئی تھی کرموں کا پھل اتنا کڑوا کسیلا بھی ہو گا...... افتی نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا۔ مجھے یاد نہیں ......'' افتی اسے دوبارہ پانی کا گلاس بھرتے دیکھ کر جلدی سے بولی تھی ایک قیامت سے وہ گزری تھی۔

''کیوں ...... کیوں یاد نہیں تجھے حرافہ...... بول کتنے لوگوں کی زندگیاں تباہ کیں تو نے''

اس کی ذہنی رو بھٹک گئی وہ پھر اشتعال میں آ کے وہیں کھڑا ہو گیا جہاں سے چلا تھا۔ وہ کیا کہہ کے گیا تھا اسے بھول گیا یاد رہا تو بس اپنا بے وقوف بنائے جانا۔

''میں نے کسی کو بے وقوف نہیں بنایا اور میں سچ کہہ رہی ہوں ......'' افتی درد سے کراہ کے رہ گئی۔

''جھوٹ ...... جھوٹ بول رہی ہے تو......'' بدر حیات نے ایک اور گلاس افتی کے منہ پر ڈالا جو منہ سے ہوتے ہوئے اس کی گردن تک جھلسا گیا وہ تڑپ ہی تو گئی۔

''تو ذہنی فاحشہ ہے لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتی ہے تو...... تیرے جیسے گھروں میں بیٹھی ہوئیں ذہنی طور پراگندہ عورتیں (U-R-Spritualprostitute)'' وہ غصے سے اس پر جھپٹا۔

اس نے اس کو مار مار کے حسب معمول بے حال کر دیا افتی کے زخم ادھڑ گئے۔ پہلی بار افتی نے مر جانے کی دعا کی۔ اور دوسری یہاں سے بھاگ جانے کی...... دونوں ہی اس کے بس سے باہر تھیں۔ مگر خواہش تو نا تمام اور لا حاصل رہ ہی جایا کرتی ہیں۔'' مار دو مجھے...... خدا کے لیے بدر مار دو پھر تو تمہارا بدلہ پورا ہو جائے گا''۔ افتی گڑگڑاتے اس کے پیروں پر گری بدر حیات نے نفرت سے اس پر تھوکا۔

''اتنی جلدی تمہیں آزادی بخش دوں مسز افتین حیدر...... وہ نفرت اور استہزاء سے ہنسا: کتنی خوش فہم ہو تم ......'' اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

''نشان عبرت بناؤں گا میں تمہیں...... نشانِ عبرت ان عورتوں کے لیے جو گھر بیٹھ کے رانگ نمبروں پر محض تفریح کے لیے لوگوں کی زندگی اور ان کے جذبات و احساسات سے کھیلتی ہیں تمہاری طرح انہوں نے بھی کبھی نہیں سوچا ہو گا کہ جب وہ کسی کا دل توڑتی ہیں تو

کیسے لوگوں کی زندگیاں انکا اعتماد ان کے خواب ٹوٹتے ہیں وہ کیسے بکھرتے ہیں وہ کیسے پائمال ہوتے ہیں۔ وہ اسے ٹھوکروں کی زد پر رکھے چلا رہا تھا پھنکار رہا تھا مگر افتی ہوش وخرد سے بیگانہ اس کی مار سہہ رہی تھی۔

☆..........☆..........☆

چھ ماہ وہ بدر حیات کا تشدد سہتی رہی......اور ان چھ ماہ میں ہر گزرے دن اس نے بدر حیات کی نفرت میں اضافہ ہوتے دیکھا تھا۔ بدر حیات کی شدید محبت پر اس کی شدید نفرت غالب آ گئی تھی۔ اس نے جس زندگی سے نفرت کی تھی اسے ویسی ہی زندگی گزارنی پڑ رہی تھی......وہ اکیلا رہ گیا تھا افتی کے دیے دھوکے کے بعد اس کی ذہنی سطح بری طرح سے مجروح ہوئی تھی......وہ اندر سے ٹوٹ چکا تھا اور یہ عین ممکن تھا کہ وہ پاگل ہو جاتا......ان گزرے چھ مہینوں میں وہ کئی کئی دن افتی کو بھوکے رکھتا۔ اس نے بھوک کی شدت سے نڈھال افتی کو بارہا اس کے بچے ہوئے کھانے کو بے تابی سے کھاتے دیکھا پھر وہ اسے اذیت دینے کو کھانا بچا کے ڈسٹ بن میں پھینک دیتا۔ افتی زندہ رہنے اور اس کا تشدد سہنے کے لیے وہ کھانا ڈسٹ بن سے نکال کے بھی کھاتی۔ افتی کو عرصہ ہو گیا تھا ڈھنگ کا کھانا کھائے ہوئے اور پیٹ بھر کے کھانا اس نے کب کھایا تھا یہ تو اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ بدر حیات پر جب قنوطیت کا حملہ ہوتا وہ افتی کو مارتے ہوئے بجلی کے جھٹکے دیتا۔ اس کے لبوں پر ایک ہی سوال ہوتا تھا کہ افتی نے اسے دھوکہ کیوں اور کس کے کہنے پر دیا۔ افتی کے پاس جواب تو پہلے بھی نہیں تھا اب تو بجلی کے جھٹکے کھانے کی وجہ سے اس کی ذہنی حالت مخدوش ہو چکی تھی وہ بدر حیات کی مار تو سہتی مگر اسے اجنبیوں کی مانند ٹکر ٹکر بھی دیکھتی گویا پہچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ بدر حیات کو اور بھی غصہ آتا وہ اسے اور بھی مارتا وہ ہمیشہ اس سے اپنے ساتھ کی گئی زیادتی کے متعلق استفسار کرتا مگر کیا اس نے خود کبھی سوچا تھا کہ افتی ایسی کیوں تھی......کبھی اس نے جاننے کی کوشش نہیں کی کہ افتی کے ایسا ہونے کے پیچھے کیا ردعمل کارفرما تھا۔

آٹھ ماہ میں پہلی بار بدر حیات کو اس پر ترس آیا اس روز وہ کچن میں کھڑی کھانا ڈھونڈ رہی تھی بدر نے تعصب کی عینک اتار کے دیکھا وہ پہلے سے بے حد کمزور ہو گئی تھی بے تحاشا مار کھانے کی وجہ سے اس کی شکل وصورت بگڑ چکی تھی اس کے زخموں میں پیپ پڑ گئی تھی اس کے چہرے کے زخموں سے ریشہ رِستا تھا اور بے حد کریہہ نظر آتا تھا۔ اسکے جلے ہوئے ہاتھ پر دوا نہ ملنے کی وجہ سے دوبارہ گوشت نہیں آیا تھا بے حد پتلی اور باریک کالی سی جلد تھی جو ہڈیوں کو بمشکل ڈھانپے ہوئے تھی۔ وہ ایک حسین عورت سے بے حد مکروہ اور کریہہ صورت عورت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ بدر خاموشی سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا وہ بدر کو اپنے پاس اس قدر اچانک دیکھ کے بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ وہ ڈر گئی تھی اب وہ بدر کو دیکھ کے ڈر جایا کرتی تھی۔ وہ اسے بہت مارتا تھا اذیت دیتا تھا اور کھانا بھی نہیں دیتا تھا۔ بدر نے کچھ دیر اس کی طرف دیکھا اگر اس نے بدر کو دکھ دیا تھا تو کچھ کم اذیت بدر نے بھی اسے نہیں دی تھی۔ بدر نے اس کا گھر ہی تباہ نہیں کیا تھا اسے کسی کو صحیح معنوں میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

”بھوک لگی ہے نا تمہیں......“ وہ پہلی بار اس سے نرمی سے بات کر رہا تھا۔ افتی نے ڈر کے مارے جھٹ نفی میں سر ہلایا۔

''ڈرو نہیں...... سچ بتاؤ میں تمہیں نہیں ماروں گا!'' بدر نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تو افتی نے اپنے سر کو اثبات میں آہستگی سے جنبشِ دے دی۔ بدر نے آہستگی سے ہی اپنے نمبر سیل پر کوئی نمبر ملایا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں ہوم ڈیلوری سروس کے تحت ہوٹل سے پیک شدہ کھانا آچکا تھا۔ بدر نے خود پلیٹوں میں نکالا اور افتی کو ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا دیا: کھانا افتی کے سامنے رکھا اور اسے خود کھلایا افتی اس عنایت پر کچھ کچھ حیران رہ گئی مگر حیرانی پر غالب بھوک آگئی اسنے ندیدوں کی طرح بدر کی آفر کے چھن جانے سے پہلے ہی کھانا کھایا اور سیر ہو کے کھایا نجانے دوبارہ ایسا کھانا کبھی ملے بھی کہ نہ ملے۔

''میں تمہیں بہت مارتا ہوں ناں''۔ وہ اب اس سے سوال کر رہا تھا افتی مخمصے میں ڈوب گئی وہ اس سوال کا جواب کیا دے۔

''بولو...... بہت تنگ ہو ناں مجھ سے......؟'' افتی نے اب کی بار نفی میں سر ہلایا اور بدر کے تنے عضلات میں واضح نرمی اُترتی محسوس کی۔

''اچھا ٹھیک ہے ایک ڈیل کرتے ہیں...... میں تم سے ایک سوال پوچھوں گا تم مجھے اس کا صحیح صحیح جواب دینا پھر میں تمہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا پھر تم جہاں چاہے جانا اور رہنا بولو۔ منظور ہے ناں تمہیں......'' افتی کی جان پہ بن آئی وہ اسے کیا کہے ہاں کرتی تو بھی پھنستی نہ کرتی تو بھی مرتی۔

''بولو......'' وہ افتی کی خاموشی سے چڑتے ہوئے ایکدم سے جلایا افتی کے اوسان خطا ہونے لگے جھٹ اثبات میں سر ہلایا۔

''تم ایسی کیوں ہو افتی...... دیکھو تمہارا بولا آج کا سچ تمہاری جان بخشی کروا سکتا ہے!'' وہ اسے پچکار رہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ بھی یہ کھیل کھیلتے کھیلتے تھک گیا تھا۔ افتی نے اپنی سسکی دباتے ہچکی لی اس کی آنکھیں یک لخت نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

اس کا نام شایان لغاری تھا...... افتی نے یاد کرنے کی کوشش کرتے آنکھیں جھپکیں۔ وہ ہمارے محلے کا سب سے پیارا ہینڈسم لڑکا۔ میں اسے روز دیکھتی تھی اپنی کھڑکی سے کبھی چھت سے کبھی سڑک پر رک کے۔

''پھر...... کیا ہوا تھا'' بدر کے لہجے میں بے تابی در آئی۔

''مجھے وہ اچھا لگتا تھا...... بہت زیادہ اور وہ بھی جانتا تھا میں نے اسے بتا دیا اپنی محبت کا مگر اس نے میری محبت کو قبول نہیں کیا اس نے کہا میری جیسی ہزاروں روز اس کے پیچھے مرتی ہیں...... میں اس کے لیے اہم نہیں تھی پھر ایک روز اس نے مجھے اپنے گھر بلایا اور بولا۔ میں نے تمہاری محبت قبول کی آؤ ایک نئی زندگی شروع کرتے ہیں میں اُس وقت صرف پندرہ سال کی تھی...... وہ مجھے اپنے بیڈروم میں لے گیا۔ افتی کی ہچکیاں بندھ گئیں ماضی پوری آب و تاب کے ساتھ اس کے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا اس نے میری محبت کا بدلہ اپنی ہوس کے ساتھ دیا اس نے مجھے استعمال کیا اور ایک استعمال شدہ ٹشو کی طرح پھینک دیا میں نے اس کی بہت منتیں کیں اسے روکا مگر وہ وہاں سے چلا گیا اور جاتے جاتے ہوا اس نے جاتے سمے مجھے کیا کہا......'' وہ اپنی کہانی روکتے بدر سے اس طرح بولی جیسے دونوں بہت اچھے دوست ہوں اور ایک دوسرے کا غم بانٹتے رہتے ہوں۔

''اس نے کہا میرے جیسی لڑکی کو سچا پیار کرنے والا کوئی مل ہی نہیں سکتا کیونکہ میں اس قابل ہی نہیں کہ کوئی مجھ سے سچا پیار کرتے ہوئے مجھے اپنے گھر کی زینت بنائے۔ وہ چلا گیا میں نے اس کی اس بات کو چیلنج کی طرح لیا شایان لغاری چلا گیا لیکن میرے اندر ایک ایسی عورت کو جگا گیا جو......'' اس سے آگے افتی سے بولا نہیں گیا بدر ساری کہانی سمجھ گیا۔

''اور تم نے مجھ سے بدلہ لیا اس کی بے وفائی کا...... بدر کے زخم ادھڑنے لگے اس پر وحشیت طاری ہونے لگی وہ سفاک ہونے لگا افتی نے اس رات اسے خود پر تشدد کرنے سے نہیں روکا اس نے بجلی کے جھٹکے دیے افتی کی چیخیں بلند سے بلند تر ہوگئیں بالآخر بدر کا ضبط جواب دے گیا اس نے اپنا کہا پورا کیا اور بے سدھ پڑی افتی کو گھر سے باہر گلی میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا۔

☆............☆............☆

رضا حسن اپنے آفس میں لیپ ٹاپ پر مصروف کوئی کام کر رہا تھا انداز سے وہ اس وقت بے حد مصروف نظر آ رہا تھا۔ جبھی کوئی دستک دے کے اندر آیا تھا۔ رضا حسن نے لمحے بھر کے لیے نگاہ اٹھا کے دیکھا اور ساکت رہ گیا اس کے سامنے سعدیہ کھڑی تھی افتی کی بہترین دوست ''اندر نہیں بلاؤ گے رضا حسن!'' وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی رضا حسن کو اسے اندر بلانا پڑا وہ پچھلے ایک سال سے ہر ہفتے اس کے پاس صرف معافی کی درخواست لے کر آتی تھی اس نے افتی کے جانے کے بعد ہی رضا سے رابطہ کیا تھا۔

''سوری فار ایوری تھنگ رضا...... مجھے اگر ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ افتی یہ سب کرے گی میں کبھی بھی اس کا ساتھ نہ دیتی...... میں تمہاری مجرم ہوں کیونکہ اگر میں افتی کا اسوقت ساتھ نہ دیتی تو وہ کبھی بھی اتنا بڑا قدم نہ اٹھا پاتی۔''

''تمہاری بات مکمل ہوگئی کیا'' رضا حسن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سعدیہ سے استفسار کیا سعدیہ اس بے اعتنائی پر جل کر رہ گئی۔

''رضا۔ مجھے معافی چاہیے تم سے میرے اندر کا گلٹ ساری ساری رات مجھے سونے نہیں دیتا مجھے اپنی غلطی کا ازالہ کرنا ہے......''

سعدیہ زچ ہو کے رودی رضا نے اسے نظر بھر کر دیکھا دونوں اچھی فرینڈز تھیں اور دونوں کی دوستی میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔

''کیا ازالہ کرنا چاہتی ہو تم......'' رضا حسن نے اسے دیکھتے پوچھا سعدیہ کو خوشی ہوئی چلو وہ اس سے پوچھ تو رہا تھا ورنہ تو اس گزرے ایک سال کے عرصے میں وہ اس کی بات سننا گوارا ہی نہیں کرتا تھا۔

''تمہاری اور بچوں کی زندگی سنوارنے کی ایک کوشش کر کے۔'' سعدیہ نے آس کے جگنو آنکھوں میں چمکائے رضا حسن کے زخم ادھیڑے کیا افتی کے دیے دکھ کے بعد وہ کسی پر اعتماد کر سکتا تھا اسے تو عرصہ ہو گیا تھا مسکرائے ہوئے چین کی نیند سوئے۔

''تمہیں کیا لگتا ہے سعدیہ...... کیا میرے اندر مزید تجربہ کرنے کی ہمت ہے ابھی؟'' وہ لیپ ٹاپ بند کر کے پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''تمہیں کم از کم خود کو اور مجھے ایک موقع تو اور دینا ہی چاہیے رضا حسن...... پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوا کرتیں اور میری زندگی

ایک کتاب کی مانند تمہارے سامنے کھلی پڑی۔'' سعدیہ روہانسی ہوئی۔

''مگر میری کتاب زندگی کے صفحات اب کسی بھی قسم کے جذبات واحساسات سے خالی ہو چکے ہیں اب...... میرا ساتھ تمہیں سوائے درد کے اور کچھ نہیں دے سکتا تم کیوں اپنی زندگی تباہ کرنے پر تلی ہوئی۔'' رضا حسن نے اس کی جلتی آنکھوں میں واضح نظر آتے پیغام پر اسے جھنجلا کر سمجھایا سعدیہ مسکرائی۔

''رضا حسن...... مجھے ایک موقع دو اپنی محبت کو آشکار کرنے اور پروف کرنے کے لیے تم بھلے مجھے محبت نہ دو۔ بے اعتباری و بے اعتنائی دو مگر مجھے میری محبت سے مت روکو...... میں بچوں کے ساتھ رہ لوں گی اور تب تک تمہیں نہیں تمہاری زندگی میں خود کو شامل ہونے کے لیے کہوں گی جب تک تم خود اپنے لیے میرے دل میں جگہ نکلتی محسوس نہ کرو۔ اور محبت کرنا کوئی ایسا مشکل بھی نہیں ہے رضا...... سعدیہ نے ایسا کہتے ہوئے رضا حسن کے تمام اعتراضات ختم کیے تھے رضا حسن نے ہلکا سا مسکراتے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا ایک لمبا اور تھکا دینے والے سفر کا اختتام اب ہوا ہی چاہتا تھا کیونکہ اکیلا رہتے اور افتی کے دیے غم سہتے سہتے اب وہ بھی تھکنے لگا تھا زندگی اسے ایک موقع فراہم کرتے کھلی بانہوں سے اپنی طرف بلا رہی تھی تو رضا حسن کو بھی نہیں چاہیے کہ وہ ناشکری کرتا۔ اس نے زندگی کو آگے بڑھ کے گلے لگا لیا تھا۔

☆..........☆..........☆

افتی کی آنکھ بے تحاشا شور سے کھلی۔ اس نے آنکھیں مسل کر اٹھ کر سوچنے کی کوشش کی کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے یہاں کوڑے کے ڈھیر پر اسے کون پھینک کے گیا اسے یاد نہیں آسکا۔ وہ اپنا ذہنی توازن اور یادداشت کھو چکی تھی۔ اس نے اپنے اردگرد بے تحاشا لوگوں کا ہجوم دیکھا بھانت بھانت کے لوگ اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے وہ ایک کریہہ صورت عورت تھی بچے اس سے ڈر کے بھاگنے لگے کچھ سخت دل اسے مار کے بھگانے کے درپے ہو گئے...... آہستہ آہستہ لوگوں کا ہجوم دھند کی مانند چھٹنے لگا۔ وہ وہیں کوڑے کے ڈھیر کی باسی ہو گئی۔ بھیک مانگ کے کھاتی کبھی کوڑے کے ڈھیر سے کھانا ڈھونڈتی۔ پیٹ کا دوزخ بھرتی کبھی بچوں کے پیچھے انہیں پتھر مار کے بھگانے کی کوشش کرتی جو اسے مارنے کو لپکتے تھے ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ افتین حیدر تھی جس کی مرضی سے دن طلوع ہوتا تھا دنیا جس کے تابع تھی خوشیاں اس کے گھر کی باندی تھیں اور وہ خود کسی شہزادی کی طرح سب کے دلوں پر راج اور حکومت کیا کرتی تھی۔ ایک چھوٹی سی غلطی محض وقت گزاری کے لیے کھیلا جانے والا کھیل یوں بھی قیامت لا سکتا ہے افتی سمیت شاید کسی کو بھی اندازہ نہ ہو ہو ہی نہیں سکتا ورنہ کوئی یہ قبیح فعل سرانجام ہی کیوں دے۔ موبائل کمپنیوں کے سستے ترین کال ریٹس اور ایس ایم ایس پیکجز کئی گھروں کو تباہ کر چکے ہیں کر رہے ہیں اس میں قصور موبائل کمپنیز کا نہیں انھیں استعمال کرنے والے لوگوں کا ہوتا ہے جو غلط استعمال کرتے ہیں۔

☆..........☆..........☆

عامر حسن کی لاہور پوسٹنگ ہوئی تو وہ اپنی فیملی کو لے کر یہاں شفٹ ہو گیا تھا آجکل اس کی بیوی دوسرے جی سے تھی سو اکثر بیمار رہا کرتی عامر حسن نے اسے کراچی سے میکے بھجوا دیا تھا ویسے بھی ایک ذمہ دار پولیس انسپکٹر ہونے کے ناطے اس کا شیڈول بہت بزی تھا سو وہ اس انداز میں سارہ کی کیئر نہیں کر پاتا تھا جیسی اس کو ان شروع کے ایام میں ضرورت تھی۔ سب کچھ اپنے معمول پہ آ گیا تھا آہستہ آہستہ سب نارمل ہو گئے تھے رضا حسن گو کہ افتی کو مکمل طور پر نہیں بھولا تھا مگر پھر بھی وہ سعدیہ کا مقام پہچاننے لگا تھا اس کا رویہ کبھی بھی سعدیہ کے ساتھ سرد نہیں رہا تھا لیکن اس میں وہ گرمجوشی بھی مفقود تھی جیسی وہ پہلے افتی کے ساتھ رکھتا تھا اب وہ اعتبار کرنے سے ڈرتا تھا وہ محبت کرنے سے بھی ڈرتا تھا افتی کی ایک چھوٹی سی بھول نے کئی لوگوں کی زندگیوں کو ڈسا تھا کئی گھر تباہ ہوئے تھے کئی لوگوں کی عزت نفس ذات کا غرور شخصی انا مجروح ہوئی تھی...... مگر وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے جلد یا بدیر زخم بھر ہی جایا کرتے ہیں اور ایسا ہی ان لوگوں کے ساتھ بھی ہوا تھا...... بچے افتی کو بھول کر سعدیہ کو اپنی ماں سمجھنے لگے تھے اور سعدیہ نے بھی اپنا آپ گنوا دیا تھا رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی کے مصداق اس نے رضا حسن کے نکاح میں آتے وقت اپنے اندر سے میں کی ''خو'' نکال دی تھی۔

فون کی بیل ہوئی تو عامر حسن نے فائل پر سے نظریں اٹھا کر انٹر کام اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری جانب حوالدار اسے کچی آبادی کی طرف کسی کی لاش کے ملنے کی بابت بتا رہا تھا وہ کسی لاوارث عورت کی لاش تھی اور کچی آبادی میں سے کوئی بھی اس کی تدفین کرنے کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتا تھا اسی لیے انہوں نے پولیس سینٹر کال کی تھی۔ عامر حسن نے ساری تفصیل سننے کے بعد خود وہاں جائے وقوعہ پر جانے کا ارادہ کیا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں وہ وہاں پر موجود تھا۔ کچی آبادی میں لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ وہ بھیڑ کو چیرتا اس لاش کے پاس گیا اسی عورت کا بوسیدہ سا ڈوپٹہ اس پر ڈال کر اسے لپیٹا گیا تھا۔ عامر حسن نے بس ذرا کی ذرا اس کا چہرہ دیکھا اور ساکت رہ گیا۔ وہ ہر چہرے کے متعلق سوچ سکتا تھا مگر اس چہرے کو دیکھنے کے لیے نہیں افتین حیدر کا خوبصورت ترین چہرہ اب کسی کوڑھی کی مریضہ کے چہرے میں تبدیل ہو چکا تھا اس کا سارا چہرہ کھلا ہوا تھا مگر عامر حسن نے اسے پھر بھی پہچان لیا تھا اس کی باطن کی آنکھ ویسے ہی شفاف تھی اور دل کا کوئی نہ کوئی کونہ آج بھی افتی کی یاد سے روشن تھا۔

''اس کی موت کیسے ہوئی......'' وہی بوسیدہ چادر اس کے چہرے پر ڈال کر وہ ایکدم آنکھوں میں امڈی نمی کو چھپاتے وہاں جمع ہجوم سے پوچھ رہا تھا۔

''کوڑے کے ڈھیر سے کھانا ڈھونڈ ڈھونڈ کے اکثر کھایا کرتی تھی جی۔ شاید کوئی زہریلی چیز کھا لی ہو۔'' ہجوم میں سے کسی نے بتایا تھا عامر حسن کے دل پر گھونسہ پڑا۔

''کب سے ہے یہ عورت یہاں۔ میرا مطلب ہے کتنا عرصہ ہو گیا؟'' اس نے اپنی زبان لڑکھڑاتے محسوس کی۔

''یہی کوئی ایک ڈیڑھ سال سے تو دیکھ ہی رہے ہیں جی کہاں سے آئی یہ بھی نہیں پتا ایک دن کوڑے کے ڈھیر پر بے ہوش دیکھی

تھی ہم نے۔‘‘ ہجوم میں سے ہی جواب آیا تھا۔ عامر حسن انہیں پوچھ نہیں سکا کہ اس عورت کو یہاں کون پھینک گیا ہوگا اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہوگا وہ تو اس کی حالت بتا رہی تھی مگر دل کا ایک گوشہ جانے کیوں مگر درد کی بھاری سل میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا کیونکہ جن لوگوں کو کبھی آپکا دل اسیری کی اونچی مسند پر بٹھا دے اس سے رہائی پھر ممکن نہیں ہو پایا کرتی۔ اور شاید نہیں یقیناً عامر حسن کبھی بھی افتی کے بارے میں رضا حسن کو بتا نہیں پائے گا کہ کیونکہ جن سے محبت کا رشتہ رہ چکا ہو ان کے بچھڑ جانے کے باوجود بھی دل کا ایک کونہ ان کی یاد کے دیے سے ہمیشہ روشن رہتا اور کبھی نہ کبھی کہیں اچانک سے ان کے سامنے آ جانے کی خواہش بھی ہمیشہ دل میں پنپتی ہی رہتی ہے۔

عامر حسن نے رضا حسن کے دل میں اس یاد کے دیے کو ہمیشہ جلنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ (تارِ عنکبوت) برائی تارِ عنکبوت کی مانند پہلے شکار کو اپنی جانب راغب کرتی ہے اور جب وہ پھنس جائے تو اسے یونہی خود میں دبوچ لیتی ہے پھر چاہنے کے باوجود اس جال سے رہائی نہیں مل پایا کرتی اور تڑپ تڑپ کر جان دینا ہی مقدر ٹھہرتا ہے۔ جیسے افتین حیدر کے ساتھ ہوا تھا اور جیسا اکثر افتین حیدر جیسی لڑکیوں کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔

☆............☆............☆

میرے بے خبر، میرے بے نشاں

انہوں نے اسے سرتا پیر غور سے دیکھا پھر اس کا نام پوچھا تھا

''کلی'' اس نے لہرا کے بتایا تو مسکراہٹ نے ان کے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا بڑے عرصے کے بعد وہ مسکرائے تھے۔

'' کچی کلی'' انداز میں حیرت کے ساتھ شرارت بھی گھل گئی تھی۔

''نہیں نہیں...... کھلی ہوئی کلی'' بتانے والی کا انداز بڑا بے ساختہ اور تردیدی تھا۔

''کم عمر ہو'' انہوں نے اپنی تجرباتی نگاہیں اس کے کامنی سراپے پر ڈالیں تو بول اٹھے۔

''دکھتی ہوں مگر ہوں نہیں'' اس نے جواباً بڑے آرام سے پھر تردید کی تھی۔

''اٹھارہ کی ہو'' انہوں نے موٹے عدسہ والا چشمہ آنکھوں پر جمایا۔

''نہیں...... تیئس کی'' کلی کا انداز ابھی بھی وہی تھا تردیدی اور قطعی۔

''پہلی بار میرا اندازہ غلط ثابت ہوا کسی کے بارے میں'' ان کے لہجے میں شکستگی بھرا دکھ تھا کلی کھل کے مسکرائی دو قدم ان کے بیڈ کے قریب بڑھ آئی۔

''یہی تو زندگی ہے......'' انداز مدبرانہ تھا۔ ''سیانے کہتے ہیں کہ زندگی میں کیا ہر کام کبھی نہ کبھی پہلے ہی کیا جاتا ہے'' حشمت زیدی نے چونک کر دیکھا۔

''یعنی تم کہنا چاہتی ہو کہ میرے اندازے غلط ہونگے آج کے بعد...... یہ اس کی شروعات ہے'' عینک اتارتے ہوئے انہوں نے اضطراب کی کیفیت میں اس پر سے گرد جھاڑی۔ مگر کھلی ہوئی کلی کا اپنا وہی پر اعتماد قدرے لاپرواہ سا انداز تھا۔

''نہیں...... یہ ضروری بھی نہیں مگر ہونے کو تو کچھ بھی ہوسکتا ہے ہر انسان کو ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے'' اس نے آگے بڑھ کے کھڑکی کے پردے کھول دیے تازہ ہوا کے ساتھ روشنی نے کمرہ اپنے وجود سے بھر لیا ایک ساٹھ سالہ شخص کو جو تجربات کی بھٹی میں جل کے کندن بن گیا تھا، ایک تیئس برس کی لڑکی زندگی پڑھا رہی تھی سمجھا رہی تھی۔

''یہ جاب تمہاری ضرورت ہے'' انہوں نے اس کے جواب کی تردید کی ناتائید، موضوع ہی بدل دیا۔

''شوق ہے'' اس نے پھر تردید کی۔

''ہائیں'' ان کی آنکھیں اور منہ کھل گیا ایسی عجیب وغریب لڑکی انہوں نے آج تک نہ دیکھی تھی۔

''تو پھر تنخواہ نہیں ہوگی'' کھلی ہوئی کلی نے ایک نظر دیکھا اور سر کو نفی میں جنبش دی۔

''نہیں......اس کے بدلے کچھ اور لوں گی......'' کھل کے ٹھنڈی سانس بھرتے اس نے ایک نظر حشمت زیدی کو دیکھا مگر وہ کوئی جواب نہیں دے پائے سوچ میں پڑ گئے کہ ان کے پاس پیسے کے علاوہ کیا ہے جو وہ اس کامنی سی لڑکی کو دے سکتے ہیں مگر

''وہ بھول گئے تھے کہ وہ پارس تھے......''

☆☆☆

دوسرے ہی دن وہ صبح صبح آ گئی تھی گھوم پھر کر سارا گھر دیکھا......انداز میں ایسا استحقاق تھا گویا یہ گھر اس کی اپنی ملکیت ہو......حشمت زیدی جیسا جاہ جلال والا بندہ بھی حیران رہ گیا گو کہ اب انہوں نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا مگر پہلی بار......انہیں اس کیئر ٹیکر کو دیکھ کر اچھا لگا اس کا مالکانہ استحقاق بھرا رویہ انداز دل کو بھایا شاید تنہائی کے عفریت سے بچنے کو وہ اس کی ذات میں دلچسپی لے رہے تھے تقدیر کا کیسا ہیر پھیر تھا کہ حشمت زیدی جیسا قابل، ناقابل تسخیر شخصیت کا حامل شخص ایک معمولی سی کیئر ٹیکر کی ذات میں دلچسپی کا پہلو ڈھونڈ رہا تھا ......یہ قدرت کی ستم ظریفی ہی تو تھی مگر زعم اناء کے مارے لوگ اکثر ہی تقدیر اور وقت کے تھپیڑے کھانے کے بعد اپنی ہی باتیں اور اصول بھول جایا کرتے ہیں سو حشمت زیدی کو بھی یاد نہیں رہا......ورنہ شاید مر جاتے

''آپ کا گھر اچھا ہے مگر بہت اچھا نہیں'' کھلی ہوئی کلی گھوم پھر کر واپس ان کے سامنے آ چکی تھی۔

''یہ گھر کہاں ہے یہ تو مکان ہے'' ان کے اندر کا سارا کرب لہجے میں ڈھل گیا کھلی ہوئی کلی نے چونک کر دیکھا۔

''آپ نے اسے مکان کیوں بننے دیا......آپ کو گھر اچھے نہیں لگتے کیا؟'' وہ کتنی بڑی بات کر رہی تھی نوکری کے پہلے ہی دن ......اتنا ذاتی سوال......وہ گھر سے نکالی بھی جا سکتی تھی حشمت زیدی کے جاہ جلال سے کون واقف نہیں تھا پھر کلی نے ایسے بے احتیاطی کیوں کی تھی کیا وہ ان کی عادات سے ناواقف تھی ادب کی دنیا کی اتنی معروف شخصیت کو وہ کیوں نہیں جان سکی تھی یا پھر وہ نڈر تھی یا نا سمجھ......مگر وہ نڈر ہی تھی تبھی تو آنکھیں ان کے جھریوں والے چہرے پر گاڑھے جواب کی منتظر تھی۔ حشمت زیدی کو برا نہیں لگا یہ ان کے لیے بھی حیرت کا مقام تھا مگر انہیں کلی کو ٹوکنا بھی اچھا نہیں لگا جواب تو تھا نہیں......اسی لیے مسکرا کر چپ ہو گئے۔ آپ نے جواب نہیں دیا......پوچھ سکتی ہوں کہ کیوں نہیں دیا۔ کھلی ہوئی کلی پاؤں پسارے ان کے سامنے آ بیٹھی نیلے سمندر جیسی آنکھوں میں اشتیاق کی سرخی لہرا رہی تھی چہرہ کا بھولپن استحقاق کی روشنی میں مدغم ہو کر چہرے کی چمک بڑھا رہا تھا حشمت زیدی کو اس میں ضد اور ہٹیلا پن واضح دکھا......ان کے اپنے ناولز کی ہیروئن کی طرح......جن کی مداح ایک دنیا تھی

''گھر تو عورت سے ہوتا ہے......اور مجھے عورتیں اچھی نہیں لگتیں'' انہوں نے تھک کر ٹوٹتی سانس بحال کی......کبھی کبھار عام سے

سوال کے مشکل جوابات دینے بہت دشوار لگتے ہیں۔

''جھوٹ''، کلی نے حسب عادت کھل کے تردید کی نا چاہتے ہوئے بھی وہ چونک گئے بولا ان کے سامنے ان کی کہی بات سے تردید کرنا ممکن تھا کسی کے لیے......اور یہ چھٹانک بھر کی لڑکی......

''میں مان ہی نہیں سکتی یہ بات، سر کو دائیں بائیں نفی میں جنبش دیتے ہوئے وہ پر یقین تھی''

''تم مجھے کتنا جانتی ہو بھلا'' انہیں برا نہیں لگا انہیں عجیب لگا تھا۔

''جتنا میں آپ کو جانتی ہوں اتنا آپ خود کو بھی نہیں جانتے'' کھلی ہوئی کلی کا پر اعتماد انداز مدلل اور قطعی تھا۔اس کی بات سن کے وہ ہولے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔

''تم اپنی عمر سے بڑا دعویٰ کر رہی ہو''

''کلی......بغیر ثبوت کے دعویٰ نہیں کرتی'' اس کے لہجے میں خودی کے اعتماد کا چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔جس نے کلی کی پور پور کو بھگونا شروع کر دیا تھا۔پہلی بار وہ دل کھول کے ہنسے شاید بہت مدت کے بعد......انہیں اس چھوٹی سی لڑکی کی پر اعتماد شخصیت میں اپنی جھلک نظر آئی مگر کلی برا مان گئی۔

''آپ میرا مذاق مت اڑائیں ......یہ بات میں ثابت بھی کر سکتی ہوں'' اس کا روکھا پن گول چہرے کی معصومیت پر حاوی ہو گیا۔

''اچھا......مگر کیسے'' اب کی بار انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں جناب......جتنا میں نے آپ کو پڑھا ہے اتنا کوئی اور نہیں پڑھ پایا ہوگا اور آپ کے ہر ناول میں مرکزی کردار عورت کا ہی ہوتا ہے آپ عورت کو مضبوط شخصیت کے روپ میں دنیا کے سامنے لانا چاہتے ہیں آپ کی تخلیق کردہ عورت......آج کی عورت کی نمائندہ ہے ہر عورت آپ کی تخلیق کردہ عورت کو کاپی کرنا اپنا فخر سمجھتی ہے آپ ہر عورت کو مضبوط و مستحکم اور کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں تو اسی لیے ناں کہ آپ کو عورت پسند ہے مگر اس کی بے بسی اور بے کسی آپ کو دکھ دیتی ہے آپ کو عورت کے دکھ......دکھی کر دیتے ہیں'' کلی کا جوش و خروش آخری جملے پر دھیما پڑ گیا'' اور یہ سچ ہے کہ آپ کی ہر تخلیق کردہ عورت کے دکھ پر میں پہروں روئی ہوں اور جانے مجھے ایسا کیوں لگتا تھا ہر بار کہ آپ بھی تحریر کے ساتھ ساتھ روئے ہوں گے۔

کلی کے خاموش ہونے پر وہ یوں ہنسے گویا رو دیے ہوں انہوں نے سر کو جھٹکا ایسے جیسے دکھوں کو جھٹک رہے ہوں مگر کچھ دکھ زندگی کا ناسور بن جاتے ہیں جو ہماری حماقتوں کی وجہ سے ہمارے حصے میں آتے ہیں ساری زندگی ہمارے ساتھ چلتے ہیں نہ ٹھیک ہوتے ہیں نا ضدمل بس رستے ہی رہتے ہیں۔

''تم باتیں بہت کرتی ہو...... جب سے آئی ہو چائے تک تو پلائی نہیں مجھے تم نے...... جبکہ تمہارا دعویٰ تھا کہ تم میرا اوروں سے بہتر خیال رکھ سکتی ہو'' انہوں نے اسے بات بدلتے ہوئے ڈپٹ دیا تھا کلی نے سر پر چپت مار کے خود کو اس غلطی کی جیسے سزا دی۔

''میں ابھی آپ کے لیے چائے لاتی ہوں...... آپ نے اس جیسی اچھی چائے زندگی میں کبھی نہیں پی ہو گی'' اس نے حسب عادت پھر دعویٰ کیا تھا...... اور کچن کی جانب سرپٹ بھاگ گئی تھی۔

☆☆☆

''سر...... آپ سے کوئی ملنے آیا ہے...... وہ بیڈ پر دراز گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے ہاتھ میں کتاب پکڑ رکھی تھی اپنا ہی پانچ سال قبل شائع ہونے والا ناول تھام رکھا تھا جبھی کلی نے کمرے کے اندر جھانک کے دیکھ کر کہا تھا۔''

''کون ہے؟'' وہ بس ذرا کی ذرا متوجہ ہوئے تھے۔

''معلوم نہیں...... میں تو نہیں جانتی'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ حشمت زیدی نے ایک ٹھنڈی آہ فضا کے سپرد کی بھلا یہ لڑکی تھی کیا چیز...... انہیں بتانے سے پہلے کم از کم اسے آنے والے سے پوچھ تو لینا چاہیے تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے بے شک وہ ادب کی دنیا کے ایک قد آور شخصیت تھے ایوارڈ یافتہ ڈرامہ نویس تھے ان سے ملنے والوں کا ایک جم غفیر تھا مگر پھر بھی...... اپنی بیماری کے باعث اب نہ وہ زیادہ دیر بیٹھ سکتے تھے نہ ہی بات چیت کر سکتے تھے اسی لیے وہ بہت خاص لوگوں سے انتہائی ضرورت کے تحت ملا کرتے تھے...... گھر میں چونکہ اکیلے تھے اسی لیے انیں اپنے لیے ایک کیئر ٹیکر کی ضرورت پڑی تھی، انہیں یادداشت کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا تبھی تو دوا لینا بھول جاتے تھے جس کا نتیجہ ان کے بیمار پڑنے کی صورت میں نکلتا تھا۔ آفاق (بھتیجا) کے جرمنی جانے کے بعد ہی وہ زیادہ بیمار پڑے تھے شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے انہیں بائیں طرف فالج ہوا تھا اور اب وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھے زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتے تھے یا کبھی کبھار وہیل چیئر پر باہر چلے جاتے گھر کے کام کاج کے لے ایک جزوقتی ملازمہ آتی تھی مگر کلی کے آنے کے بعد تمام گھر کی ذمہ داری اس نے از خود اپنے سر لے لی تھی ہاں اوپر کے کاموں کے لیے ایک لڑکا رکھا ہوا تھا اور کلی کا بس چلتا تو اسے بھی چلتا کرتی کہ بہ زعم خود وہ محترمہ خود بھی کافی پھرتیلی واقع ہوئی تھیں اور خاصی نڈر اور بے باک بھی......''

''بھیج دوں اندر......'' انہیں سوچ میں گم دیکھ کے وہ ایک بار پھر احتراماً پوچھ رہی تھی۔

''تم نے نام پوچھ لینا تھا ان سے'' جانے وہ سختی کیوں نہیں کر سکے۔

''نام پوچھنے سے کیا فرق پڑ جاتا...... آپ بتائیں اگر آپ کی طبیعت ٹھیک ہے تو انہیں بلا لاتی ہوں۔ آپ نوارد سے مل لیجیے وگرنہ میں آپ کی طبیعت کا بتا کر ان صاحب سے معذرت کر لیتی ہوں......'' اس نے ان کے تھکے تھکے نڈھال چہرے کی طرف دیکھ کر توقف کیا پھر خود ہی وضاحت دیتے بول اٹھی شاید اس نے بھی ان کے غیر مطمئن انداز کو نوٹ کر لیا تھا۔

"سر......آپ کی طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی اب آپ اپنے دیرینہ اور خاص دوستوں سے مروتاً بھی گفتگو کے لیے وقت نہیں نکال پاتے آپ کی صحت آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی اسی لیے میں نے مفتی صاحب کو ایسا کہا ہے" اس نے آہستگی سے کہہ کر سر جھکا لیا تھا لہجہ مضبوط اور قطعی تھا گویا اس نے جو کیا تھا اپنے تئیں بالکل ٹھیک کیا تھا۔

"مفتی نصیرالدین آئے ہیں" حشمت زیدی کے دیرینہ دوست، بہت بڑے کالم نگار اور ڈرامہ نویس......وہ ان کے تیس برس پرانے دوست تھے کلی نے ان کے استفسار پر اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"وہ میرے تیس سال پرانے دوست ہیں اور تم نے انہیں باہر بٹھا دیا ہے؟" انہیں بے حد غصہ آیا تھا۔

"یعنی میرے گھر میں مجھ سے ملنے کے لیے اب اسے اجازت درکار ہونے لگی ......" ان کے لہجے میں غصہ اور رنج ایک ساتھ پنہاں ہونے لگا کلی کا سر جھک گیا نا چاہتے ہوئے بھی وہ انہیں غصہ دلا گئی تھی کلی کو دکھ ہوا وہ ان کی بہت عزت وقدر کرتی تھی وہ تو انہیں ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی دکھ دینا تو پھر دور کی بات......

"سوری سر......میں تو بس آپ کی خرابی طبیعت کے باعث......اس کی بات مکمل نہیں ہو سکی تھی حشمت زیدی نے اس کی بات اس کے لبوں سے اچک لی تھی۔"

"بس......انہیں بلا کر لے آؤ" انہوں نے تحکم بھرے لہجے میں اسے ڈپٹا تھا کلی سرپٹ ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی تھی۔

"سر آپ کو بلا رہے ہیں......اس نے آتے ہی مفتی صاحب کو کہا تھا وہ اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھنے ہی لگے تھے کہ اس کی آواز نے انہیں رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"سنیں......وہ آپ کے دیرینہ دوست سہی مگر......اب وہ پہلے کی طرح آپ کے ساتھ لمبی لمبی نشستیں نہیں جما پائیں گے آپ ذرا کام کی بات جلدی کر لیجیے گا" مفتی صاحب بے چارے تو ہونق ہو گئے منہ آپ ہی مارے حیرت کے کھل گیا۔

"اب چلیں بھی......ان کی طبیعت ویسے بھی آج صبح سے ٹھیک نہیں ہے" وہ ان کے تاثرات سے بے نیاز اپنی ہدایات ان کے گوش گزار رہی تھی۔

"یہ بچی کون رکھی ہے تم نے زیدی، اندر آتے ہی انہوں نے سلام دعا کے بعد پہلا سوال یہ داغا تھا۔" کلی کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکی وہ چائے لینے بھاگی......زیدی صاحب کو ان کے استفسار پر بلاوجہ کی شرمندگی ہوئی انہیں جیسے یقین تھا کلی نے کچھ نہ کچھ انہیں بھی کہا ہوگا۔

"معاف کرنا یار......جانے کس طرح غلط فیصلہ کر گیا اور اسے رکھ لیا جیسے میرے دوستوں کی خبر ہی نہیں ہے عجیب من مانی کرنے والی لڑکی ہے......اب بھی تمہیں اتنی دیر باہر بٹھائے رکھا اور مجھے خبر تک نہ دی" انہوں نے شرمندگی سے وضاحت دی تو مفتی صاحب بے

ساختہ مسکرائے۔

''مجھے بالکل برا نہیں لگا یار...... میں تو یہ اس لیے پوچھ رہا تھا کیونکہ پہلی بار تم نے کوئی درست فیصلہ کیا ہے'' وہ ہنس دیے تھے زیدی صاحب کو تعجب سا ہوا۔

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ...... تم نے اس لڑکی کو رکھ کر بہت اچھا فیصلہ کیا ہے اسے تمہاری بہت پرواہ ہے اور تمہاری صحت کی خرابی کا ازحد خیال بھی...... ورنہ سچ پوچھو تو میں خود کو تمہارا لنگوٹیا یار کہتا ہوں مگر جب تم سے ملنے کے لیے آتا ہوں تو اپنی باتوں کے قصوں میں اتنا محو ہو جاتا ہوں کہ یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ تم نہ زیادہ بیٹھ سکتے ہو نہ ہی زیادہ بات چیت کر سکتے ہو مگر آج اس لڑکی کی وجہ سے مجھے اس بات کا احساس ہوا ہے اور مجھے بہت اچھا لگا ہے کم از کم کوئی تو ہے جو تمہارا بہتر خیال رکھ سکے گا اب'' زیدی صاحب کو کلی کی تعریف سن کے بے حد اچھا لگا۔ کچھ دیر پہلے جو ان کا موڈ خراب ہوا تھا وہ مفتی صاحب کی بات سن کے اب ٹھیک ہو گیا تھا بلکہ قدرے خوشگوار ہو گیا تھا انہیں کچھ دیر قبل کلی کی کہی ان کی صحت کے حوالے سے بات یاد آئی تھی...... بے ساختہ وہ مسکرا دیے تھے اس روز مفتی صاحب بھی جلدی اٹھ گئے تھے اور ان کی طبیعت بھی زیادہ خراب نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

کلی ان کا ناشتہ لے کر آئی تھی...... کارن فلیکس کے ساتھ گرم دودھ اور ابلا ہوا انڈہ تھا۔ حشمت زیدہ نے دیکھا تو ان کا منہ بن گیا تھا وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے انڈہ کبھی نہیں کھاتے تھے اور انہوں نے آتے ہی کلی کو اپنا ڈائٹ چارٹ اور دواؤں کا استعمال سمجھا دیا تھا اور وہ اپنے اصولوں میں کس قدر سخت اور قطعی تھے یہ بھی مگر کلی کو جیسے ان کے متعین کردہ اصولوں سے انحراف کرنے میں مزہ آتا تھا تبھی تو روز ہی کوئی نہ کوئی ان کا اصول توڑ دیتی۔

''پہلے انڈہ کھا لیں سر...... تب تک دودھ تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے گا آج میں زیادہ گرم کر بیٹھی تھی'' وہ ان کے سرد بر فیلے تاثرات سے بے نیاز اپنی ہدایات دے رہی تھی۔

''مجھے انڈہ نہیں کھانا تھا! بمشکل تمام اپنے غصے کو کنٹرول کرتے وہ بول پائے ورنہ تو جی چاہ رہا تھا کہ وہی انڈہ اٹھا کر اس کے سر میں مارتے جو شاید جان بوجھ کے انہیں زچ کرتی تھی ویسے بھی وہ مزاجاً شارٹ ٹیمپرڈ تھے رہی سہی کسر بیماری نے چڑچڑا بنا کر پوری کر دی تھی مگر وہ ازلی بے نیازی سے پوچھ رہی تھی۔''

''ارے...... آپ کو انڈہ پسند نہیں کیا مجھے تو اتنا اچھا لگتا ہے''

''اف'' ان کا جی چاہا وہ اپنا سر نوچ ڈالیں کیونکہ بال تو جھڑ چکے تھے۔

"شاید آپ بھول رہی ہیں کہ میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں اور مجھے انڈہ ڈاکٹر نے روکا ہے" وہ غصے کو دباتے ہوئے الفاظ نہیں اسکا وجود چبا رہے تھے گویا...... کہانیوں میں ضدی، ہٹیلی اور منہ پھٹ بے نیاز ہیروئنز کی خودسری بے وقوفی کے قصے تحریر کرنا بہت آسان تھے جبکہ حقیقت میں برداشت کرنا بہت مشکل...... جبکہ وہ مزے سے انڈہ چھیل کے کھا رہی تھی۔

"ارے سر آپ بھی کمال کرتے ہیں ڈاکٹرز کو کیا پتا...... وہ تو بس ایویں ہر چیز سے روک دیتے ہیں اب بھلا بیمار بندہ کیا کھائے گھی، چینی، نمک تو وہ روک دیتے ہیں اور خالی ہوا سے پیٹ بھرتا نہیں...... اور انڈے کے پیچھے تو یہ ڈاکٹرز ویسے ہی پڑے رہتے ہیں بھلا ایک بے ضرر سا انڈہ اتنے بڑے انسان کا کیا بگاڑ سکتا ہے بلکہ اس میں موجود پروٹین جو جسم کے لیے بے حد مفید ہوتا ہے...... بھئی میں تو روز انڈہ کھاتی ہوں چاہے سنڈے ہو یا منڈے روز کھاؤ انڈے......" وہ بے حد مزے سے انڈہ کھاتے ہوئے بول رہی تھی حشمت زیدی نے بے حد خاموشی سے اس کے بے فکرے انداز کو دیکھا زمانے کی سختیوں سے بے نیاز اسکا چہرہ ہر قسم کے تفکر سے پاک تھا انہیں بے ساختہ اس پر رشک آیا وہ کس قدر خوش نصیب تھی جو من موجی کرتی تھی مزے سے جیتی تھی جس کے چہرے پر تفکرات کا جال نہیں بچھا نظر آتا تھا مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ ضروری نہیں کہ جن کے چہرے صاف اور تفکرات سے پاک نظر آئیں انہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا بعض لوگ دکھوں کو ہنسی کی تہہ میں بھی چھپائے رکھتے ہیں دکھ دیمک کی مانند انہیں چاٹ کے کھوکھلا کر دیتے ہیں مگر کسی کو خبر ہی ہو نہیں پاتی۔

"مگر یہ بالکل بھی ضروری نہیں کہ آپ اپنی صحت سے کوتاہی برتیں میں جانتی تھی کہ آپ کو انڈہ پسند تو ہے مگر ڈاکٹرز نے منع کر رکھا ہے یہ میں نے اپنے لیے بنایا تھا، حشمت زیدی نے اس کی اس حرکت پر اسے گھور کے دیکھا تو کیا وہ انہیں للچا رہی تھی"

"نہیں سر...... میں آپ کو للچا نہیں رہی تھی مگر میں نے ویسے ہی پوچھ لیا کیونکہ بیمار انسان کے دل میں بھی ایک خواہشات کا سمندر موجزن رہتا ہے اور کبھی کبھی بے احتیاطی کر لینے سے کوئی مسئلہ نہیں بنتا نہ ہی ایک دن ڈائٹنگ چھوڑنے سے کوئی موٹا ہو جاتا ہے" وہ بے ربط سے انداز میں مثال دے رہی تھی مگر اس کے چہرے سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود بھی اپنی دی جانے والی وضاحت سے مطمئن نہیں ہے مگر اسے چہرے کے تاثرات پڑھنے آتے تھے حشمت زیدی نے اس کی بات سننے کے بعد بے حد آہستگی سے سوچا تھا۔

"ناشتہ کر لیں سر...... دس بجے آپ کو دوا بھی لینی ہے" وہ ان کے بے جا خاموشی سے شاید گھبرا گئی تھی تبھی بول اٹھی تھی ویسے بھی زیادہ دیر وہ خاموش رہ نہیں سکتی تھی زیدی صاحب نے اسے اکثر خود کلامی کرتے دیکھا تھا پورے گھر میں چکراتے وہ اونچی آواز میں بڑبڑاتی رہتی تھی کبھی بجلی پر برستی کبھی گیس کی لوڈشیڈنگ کرنے والوں کو کوستی اور نہیں تو حشمت زیدی کی لائبریری سے نکال نکال پڑھی جانے والی کتابوں کے اقتباسات دہراتی رہتی جن میں سے اکثر ہی زیدی صاحب کے ناولز کی کہانیوں کے اقتباس ہی ہوتے اور حشمت زیدی کو برملا اعتراف تھا اس بات کا کہ ان سنہری الفاظ کو تخلیق کرتے سمے وہ اس قدر خوبصورت اور تاثیر بھرے نہیں تھے جتنے کلی کی زبان سے ادا ہونے کے بعد وہ دلنشین محسوس ہوتے تھے وہ زندگی کی حکایتوں پر مبنی فلسفہ بگھارتے کوئی ماورائی کردار ہی دکھتی اور محسوس ہوتی تھی کبھی الہڑ، بے نیاز

اور شوخ کبھی سنجیدہ مدبر اور متین......وہ چلتا پھرتا کوئی ماورائی کردار ہی تھی زیدی صاحب نے بارہا اس کی شخصیت میں مخفی داستانوں کو کھوجنا چاہا تھا اسے ایک ماہ سے زائد کا عرصہ گزرا تو زیدی صاحب نے اسے کچھ رقم دینا چاہی تھی......وہ بقول اسکے اخبار میں ان کا دیا اشتہار پڑھ کر ان کے پاس نوکری کی درخواست لے کر آئی تھی یہ الگ بات کہ درخواست بس اسی کے بقول تھی ورنہ عملاً تو وہ تہیہ کر کے آئی تھی ان کے ہاں یہ جاب کرنے کا اور گھر سے ہی یہ یقین بھی اپنے ساتھ باندھ لائی تھی کہ اسے ہی یہ جاب ملنی ہے نہ ملتی تو وہ قائل کر لیتی جیسا کہ اس نے کیا بھی تھا۔

''مجھے پیسے نہیں چاہئیں سر! وہ روپے دیکھ کر یوں بدکی گویا کوئی سانپ دیکھ لیا ہو''

''میں نے آپ سے کہا تھا مجھے اس خدمت کے پیسے نہیں لینے'' کھلی ہوئی کلی کے لہجے میں دردسمٹ آیا۔ زیدی صاحب اس کی کیفیت سمجھ نہیں سکے بلکہ الجھ گئے۔

''مگر......تم میری اتنی خدمت کرتی ہو......میرا بھی تو کوئی حق بنتا ہے'' ان کے سادہ سے لہجے پر کلی نے انہیں ایک نظر دیکھا۔

''میں آپ کی خدمت کسی بھی صلے کی تمنا کے بغیر کرتی ہوں سر......میں آپ کی فین ہوں آپ کی ہر تحریر ہر جملے سے محبت کرنے والی......پہلی بار مجھے آپ کے قریب رہنے کا موقع ملا ہے اور اسے میں کسی غرض کی نظر نہیں کر سکتی اور یہ بات حشمت زیدی جیسے عالمگیر شہرت رکھنے والے رائٹر کے لیے نئی نہیں تھی وہ جوان اور بوڑھے ہر طرح کے لوگوں کے دلوں پر راج کرتے تھے ان کی تحریریں قارئین کے دلوں میں روشنی امید اور محبت کا دیا بن کر جلتی تھیں دھڑکتی تھیں یہی وجہ تھی جب اپنی بیماری کے باعث انہوں نے اخبار میں کیئر ٹیکر کی تلاش کا ایڈ دیا تو شہر بھر سے موصول ہونے والی کالز کی تعداد سینکڑوں میں تھی ان کے اس قدر چاہنے والے تھے کہ کیا ہی کسی آسکر ایوارڈ یافتہ کسی اداکار کے ہونگے۔ ان کے یہی چاہنے والے ان کی زندگی بھر کا حاصل تھے ان کا غرور ان کا فخر وانبساط......وہ خوش نصیب تھے مگر حقیقتاً نہیں تھے وہ لوگوں کی بھیڑ میں ان کی چاہتوں کے ہجوم میں گھرے تھے لیکن درحقیقت اکیلے تھے اور یہ بات دنیا والے نہیں جانتے تھے مگر کھلی ہوئی کلی جان گئی تھی اور کہیں نہ کہیں وہ انہیں پہچان گئی تھی۔

''مگر یہ غرض تو نہیں ہے......تم میرا اتنا خیال رکھتی ہو میری خاطر مجھے ہی ڈانٹ دیتی ہو تو کیا میں اتنا خود غرض ہوں کہ تمہارا خیال نہ رکھوں'' انہوں نے اسے عادت کے برخلاف وضاحت دی کھلی ہوئی کلی اور کھل گئی مسکراہٹ نے اس کے چہرے پر ستاروں جیسی جھلملاہٹ بکھیر دی تھی۔

''مجھے جب کچھ چاہیے ہوگا بتا دوں گی بلکہ زبردستی لے لوں گی آپ سے''

''مگر میرے پاس ایسا کیا ہے پیسے کے علاوہ......میں تو خالی ہاتھ ہو چکا اب......میرے دامن میں سوائے پچھتاؤں کے اور ہے ہی کیا......میں تو ایک ہارا ہوا شخص ہوں جو دکھوں کا بار اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا ہوں......'' جواباً وہ جیسے شرمندہ سے ہو گئے اپنی خدمت کے

عوض اگر کلی نے کچھ ایسا مانگ لیا جو وہ دے نہ سکے تو......اس اس خوف ناک سوچ کا کرب بڑا جان بلب تھا۔

''جو آپ مجھے دے سکتے ہیں وہ مجھے اس دنیا میں اور کوئی نہیں دے سکتا سر......اور جو مجھے چاہیے وہ آپ کے علاوہ اور کسی کے پاس ہے بھی نہیں''اس نے مسکرا کر مبہم سا لہجہ اپنایا تھا

''مثلاً کیا''انہیں اس پہیلی پر تجسس ہوا۔

''بتادوں گی......ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے''وہ پر اسرار مسکراہٹ سجائے ان کے تجسس کو ہوا دے رہی تھی۔

''ابھی کیوں نہیں''ان کے لہجے میں بے چینی در آئی وہ عمر کے اس حصے میں نہیں رہے تھے کہ انتظار کی گھڑیاں گن سکیں۔

''اس لیے کیونکہ فی الحال آپ کے پاس وقت نہیں ہے......میں نے فزیوتھراپسٹ کو فون کر دیا ہے وہ بس آتا ہی ہوگا اب آپ کچھ دیر آرام کرلیں پھر میں آپ کو دھوپ میں لے جاؤں گی وہ حسب عادت ہدایات دیتی چھپاک سے نکل گئی تھی پیچھے انہیں سوچوں کے گھنے اندھیرے جنگل میں تنہا چھوڑے ہوئے ''

☆☆☆

''آپ کو بچے اچھے لگتے ہیں سر......''پارک میں کھیلتے بچوں کو دیکھتے اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

''نہیں'' یک لفظی جواب میں کہہ کر انہوں نے گویا بات ختم کرنے کی کوشش کی تھی مگر کھلی ہوئی کلی کا منہ حسب عادت حیرت سے کھل گیا وہ وہیل چیئر کو روکے گھوم کے ان کے سامنے آ گئی زیدی صاحب جھنجلا گئے انہیں کی اس کی اسی عدالت سے ڈر لگتا تھا جو وہ وقت بے وقت جگہ بے جگہ لگائے کھڑی ہو جاتی تھی۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے سر......آپ کہانیوں میں تو ہر مرد کو بچوں سے عشق ہوتا ہے''

''مجھے میری تخلیق کردہ کرداروں سے منسوب مت کیا کرو کلی......میں اپنی تخلیق کردہ کہانیوں میں کہیں نظر نہیں آتا''انہوں نے اسے ٹوک دیا تھا۔

''نہیں سر......ایک تخلیق کار اپنی ہر تخلیق میں سانس لیتا نظر آتا ہے وہ ہر جگہ محسوس ہوتا ہے اس نے بڑی روانی اور جوش سے ان کی بات کی تردید کی'' زیدی صاحب چڑ سے گئے اس لڑکی کو خدا جانے ان سے کیا بیر تھا جو ان کی ہر کہی بات کی تردید کر دیتی یوں ظاہر کرتی گویا وہ انہیں خود سے زیادہ جانتی ہو۔

''تم کتنا جانتی ہو میرے بارے میں......''وہ ایکدم غصے میں آ گئے تھے آنکھوں میں غصے و درشتگی کی سرخی آنکھیں دہکا رہی تھی لب بھینچے ہوئے تھے گویا بڑے ضبط کے مراحل سے گزر رہے ہوں کلی نے انہیں ایک نظر دیکھا پھر مضبوط لہجے میں بولی۔

''جتنا میں نے آپ کی تحریروں میں آپ کو جانا ہے اس حوالے سے آپ بچوں کو پسند کرتے ہیں آپ بچوں کو فرشتوں سے

منسوب کر دیتے ہیں انہیں پھول کہتے ہیں ان کے منہ بسورنے پر آپ دکھی ہوتے ہیں ان کی شرارتوں پر آپ محظوظ ہوتے ہیں......سر آپ کو بچے اچھے لگتے ہیں مضبوط لہجے میں سمجھاتے گویا وہ انہیں اس حقیقت کو مان لینے پر آمادہ کر رہی تھی کیسی پاگل لڑکی تھی جو اپنے سے دوگنا بڑے آدمی کو اس کے رائج کردہ اصول وضوابط توڑنے کی باتیں سمجھایا کرتی تھی وہ انہیں ان سے زیادہ جاننے کا دعویٰ کرتی تھی وہ انہیں انہی کی رائے اپنے بارے میں بدلنے کی بات کرتی تھی وہ غلط نہیں تھی مگر عجیب ضرور تھی وہ انہیں اپنی نظر سے دیکھتی تھی اس کے ذہن میں جو تخیل ان کی شخصیت کا بن چکا تھا وہ انہیں اس حوالے سے دیکھا کرتی تھی جانچا کرتی تھی اور اس بات کی خواہاں رہا کرتی کہ ''حشمت زیدی'' خود کو اسی کی نظر سے دیکھا کریں وہ نڈر تھی اور دلیر تھی جو حشمت زیدی کے بارے میں اپنی قطعی رائے پیش کرتی تھی اور اسی پر ڈٹ جاتی تھی۔

''تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھی لڑکی......کتابوں کی دنیا سے نکل آؤ حقیقت کچھ اور ہے......ایک تخلیق کار کی تخلیق کردہ دنیا چاہے جتنی بھی حسین ومکمل سہی مگر ضروری نہیں کہ اس کی زندگی بھی اسی قدر حسین ومکمل ہو......اتنی ہی آسودہ اور خوشحال ہو اور اس کی شخصیت اگر کامل و یکتا محسوس ہو تو یہ بھی ضروری نہیں کہ حقیقت میں بھی وہ تخلیق کار ماورائی دنیا کا ہی فرشتہ صفت انسان ہو......سوچیں خوبصورت اور مکمل ہو سکتی ہیں مگر انسان نہیں، انہوں نے دور آسمان پر اڑتے پرندوں کو دیکھتے کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائی۔ کلی ان کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکی ہٹا سکتی بھی نہیں تھی ان کے چہرے کے تاثرات میں واضح دکھتے درد نے کلی کی نگاہوں کو جیسے باندھ سا دیا تھا ماضی کا خوفناک عفریت پھر انہیں ڈس رہا تھا وہ بہت تکلیف میں تھے۔''

''تو پھر لکھاری ایسی دنیا تخلیق ہی کیوں کرتے ہیں سر......کہ بندہ خود بخود ایسی دنیا میں رہنے کے خواب دیکھنے لگے جہاں صرف محبت، سکون اور خوشحالی ہوتی ہے جہاں اعتماد ہوتا ہے محبت کی فضا ہوتی ہے جہاں کسی کی مضبوط پناہ گاہ کا احساس ہوتا ہے......یہ تو دھوکہ دینے والی بات ہوئی ناں راہ سے بھٹکانے والی......اس کی بات پر وہ دھیرے سے مسکرائے تھے انہیں کسی کی یاد آئی تھی۔

''تخلیق کار اس معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے لڑکی......'' اگر وہ اپنے اردگرد اپنی دنیا نہ بسائے تو زمانے کی سختی اور گرمی میں پگھل کر مر جائے اس کی ایک دن کی زندگی بھی اچھی نہ گزرے اسی لیے وہ اپنی دنیا بسا لیتا ہے جس میں وہ اپنی مرضی سے جیتا ہے جہاں زندگی اس کے تابع ہوتی ہے......اور میرے خیال میں ایک تخلیق کار کا اتنا تو حق بنتا ہی ہے''

''تو پھر میرے لیے بھی ایک ایسی دنیا تخلیق کیجیے ناں سر......جہاں سب کچھ میری ہی مرضی سے ہو......جہاں میرے ہونٹوں سے ہنسی جدا نہ ہو جہاں کبھی میری آنکھ میں آنسو نہ آئے جہاں میرے درد باٹنے والے ہوں '' کلی کی نیلی آنکھوں میں نمکی چمکی لہجہ بھر گیا زیدی صاحب چونک گئے وہ ان دو ماہ میں پہلی بار کھلی تھی مبہم سی غیر فہم سے انداز میں......مگر درد کی زبان نہیں ہوا کرتی اس کا محسوس ہونے کا انداز ہمیشہ ایک سا ہی ہوتا ہے اور وہ درد میں تھی دکھی وغمزدہ تھی وہ لمحوں میں جان گئے تھے مگر انہیں ظاہر نہیں کرنا تھا۔

''بتائیں ناں سر......بتائیں گے، میرے اردگرد بھی ایسی دنیا......جو صرف میری دنیا ہو جہاں صرف میرے پاس صرف خوشیاں

ہی خوشیاں ہوں......اس سمے اس کے چہرے پر اتنا کرب تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکے وہ جانتے تھے اس کی زندگی محرومیوں میں گزری ہے"

"ہاں میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے لیے ایسی دنیا بناؤں گا مگر اس سے پہلے میں تمہیں ایک اور کہانی سناؤں گا جسے میں نے کبھی کسی سے شیئر نہیں کیا مگر اس کی تلخی میری پوری زندگی پر محیط ہے میں کبھی اس کے حصار سے نکل نہیں سکا میں کبھی اس تکلیف کو ختم نہیں کر پایا"

"میں تمہیں اپنی زندگی کی کہانی سناؤں گا......" کلی نے ایک دم تحیر سے انہیں دیکھا جنہوں نے نجانے کیوں مگر ایک دم ہی یہ فیصلہ کیا تھا۔

☆☆☆

"مجھے تمہارے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے...... مجھے تمہاری ضرورت ہے میں تنہائی سے جنگ لڑتے اب تھک گیا ہوں یار......" کلی دروازے پر ہی ٹھٹک کے رک گئی اندر سے آتی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے وہ جتنی بھی کوشش کر لیتی مگر وہ حشمت زیدی کی اندر کی تنہائی وا کیلے پن کو ختم نہیں کر سکتی تھی وہ ایک کیئر ٹیکر ہی تھی جن سے وہ کبھی بھی اپنے اندر کے دکھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

"مجھے بھیجنے والے بھی تو آپ ہی تھے چچا جان......اب کانٹریکٹ ختم کر کے میرے لیے آنا ممکن نہیں ہے میں خود آپ کے لیے بہت اداس ہوں مگر بہت مجبور بھی پانچ سال مکمل کرنے سے پہلے میرے لیے واپس آنا بہت مشکل ہے۔ دوسری جانب آفاق بہت تڑپ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ حشمت زیدی کے نڈھال دل کو اس کا جواب سن کے ڈھارس ملی گویا اسے بھی ان کی اسی قدر پرواہ تھی وہ بھی ان کے لیے اداس تھا دنیا میں کوئی تو انکا اپنا تھا ناں"

"تم اپنا کام تسلی سے کرو......میں تو بس ویسے ہی جب تنہائی سے گھبراتا ہوں تو شکوہ کر بیٹھتا ہوں تم سے......میرے لیے تمہاری ترقی و کامیابی اہم ہے تمہارے لیے بھی یہی ہونی چاہیے"

"پھر بھی چچا جان...... مجھے آپ کی بہت فکر رہتی ہے جانے وہ کڑکی آپ کا صحیح طرح سے دھیان رکھ بھی رہی ہے یا نہیں" وہ ان کے لیے پریشان و متفکر تھا۔

"ارے اس کی تم فکر مت کرو......وہ تو پوری تھانیدارنی ہے......بہت ڈانٹتی ہے مجھے" کلی کے ذکر نے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکا دی تھی آفاق انہیں ہنستا مسکراتا دیکھ کر پرسکون ہو گیا۔

"بہت سختی کرتی ہے وہ مجھ پر اور ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی معصوم بچہ ہوں اس کے سامنے"

"آپ کی تنہائی کچھ تو کم ہوئی ناں چچا جان......یہ کتنی اچھی بات ہے"

"ہاں یہ بھی ہے......اس بچی کے ساتھ وقت نہ گزرنے کا احساس ذرا کم ہی ہوتا ہے مگر اپنوں کی کمی وہ بچی پوری نہیں کر سکتی نہ ہی میں وہ رشتے اس کی ذات میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ انہوں نے کلی کی طرفداری کی تھی" آفاق مسکرا دیا انہیں سب کی فکر رہتی تھی ماسوائے اپنے۔

''یہ تنہائی آپ نے اپنے لیے خود منتخب کی ہے چچا جان ......اگر اس وقت یہ فیصلہ نہ کرتے تو آج کس قدر آسودہ حال ہوتے......'' آفاق نے یہ سب سوچا ضرور مگر اپنے بیمار چچا سے کہا نہیں اب وہ مضبوط قوت ارادہ رکھنے والے انسان نہیں رہے تھے بلکہ اب وہ اپنی عمر سے زیادہ نڈھال اور کمزور ہو چکے تھے ان کا ناتواں دل اب سچائی بھری حقیقت کا سامنا کرنے کا اہل نہیں رہا تھا اب۔

''پھر تو اس بچی کو شاباشی دینا پڑے گی چچا جان......جو لڑکی آپ کا اتنا خیال بھی رکھتی ہے اور بدلے میں کچھ لیتی بھی نہیں ہے''

''اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ وہ بہت بے غرض لڑکی ہے سارا دن میرے ناولز کی ہیروئنز کے ڈائیلاگز بولتی رہتی ہے''

''یعنی وہ لڑکی آپ کی فین ہوئی ناں پھر تو'' آفاق ہنستے ہوئے جیسے نتیجے پر پہنچا تھا۔

''ہاں......وہ اس دنیا میں میری سب سے بڑی فین ہونے کا دعویٰ کرتی ہے'' وہ جیسے کلی کی ہی کہی گئی اس بات سے دوبارہ محظوظ ہوتے مسکرائے۔

''کیوں کیا یہ بھی آپ کو اپنے خون سے خط لکھتی رہی ہے'' آفاق نے انہیں ماضی کی خوشگوار یادوں کا حوالہ دیتے ہوئے چھیڑا۔

''نہیں......مگر یہ ان سب سے زیادہ میری قدر کرتی ہے'' حشمت زیدی کے لہجے میں یقین تھا باہر کھڑی کلی نے بے ساختہ اطمینان محسوس کیا تھا گویا وہ ان کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو چکے تھے وہ اسے پسند کرنے لگے ہیں اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی اس کے لیے بہر حال!

☆☆☆

سیارہ اردو ڈائجسٹ آداب عرض لاہور سے شائع ہونے والے وہ ڈائجسٹ تھے جنہوں نے پہلی بار ادب کے فروغ کے لیے کام شروع کیا تھا وہ دور نہ کمپیوٹر کا تھا نہ ہی انٹرنیٹ کا......لوگوں میں کتب بینی کا ذوق بام عروج تک پہنچا ہوا تھا ہر خاص و عام مطالعے کی اہمیت سے واقف اور اس کا قدر دان تھا ڈائجسٹ نے ایسے لوگوں کی مطالعے کے ذوق کی تسکین کی جو لوگ کتاب خرید کر نہیں پڑھ سکتے تھے ڈائجسٹ نے ان کے لیے ایک نئی دنیا قائم کر دی تھی بہت کم پیسوں میں انہیں بہترین ادب پڑھنے کو ملنے لگا تھا دیکھتے ہی دیکھتے ڈائجسٹ کو شہرت کے بام عروج تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک پایا۔ اس وقت کا سب سے مشہور ڈائجسٹ سب رنگ تھا جس میں وہ لکھا کرتے تھے ان کے رومان پرور سنسنی خیز ناولز قارئین کے دلوں میں جذبات کا الاؤ دہکا دیا کرتے تھے دنوں میں وہ ایسے مشہور ہوئے جتنی شہرت کسی کو سالوں کی ریاضت سے ملا کرتی ہے محبت پیار اور وفا کی جو دنیا انہوں نے قارئین کے دلوں میں بنائی تھی اس کا تاثر بہت گہرا اور دیرپا ثابت ہوا تھا۔ ہر ماہ انہیں اپنے چاہنے والوں کے سینکڑوں خطوط ملتے جن میں مردوں سے زیادہ خواتین کی تعداد شامل ہوتی تھی فخر و انبساط سے ان کا سر بلند ہو جاتا گردن میں پہلے سے زیادہ کلف لگ جاتی......ان کے سنسنی خیز رومان پرور کہانیاں خواتین کو ان کے عشق میں گرفتار کرنے میں کامیاب ٹھہری تھیں گو کہ وہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن جب ہر ماہ درجنوں خطوط میں سے آدھے خون سے لکھے ملتے تو

ان کا سیروں خون بڑھ جاتا تھا نوجوان لڑکیاں گھر والوں سے چھپ چھپ کے کالج جاتے ہوئے سب رنگ خرید کر انہیں ٹیکسٹ کی کتابوں میں چھپا کر پڑھا کرتیں......لڑکیاں بالیاں انہیں بغیر دیکھے ہی ان کے الفاظ کے سحر میں گرفتار ہو کر ان سے محبت کرنے لگی تھیں ایک دم سے وہ محبت کے معاملے میں امیر ترین انسان بن گئے تھے۔

''مگر محبتیں پانے والا انسان اتنا خوش نصیب نہیں ہوتا جتنا محبتوں کو سنبھال کر رکھنے والا انسان خوش نصیب ہوتا ہے......وہ ہر خط کا جواب بہت محبت و توجہ سے دیتے......ان جیسا نرم خو، خوش گفتار، باتہذیب مصنف جو ہر خط کو توجہ سے پڑھتا تھا اور ہر خط کا جواب انتہائی محبت سے دیتا تھا جس ماہ ان کی کہانی آتی اس ماہ اسٹال پر ڈائجسٹ شارٹ ہو جاتے کسی کو ملتے کسی کو نہیں جن کو نہیں ملتے وہ حشمت زیدی کی کہانیاں فوٹو اسٹیٹ کروا کروا کے پڑھتے پھر تبصرہ بھیجتے......ڈائجسٹ کے مالکان اور ایڈیٹر بخوبی جان گئے تھے کہ ان کے ڈائجسٹ کی کامیابی کی کنجی اب حشمت زیدی کے ہاتھ میں ہے تبھی انہوں نے ان کا ایک سلسلے وار ناول شروع کر دیا تھا سب رنگ کراچی سے نکلتا تھا مگر پورے ملک میں وہ سب سے زیادہ پڑھا جانیوالا ڈائجسٹ تھا اور ایسا حشمت زیدی کی وجہ سے ممکن ہوا تھا یہی وہ وقت تھا جب ادارے نے انہیں اپنے ساتھ کانٹریکٹ کے لیے آمادہ کرنا چاہا تھا مگر حشمت زیدی کو اپنی صلاحیتوں کو زنگ نہیں لگنے دینا تھا انہیں اپنا علم اور اپنی تخلیق کو کسی ایک جگہ باؤنڈ نہیں کرنا تھا اسی لیے انہوں نے کانٹریکٹ پر سائن کرنے سے انکار کر دیا تھا اور گزرتے وقت نے یہ ثابت کیا کہ ان کا یہ فیصلہ کس قدر درست تھا ایک اخبار میں ان کا ہفت روزہ کالم لگتا تھا اور اخبار والوں کی ڈیمانڈ تھی کہ ساتھ وہ اپنی فوٹو بھی دیں یہ پہلی بار تھا جب وہ اپنے چاہنے والوں کے سامنے منظر عام پر آئے تھے وہ بلا شبہ بلند قد و قامت کے ایک پرکشش انسان تھے ان کی آنکھیں ذہانت سے بھرپور چمکتی ہوئی تھیں ان کی ناک بالکل تیکھی اور سیدھی تھی گویا وہ اپنے ارادوں میں کس قدر اٹل ہیں اس بات کو واضح کرتی ہوئی......عنابی باریک ہونٹ گھنی مونچھیں کندن کی مانند چمکتی ہوئی گندمی رنگت......گویا ان کے تخلیق کردہ مرکزی کردار ہی خوبصورت نہیں ہوا کرتے تھے وہ خود بھی دیومالائی حسن رکھنے والے تھے اور یونانی دیوتا ہی دکھتے تھے''

ان کے منظر عام پر آنے کے بعد ان کے فینز کے خطوط میں شادی کے پیغامات آنے لگے تھے یہ ایک دلچسپ صورتحال تھی ان کے لیے......لیکن وہ مسکرا کر ٹال جایا کرتے......ایک بار تو دو لڑکیاں ان کے گھر تک بھی پہنچ گئی تھیں کئی ایک کی سفارش تو اخبار کے ایڈیٹر کو بھی کرنی پڑی تھی مگر وہ ان کے کیریئر بنانے کا وقت تھا بحیثیت تخلیق کار وہ اپنا آپ منوا چکے تھے مگر ابھی بہت سے ترقی کے ستارے جن پر کمند ڈالنی باقی تھا سو ان کا فی الحال ادی کے لیے کوئی ارادہ نہیں تھا پھر انہیں شادی اس سے کرنی تھی جس کو وہ پہلی نظر میں پسند کرتے......وہ محبت کے دنیا کے باسی تھے پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتے تھے سو ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ شادی جیسا اہم فیصلہ کسی کی محبت میں کر دیتے......انہیں شادی اس سے کرنی تھی جسے وہ پسند کرتے جس سے وہ پہلی نظر میں محبت کرتے لیکن انہیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑا تھا۔

☆☆☆

مال روڈ پر کیتھولک چرچ کے سامنے میزان ریسٹورنٹ بنا ہوا تھا جو دیال سنگھ مینشن کے مخالف سمت میں فخر سے کھڑا تھا یہاں پر بایوٹائپ کے تخلیق کار اور شاعر حضرات اکٹھے ہوا کرتے تھے......مل کر بیٹھتے چائے کا مزہ لیتے سگریٹ کے گہرے لمبے کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ادب کی خدمت اور اس کے فروغ کے لیے لمبی لمبی محفلیں جما کر بحث ومباحثے کیا کرتے تھے......اس کے سامنے تھوڑی دور پاک ٹی ہاؤس تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صرف غریب طبقہ کے مصنف اور شاعر حضرات کے لیے مخصوص تھا یا ان کے لیے جن کے لاشعور میں کوئی انقلاب لانے کی آرزو مچلتی رہتی تھی ساتھ ہی کچھ فاصلے پر پی سی تھا یہاں پر سب سے امیر طبقے کے شاعر حضرات اور ادیب حضرات کا آنا جانا رہتا تھا یہ وہ لوگ تھے جو شوقیہ شاعری یا ادب کے شعبے سے منسلک تھے کچھ شہرت کے لیے کچھ محض شوقیہ وقت گزاری کے لیے......یہاں سب کا ذکر نہیں ہو رہا چند ایک کو چھوڑ جو واقعتاً ادب کی خدمت کر رہے تھے اور پیش پیش تھے۔ یہ تینوں عمارتیں طبقاتی فرق کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے کچھ فاصلے پر ایستادہ تھیں حشمت زیدی تینوں طبقات میں فٹ آتے تھے معاشی لحاظ سے وہ دوسرے نمبر پر آتے تھے مگر ان کے اندر ادب کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ اکثر ہی انہیں پاک ٹی ہاؤس کی طرف رخ کرنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا کبھی پینے پلانے کے شوق میں یا امراء کی دی گئی دعوت میں وہ بصد شوق وہاں جایا کرتے یوں معلوم ہوتا جیسے ان کی شایان شان جگہ پی سی کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

الحمراء آرٹ کونسل میں ہونے والے مشاعروں میں وہ دل کھول کر داد دیا کرتے انہیں مشاعرے میں بھی کچھ نہ کچھ پڑھ کے سنانے کو کہا جاتا......کبھی وہ اپنا کالم پڑھ کے سناتے کبھی کوئی افسانہ یا کبھی کسی مشہور ناول کا فرمائشی اقتباس......وہ کہہ کر پی سی کا جاتے مگر ملتے پاک ٹی ہاؤس......میں اکثر ان کے دوست انہیں پاک ٹی ہاؤس میں ڈھونڈنے کے لیے جاتے مگر وہ پی سی یا شیزان سے ملا کرتے......وہ ان گنے چنے ادیبوں میں سے تھے جو ان تینوں ریسٹورنٹس میں ہر دلعزیز تھے انہیں ہر جگہ خوشدلی سے خوش آمدید کہا جاتا کچھ وہ خود بھی اس قدر ہر دلعزیز اور مٹ ہوئی طبیعت کے تھے کہ ہر جگہ با آسانی ایڈجسٹ ہو جایا کرتے اور دلوں میں گھر بنانے کا فن تو انہیں بخوبی آتا تھا۔

پاک ٹی ہاؤس مال روڈ پر واقع ہے جو کہ انارکلی بازار اور نیلا گنبد کے قریب ہے لاہور کے گم گشتہ چائے خانوں میں سب سے مشہور چائے خانہ پاک ٹی ہاؤس تھا جو ایک ادبی، تہذیبی اور ثقافتی علامت تھا۔ پاک ٹی ہاؤس شاعروں، ادیبوں اور نقاد کا مستقل اڈہ تھا جو ثقافتی اور ادبی لحاظ سے محافل کا انعقاد کرتے تھے پاک ٹی ہاؤس ادیبوں اور شاعروں کا دوسرا گھر تھا اور دیگر کی طرح حشمت زیدی کو بھی اس سے جدائی گوارا نہیں تھی وہ ٹی ہاؤس کے عروج کا زمانہ تھا ان دنوں لاہور میں دو بڑی ادبی تنظیمیں حلقہ ارباب ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنفین ہوتی تھیں حشمت زیدی انجمن ترقی پسند مصنفین کے سینئر لیڈر رہا کرتے تھے۔ صبح سے لیکر رات تک ادبی محافل جمی رہتی تھیں اور یہاں پر ملک بھر سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان شخصیات سے ملنے کے لیے آیا کرتی تھیں اور اتوار کے دن تو اس قدر رش ہوتا کہ تل

دھرنے کو بھی جگہ نہیں ملا کرتی تھی مگر دلوں میں بہت وسیع جگہ تھی جو کوئی آتا اگر اسے بیٹھنے کے لیے کرسی نہ بھی ملتی تو وہ کسی دوست کے ساتھ کرسی شیئر کر لیتا تھا یہاں شعر اور ادب بہت بحثیں ہوتی تھیں پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے ادیبوں اور شاعروں میں سوائے چند ایک کے باقی کسی کا بھی مستقل ذریعہ معاش نہیں تھا کسی ادبی رسالے میں کوئی غزل، نظم یا کوئی افسانہ لکھ دیا تو پندرہ، بیس روپے مل جاتے تھے لیکن کبھی بھی کسی کے لب پر تنگی معاشی کا شکوہ کبھی نہیں آیا......حشمت زیدی خوش نصیب تھے ان کے پاس ماں اپ کے بنائے ترکے میں دو دکانیں تھیں جن کا کرایہ اچھا خاصہ تھا، اعزازیے کی رقم وہ پاک ٹی وی ہاؤس میں اپنے دوستوں کو سپیریٹ چائے اور کیک سگریٹ پلانے میں صرف کر دیا کرتے......جس روز ان کے ہاتھ میں اعزازیے کی رقم آتی اس دن ان کے احباب کی فرمائشی پروگرام شروع ہو جاتے......کسی کو قہوہ پینا ہوتا کسی کو چائے کے ساتھ فروٹ کیک کی طلب ہوتی اور کیسٹ سگریٹ تو پھر سبھی کو مرغوب تھی سبھی کو چاہیے ہوتی تھی وہ دل اور ہاتھ کے بے حد کھلے انسان تھے تبھی تو ان کے ہاتھ میں پیسہ ٹک نہیں پاتا تھا......احباب میں واہ واہ ہو جایا کرتی اور ان کی گردن مزید تن جاتی ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا کہ کسی دوست کی جیب خالی ہے تو وہ ٹی ہاؤس کی چائے اور سگریٹوں سے محروم رہے جن کے پاس پیسے ہوتے تھے وہ نکال کر میز پر رکھ دیتے تھے جس کی جیب خالی ہوتی علیم الدین (مالک) صاحب اس کے ساتھ بڑی فراخدلی سے پیش آتے تھے اور یاروں کے یار حشمت زیدہ صاحب تو پھر تھے ہی......!

سن 1940ء میں ایک سکھ بوٹا سنگھ نے انڈیا ٹی ہاؤس کے نام سے چائے خانہ شروع کیا۔ بوٹا سنگھ نے 1940ء سے 1944ء تک اس چائے خانے و ہوٹل کو چلایا مگر اس کا کام کچھ اچھے طریقے سے چل نہیں سکا بوٹا سنگھ کے چائے خانے پر دو سکھ بھائی سرتیج سنگھ بھلا اور کیسر سنگھ بھلا جو گورنمنٹ کالج کے اسٹوڈنٹ تھے اپنے دوستوں کے ساتھ اکثر چائے پینے کیلئے آیا کرتے تھے۔ 1940ء میں یہ دونوں بھائی گورنمنٹ کالج سے گریجوایشن کر چکے تھے اور کسی کاروبار کے متعلق سوچ رہے تھے کہ ایک روز چائے خانے پر بیٹھے اس کے مالک بوٹا سنگھ سے بات چل نکلی اور بوٹا سنگھ نے یہ چائے خانہ ان کے حوالے کر دیا قیام پاکستان کے بعد حافظ رحیم بخش جالندھر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تو انہیں پاک ٹی ہاؤس میں قیام کا موقع ملا۔ اس کے شٹر پر قیام پاکستان کے بعد انڈیا کاٹ کر پاک لکھ دیا گیا تھا۔ رحیم بخش کو اس میں ایک روپے ماہوار کرائے پر ایک کمرہ رہنے کو ملا تھا ان کا دبلا پتلا بدن، دراز قد آنکھوں میں ذہانت کی چمک سادہ لباس کم سخن حافظ رحیم بخش کی شخصیت کو دیکھ کر دلی و لکھنو کے قدیم وضعدار بزرگوں کی یاد تازہ ہو جاتی سرتیج سنگھ بھلا اور کیسر سنگھ بھلا کے بعد حافظ رحیم بخش کے دونوں بیٹوں علیم الدین اور سراج الدین نے بعد میں پاک ٹی ہاؤس کی گدی سنبھالی تھی۔

پاک ٹی ہاؤس کا ماحول بہت دلکش تھا نائیلون والا چمکیلا فرش جو کہ کڑی محنت و نگرانی کے باعث ہمہ وقت چمکتا دمکتا رہتا تھا وسیع و عریض ہال میں پتھر کی چوکور سفید میزیں بنی تھیں۔ دیواروں پر لگی قائداعظم کی تصاویر......ایک طرف گیلری کو سیڑھیاں جاتی تھیں اور بازار کے رخ پر لمبی کھڑکیاں نصب تھیں جنہیں گرمی کے دنوں میں شام کو کھول دیا جاتا تھا۔ باہر لگے درختوں کی ٹھنڈی مسرت آمیز اور فرحت بخش

ہوا اندر بیٹھے لوگوں کو مسحور کر دیا کرتی دوپہر کو جب دھوپ ان کھڑکیوں کے اوپر پڑتی تو گلابی روشنی سفید پتھر کی چوکور میزوں پر چھن چھن کر پڑتی۔ پاک ٹی ہاؤس کے اندر کونے والے کاؤنٹر پر علیم الدین صاحب کا مسکراتا ہوا سانولا چہرہ ابھرتا......ان کے پیچھے دھیمے سروں میں ریڈیو ہمہ وقت بج رہا ہوتا اور وہ کلاسک غزلوں پر ہنستے بڑے مگن انداز میں بل کاٹتے ان کی دھیمی اور شگفتہ مسکراہٹ ان کے سانولے چہرے کو عجیب طرح کی جلا بخشتی تھی ان کے چمکیلے ہموار دانت موتیوں کی طرح سے چمکتے ان کی شخصیت میں سحر بھر دیا کرتی ...... پاک ٹی ہاؤس کی فضا میں سگریٹ اور سگار کا دھواں چکراتا پھرتا......سنہری چائے، قہوہ اور فروٹ کیک کی خوشبو اندر داخل ہونے والوں کو لبھانے لگتی صبح آٹھ بجے پاک ٹی ہاؤس میں کم کم لوگ آتے تھے حشمت زیدی سگریٹ کو انگلیوں میں دبائے سگریٹ والا ہاتھ منہ کے ذرا قریب رکھے ٹی ہاؤس میں داخل ہوتے تھے یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا اور مشہور و معروف انداز تھا کہ نوجوانوں نے ان کے اس انداز کو ان کی نقل کرتے اپنایا تھا چونکہ صبح کے وقت ہجوم ذرا کم ہوتا اسی لیے کم دودھ والی تیز پتی کی چائے کا کپ ہاتھ میں تھام کر وہ اپنا تخلیقی کام کرنے میں مگن ہو جایا کرتے۔ پاک ٹی ہاؤس میں جب داخل ہوتے تو دائیں جانب شیشے کی دیوار کے ساتھ ایک صوفہ لگا ہوا تھا سامنے ایک لمبی میز تھی میز کی تینوں جانب کرسیاں تھیں شام کیوقت ناصر کاظمی، انتظار حسین، باقر رضوی، احمد مشتاق، مبارک احمد جیسی بڑی ادبی شخصیات کی محفل اسی جگہ جما کرتی تھی مگر صبح کے وقت زیدی صاحب اپنا کاغذ قلم سنبھالے وہاں بیٹھے دکھائی دیا کرتے تھے اپنا تخلیقی کام وہ وہیں بیٹھ کر انجام دیا کرتے تھے......ایسے میں وقفے وقفے سے انہیں چائے کی طلب ہوا کرتی وہ کاغذوں کے پلندے سے سر اٹھاتے اور ذرا کی ذرا علیم الدین کی جانب نگاہ بلند کرتے وہ تو جیسے ان کی نگاہ کے منتظر ہوا کرتے فوراً سے پیشتر ان کے لیے چائے لے آتے ٹی ہاؤس میں اسپریٹ چائے پیش کی جاتی تھی لیکن علیم الدین کو اپنے پرانے اور مستقل گاہکوں کی پسند ناپسند گویا ازبر تھی وہ فوری طور پر ان کے لیے تیز قہوے والا مگ تیار کر کے لے آیا کرتے ......زیدی صاحب ایک خوش شکل طویل قامت اور مضبوط ڈیل ڈول رکھنے والے انسان تھے ٹراؤزر پینٹ کے ساتھ بڑے کالر والی شرٹ آنکھوں پر رنگین بڑے فریم کا چشمہ لگائے وہ اس زمانے کے ہیرو لگتے تھے...... جب سے ان کی تصویر شائع ہوئی تھی اتوار کے روز اس ناول نگاری کے اسرار و رموز سمجھانے کے حوالے سے جو محفل وہ سجایا کرتے اس میں اضافہ ہو گیا...... آٹو گراف لینے والی لڑکیوں کا جمگھٹا انہیں اس روز گھیرے رکھتا پاک ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر پر رکھا ایس ٹی ڈی فون جو کبھی کبھار بجتا تھا اب کثرت سے بجنے لگا تھا مگر زیدی صاحب اس سب سے بے نیاز اپنے کام میں مگن رہتے یہاں تک کہ علیم الدین کو گلا کھنکھار کے کہنا پڑتا۔

''حضور......آپ کے لیے فون ہے انبالے سے''

''کہہ دو کہ میں باہر ہوں، وہ مسودے سے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر کہہ دیتے علم الدین کا سانولا چہرہ شرارت کی سرخی سے دہکنے لگتا''۔

''کہہ چکے ہیں حضور......مگر محترمہ بضد ہیں کہ آپ ادھر ہی تشریف فرما ہیں......وہ ریسیور پر ہاتھ رکھے سرگوشیانہ انداز میں بے چارگی سے جواب دیا کرتے لامحالہ انہیں اٹھ کے ٹیلی فون سیٹ کے قریب آنا پڑتا دوسری جانب منتظر محترمہ کی بے ربط پرجوش آواز و انداز

میں کی جانے والی مدح سرائی سننے کے بعد وہ اکثر علیم الدین کو تنبیہ کرنا نہ بھولتے"

"حرکتوں سے باز آ جایئے محترم...... ہماری مخبری مت کیا کیجیے" وہ شگفتہ سے انداز میں کہتے انہیں جیسے متنبہ کرنے کی کوشش کرتے جواباً وہ کان پکڑ لیتے۔

"ہماری ایسی کیا مجال حضور...... آپ کے چاہنے والے ہمیں جواباً ڈانٹ ہی ایسی پلاتے ہیں کہ آپ کو بلانے کے سوا ہمارے پاس چارہ ہی کوئی نہیں بچتا...... وہ سانولے چہرے کو اور لٹکا کے گویا ایسی بے بسی کا اظہار کرتے زیدی صاحب بس ہنکارا بھر کر خاموش ہو جاتے پنسل لبوں میں داب لیتے"

"سگریٹ پئیں گے حضور......" وہ سگریٹ کی ڈبیا ان کے پاس لے آتے۔

"نہیں سگریٹ رہنے دیجیے سگار کی طلب محسوس ہو رہی ہے ہمیں" وہ فوراً سگار سلگا لاتے زیدی صاحب ایک لمبا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑ دیتے...... علم الدین پاس ہی ٹک جایا کرتے چہرے پر سنجیدگی کی گہری چھاپ پڑی ہوتی مگر آنکھوں میں شرارت رقصاں رہتی تھی۔

"آپ نے جھوٹ کیوں بولا کہ فون انبالے سے تھا علیم الدین صاحب! زیدی صاحب ایک نظر علیم الدین کے بظاہر سنجیدگی کے مظہر چہرے کو دیکھ کر سگار کی راکھ جھاڑتے تو استفسار کرتے"

"آپ لکھنے میں حد درجہ مصروف تھے اور فون والی محترمہ ہمیں ڈانٹے جا رہی تھیں تنگ آ کر ہمیں یہ جھوٹ بولنا پڑا آپ سے......" ان کے چہرے پر شرمندگی نہیں ہوتی بے چارگی ہوا کرتی۔

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمیں آپ کے جھوٹ کی خبر ہو جائے گی پھر بھی...... آپ نے جھوٹ بولا...... علیم الدین صاحب ابھی ہم اتنے معروف نہیں ہوئے کہ بھارت سے فون آنے لگیں" وہ اس کی کہی بات دہراتے تنبیہ کرتے۔

"انشاء اللہ وہ دن دور نہیں حضور جب بھارت کیا پوری دنیا سے آپ کے لیے فون آیا کریں گے" ان کے لہجے میں یقین ہوتا زیدی صاحب خاموش ہو جایا کرتے کبھی کبھی مسکرا بھی دیا کرتے۔

"حضور...... ایک بات کہیں اگر برا نہ مانیں تو......"

"کہیے محترم ایک آپ ہی تو ہیں جو ہماری ذاتی زندگی میں دلچسپی رکھتے ہیں ہمارے لیے پریشان ہوتے ہیں...... ورنہ کون ہے جو ہمارے لیے اس قدر سوچے" ان کے لہجے میں حسرتوں کی چنگاریاں سلگنے لگ گئیں۔

"اسی لیے تو کہتے ہیں حضور کی شادی کر لیجیے...... آپ کی تنہائی بٹے گی تو پریشان کن سوچیں آپ کو مضطرب نہیں ہونے دیں گی" وہ ہمیشہ کا کہا مشورہ دہراتے۔

''سوچیں گے فی الحال تو فرصت نہیں اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا'' وہ ہولے سے گنگناتے۔

''آپ کو فرصت ہی فرصت ہے حضور...... آپ کے لیے راوی چین کی بنسی بجاتا ہے آپ کو فکر معاش کا غم نہیں ستاتا اوروں کی طرح''

''یہاں مسئلہ فکر معاش کا نہیں راوی ہونے کا ہے علیم الدین صاحب......وہ ہمیشہ ہی ہر ایک کو بہت عزت و احترام کے ساتھ مخاطب کیا کرتے تھے۔ راوی ہونے کے ناطے ہمیں فرصت ہی نہیں اپنے لیے سوچنے کی نفسانفسی کے اس دور میں جہاں اقدار کا خون نہایت سفاکی اور بے دردی سے ہو رہا ہے ہمیں چین کہاں سے ملے گا۔ انہوں نے مضطرب سے انداز میں کہہ کے سگار کی راکھ جھاڑی ان کے چہرے پر اس راکھ جیسی جلتی بجھتی کیفیت تھی جوان کے اندر کے غم کو عیاں کر رہی تھی اور جسے انہوں نے چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی علیم الدین بس ان کی شکل دیکھ کر رہ گئے اس سے آگے وہ کبھی پوچھ ہی نہیں پاتے اپنی شخصیت کے سارے روز یہاں پر آ کر وہ ہمیشہ کی طرح فضل آلود کر لیا کرتے تھے......انداز یکسر اجنبیت میں بدل جایا کرتا تھا...... بلکہ وہ اجنبی ہی بن جاتے جسے کبھی کوئی جان نہیں پایا تھا''

☆☆☆

Till death do us part......وائلن کی پرسوز دھن پر اس نے اپنے قدموں کو ہمیشہ کی طرح منجمد ہوتا محسوس کیا تھا وہ اکثر و بیشتر اس جگہ آ کر ٹھہر جایا کرتی تھی وائلن کی پرسوز دھن اور پھر ایسی باکمال شاعری وہ کبھی نہیں فیصلہ کر پاتی کہ اسے روکنے اور ٹھہرنے پر کیا چیز مجبور کرتی ہے......وہ چند قدموں کا درمیانی فاصلہ عبور کرتے اس تک پہنچ آئی جو ہجوم میں گھرا ہوا تھا مگر آنکھوں موندے ان کی موجودگی سے بے نیاز وہ وائلن کے بکھرتے سروں میں اپنی دنیا میں تم تھا اس نے اس کی آنکھیں کبھی کھلی نہیں دیکھیں مگر پھر بھی اس کا ان آنکھوں کے بارے میں یہ قوی خیال تھا کہ اس کی آنکھیں بہت سحر انگیز ہیں اس کے لرزیدہ پپوٹے وائلن کے سروں کے ساتھ ہولے ہولے تھرکتے تھے وہ ان پلکوں کی لرزیدہ جنبش پہ نگاہ پڑتے تھم جاتی......وہ ان کے کالج کا سب سے حسین اور ہونہار سٹوڈنٹ نہیں تھا وہ کسی بگڑی ہوئی برگر فیملی کا خرد بھی معلوم نہیں ہوتا تھا نہ ہی اس کی سوچ اور افعال اسے انقلابی ذہنیت رکھنے والا جوشیلا نوجوان ظاہر کرتے تھے مگر اس کے وائلن کے بکھرتے سر اس کے اندر کے اضطراب کو عیاں کر دیا کرتے تھے۔ وہ کیمپس میں نیا آیا تھا مگر اس سے سینئر تھا......وہ سفید یونیفارم میں کاندھے پر لمبی امبیر لیس والا بیگ ڈالے بالوں کی اونچی پونی بنائے اس کے سامنے ساکت کھڑی تھی روز ہی کھڑی ہوتی اس کا دل چاہتا وہ یونہی ساری زندگی وائلن بجاتا رہے اور وہ دم سادھے کھڑی سنتی رہے۔

اس قدر خوبصورت نظم وائٹ لائن بینڈ نے بھی نہیں گائی ہو گی جتنی دل آویز وہ اس کے وائلن پر محسوس ہو رہی تھی جس دن اس نے پہلی بار اس نظم کو سنا تھا اسی دن سے وہ اس نظم میں قید ہو کے رہ گئی تھی اس نے گھر آ کے ابا میاں کی اسٹڈی کھنگال کے تمام مغربی شاعروں کے شاعری کی مجموعے کھنگالے تھے ابا میاں کو ادب سے عشق تھا مغربی و مشرقی کلاسک ادب کی ان کے پاس ایک بڑی کلیکشن موجود تھی۔ اس نے وائٹ لائن بینڈ کی اس نظم جو گانے کی صورت گائی گئی تھی کو اس روز ڈھونڈ کے کوئی سو مرتبہ پڑھا تھا......وہ اس گانے کو

پہلے بھی کتنی ہی مرتبہ سن چکی تھی مگر آج سے پہلے وہ اس کے لیے صرف ایک رومینٹک سانگ تھا مگر اس روز اس نے اس میں زندگی کو سانس لیتا محسوس کیا تھا......اس نے اس گانا کا حرف حرف یاد کیا تھا ہر بار وہ اپنے وائلن پر اس طویل گانے کا ایک حصہ بجایا کرتا تھا بعدازاں وہ اس قدر پختہ ہوگئی کہ وائلن کے ردھم اور ساز سے پہچان جایا کرتی کہ آج وہ گانے کا کون سا اور کتنا حصہ بجا رہا ہے بلاشبہ وہ اس کے ان چاہنے والوں میں سے تھے جو روزانہ صرف اس کا وائلن سننے کے لیے اپنا پوائنٹ مس کر دیا کرتے تھے ہر گزرتا دن اس کے اردگرد ہجوم میں اضافہ کرتا گیا مگر وہ شاید اس سب سے بے نیاز تھا تبھی تو دھن مکمل ہوتے ہی اپنا بیگ کاندھے پر ڈالتا وائلن کو ایک بیگ میں بند کرتا اور بغیر کسی کا نوٹس لیے آگے بڑھ جاتا......ہجوم میں اس کے بارے میں چہ مگوئیاں ہونے لگتیں مگر اس کے جانے کے بعد وہ بھی وہاں رکتی نہیں تھی نہ ہجوم کا حصہ بنتی نہ ہی گفتگو میں شامل ہوتی اس کے اردگرد خاموشی اور ویرانی ڈیرہ ڈال لیتی......وہ اس کے قدموں کے نشان پر اپنے قدم رکھتے واپس پلٹ جاتی......اور اپنی اس حرکت سے وہ خود بھی بے خبر تھی۔

☆☆☆

بازار کے رخ پر لگی شیشے دار لمبی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں گرمیوں کی ایک سرمئی شام تھی وہ اپنا کاغذ قلم تھامے کھڑکی کے قریب رکھے صوفے پر آکے بیٹھ گئے تھے۔انہوں نے لان کا سفید رنگ کا کرتا شلوار پہن رکھا تھا گھنے بالوں کو پیچھے کی طرف کر کے کشادہ پیشانی واضح کر رکھی تھی ان کی گندمی رنگت گرمیوں میں کچھ اور نکھر جایا کرتی......سفیدی مائل گندمی رنگت پہ پسینہ ہیرے کی کنیوں کی مانند چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔بلاشبہ وہ ایک وجیہہ شخصیت کے حامل تھے اور اپنی اس خوبی سے بے نیاز وہ بس ادب تخلیق کرنے میں مگن تھے۔

''چائے پئیں گے حضور......''علیم الدین نے انہیں بازار کی جانب نگاہ مرتکز کیے دیکھا تو پوچھے بنا رہ نہیں پائے......وہ کافی دیر سے لکھنا چھوڑے بازار میں چلتے پھرتے لوگوں کی طرف متوجہ تھے یوں جیسے وہ کسی گہرے خیال میں ہوں۔

''حضور''علیم الدین ان کے پاس آکر ہولے سے کھنکھارے تو وہ متوجہ ہوئے۔

''چائے''انہوں نے یک لفظی سوال کیا مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

''نہیں محترم......پہلے ہی اندر آگ کا الاؤ دہک رہا ہے مزید تباہی کا سامان کیوں کر کیا جائے......انہوں نے نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف لحظہ بھر کو دیکھا ان کی آنکھیں لال ڈوروں سے دہک رہی تھیں۔وہ ان کی کیفیت پر لمحہ بھر کو چپ رہ گئے......نجانے ان کے اندر کیسا غم پل رہا تھا جو وہ اس قدر مضطرب و پریشان ہو جایا کرتے تھے وہ ہمیشہ کی طرح پوچھ پائے نہ ہی وہ خود بتا پائے ابھی ابھی انہوں نے بازار میں ایک عورت اور اس کے بچے کو دیکھا تھا وہ بچہ چلتے چلتے گر گیا تھا اس کی ماں نے اسے لپک کر اٹھایا تھا وہ روتے ہوئے بچے کو بے تابی سے چوم رہی تھی اگر بھیڑ میں اس بچے کا ہاتھ اپنی ماں کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور وہ اس سے بچھڑ جاتا تو......اس ''تو'' اور ''اگر'' کا خوف ماں کی ممتا زبھرے چہرے سے ہویدا تھا بچہ ماں کی آغوش میں سہم کر دبکا ہوا تھا انہیں اس ماں کی آغوش میں دبکے ہوئے بچے میں اپنا

آپ نظر آیا، کالی سیاہ گھنگور راتیں ان کے ذہن کے پردے پر روشن ہو گئیں جو وہ برسات کے موسم میں ڈرے سہمے اکیلے گزارا کرتے تھے اور اس وقت تک ان کی والدہ کام سے واپس نہیں لوٹا کرتی تھیں وہ جب وہ ماہ کے تھے تبھی ان کی بدقسمتی کہ ان کے والد کی حادثاتی موت ہو گئی تھی وہ مزدور پیشہ آدمی تھے بلڈنگز میں ساتھی راج گیر کے طور پر کام کیا کرتے تھے ایک روز تیسری منزل تک گارے اور اینٹیں پہنچاتے وقت سیڑھیوں سے ان کا پاؤں پھسل گیا تھا اینٹوں کا بھرا تسلہ ان کے سر پر گرا تھا وہ تیسری منزل سے گرے تھے اس زمانے میں لیول پول وغیرہ کی سہولیات میسر نہیں ہوا کرتی تھیں وہ بڑی شدت سے تیسری منزل سے گرے تھے اور ان کے سر پر شدید اور گہری چھوٹ آئی تھی بے تحاشہ خون بہنے اور بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے ان کی فوری موت واقع ہو گئی تھی گھر میں جمع جتھا تو کچھ تھا نہیں......مگر پاپی پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے ان کی والدہ کو گھر سے باہر نکلنا پڑا تھا ان کے علاوہ ان کا ایک بھائی اور تھا جو ان سے بڑا تھا تاہم اتنا بڑا نہیں کہ ماں کو گھر بٹھا کے خود کما کر باپ کی کمی پوری کرنے کو ان کا شجر سایہ دار بن پاتا......انہیں بچپن میں وہ توجہ و محبت نہیں مل سکی جو ایک بچے کو ماں سے چاہیے ہوتی ہے باپ تقدیر نے چھین لیا اور ماں کو ظالم دنیا کی سفاکی نے......وہ سارا دن اپنے بڑے بھائی کے پاس رہا کرتے ان کی والدہ دن بھر مختلف قسم کے کئی کام کیا کرتی تھیں مگر پھر بھی ذریعہ معاش کا آمدنی اٹھنی خرچہ روپیہ والا حساب ہی رہ جایا کرتا ماں کی عدم دلچسپی و توجہ اور تنگدستی نے انہیں حد درجہ خود سر اور ضدی بنا دیا تھا کچھ فطرتاً وہ ہٹیلے مزاج کے تھے مزاج جلدی برہم ہو جایا کرتا اور اس برہمی نے گزرتے وقت کے ساتھ حساسیت بخشی تھی اور ایک اور چیز بھی تھی جو ان کے اندر کوٹ کوٹ کے بھری تھی اور ان کی شخصیت کا تضاد دیکھنے والوں کو محسوس تو نہیں ہوتا تھا مگر......اسی چیز نے انہیں تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا"

☆☆☆

خالق زیدی نے اس مرتبہ رمضان کے سارے روزے رکھے تھے......وہ فطرتاً بہت نیک اور صابر بچہ تھا بہت چھوٹی سی عمر میں اس نے ماں کی مجبوریاں سمجھتے ہوئے ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا اسی لیے ماں کو بھی اس کا بہت خیال رہتا تھا اور پھر اس قدر گرمی اور تنگدستی میں اس نے اکثر ہی خالی پیٹ روزے کی نیت باندھ کے بھی سارا دن روزہ نبھایا تھا خالدہ بیگم کو اپنے بیٹے پر جتنا بھی فخر ہوتا کم تھا ......بجلی ابھی ان کے علاقے میں نہیں آئی تھی اور گرمی کے روز نہایت صبر آزما تھے وہ اکثر ہی شام کو اس کے لیے کچھ نہ کچھ ٹھنڈا لے آیا کرتی تھیں وہ ایک دکان پر سیل گرل کے طور پر کام کرتی تھیں روزانہ پیدل چل چل کے گھر گھر جا کے سرف اور دوسری گھریلو اشیا بیچنے کے بعد وہ بس اتنا ہی کر سکتیں کہ مغرب سے پہلے گھر لوٹتے وقت وہ ایک گلاس ربڑی دودھ یا کوئی تربوز ہی خرید لاتیں......اور وہ اکثر ہی ایسا کرتی بھی تھیں مگر پہلے ہی دن خالق کے لیے ربڑی دودھ کا گلاس لاتے انہیں اندازہ نہیں تھا کہ انہیں اس جرم کا جوابدہ اپنے دس سالہ چھوٹے بیٹے کے سامنے ہونا پڑے گا۔

"تو میرے لیے دودھ کیوں نہیں لائی ماں......کیا میں تیری اولاد نہیں ہوں کیا، کرخت و غصیلے لہجے میں چیختا وہ اپنے اس سوال

سے ماں کو ساکت کر گیا تھا...... وہ ان سے کس انداز میں بات کر رہا تھا۔"

"یا خالق تیرا زیادہ لاڈلا اور سگا ہے مجھے کیا کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا لائی تھی، وہ بہت چھوٹی سے عمر میں بہت بڑے سوال پوچھ رہا تھا اور وہ خود سادہ لوح خاتون تھیں انہیں اندازہ نہیں تھا ان کا بیٹا کس قدر حساس اور جینئس ہے۔"

"تو میرے سے زیادہ خالق سے پیار کرتی ہے تبھی تو اس کے لیے اکثر چھپا چھپا کے چیزیں لاتی ہے...... میں تیرا کچھ نہیں لگتا، اتنا کہہ کے وہ زور زور سے رونے لگا تھا سادہ لوح ماں حیرت میں گھری رہی جواب نہیں دے پائی ورنہ پوچھتی تو سہی کہ کونسی چیزیں وہ کب لاتی رہی ہے ایسا امتیازی سلوک کرنے کی وہ کب گنہگار ٹھہری تھی ان کو تو فکر غم معاش نے اتنا چین لینے ہی نہ دیا تھا کہ وہ جان پاتیں کہ ان کا بیٹا ان سے کس قدر متنفر ہو چکا ہے۔"

"حاشو...... مت رو حاشو...... خالق فوراً سے بیشتر اٹھ کے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔"

"تم یہ دودھ پی لو حاشو...... میں نہیں پی رہا" اس نے پیتل کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا مگر اس نے دودھ کے گلاس کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

"میں تمہارا حق نہیں لوں گا بھیا...... اگر اماں کو مجھ سے پیار ہوتا تو وہ میرے لیے علیحدہ سے لے کر آتیں...... اسی اثناء میں مغرب کی اذانیں ہونے لگی تھیں خالق نے بسم اللہ پڑھ کے نمک کی چٹکی اور پانی کے ساتھ روزہ افطار کیا تھا اس نے دودھ اپنے بھائی کیلئے رکھ دیا تھا مگر اس نے بھی اس دودھ کو نہیں پیا تھا۔"

"حاشو...... میری جان" خالدہ بیگم بہت دیر ساکت رہنے کے بعد اس کے پاس آئی تھیں انہوں نے محبت سے اس کے بال سہلانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ان کے ہاتھ جھٹک دیے تھے یہ اس کی ناراضگی کا اظہار تھا اور خالدہ بیگم جانتی تھیں وہ اگر ایک بار ناراض ہو جاتا تو بڑی مشکل سے مانتا تھا وہ بہت ضدی تھا۔

"حاشو بیٹا" انہوں نے پھر پکارا تھا مگر اب کی بار اس نے ماں کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"میں تیرا بیٹا نہیں ہوں...... خالق تیرا بیٹا ہے، وہ روٹھے پن سے بول رہا تھا رو رو کے اس کی آنکھیں متورم ہو گئی تھیں" ابا زندہ تھا تب بھی اسی کے لاڈ اٹھائے جاتے تھے وہ مر گیا تو بھی اسی کے لاڈ اٹھا رہی ہے تو...... مجھے بتا مجھے کیوں پیدا کیا پھر...... وہ کیسے کیسے حساب مانگ رہا تھا ان سے...... وہ اپنے اس بھائی سے تقابل کر رہا تھا جس نے چھوٹی سی عمر میں اسے ماں بن کے پالا تھا اپنے حصے کی چیز ہمیشہ اسے کھانے کو دی تھی اور آج ہی ماں اس کے لیے الگ سے افطاری کا سامان لائی اور اس سے برداشت نہیں ہو پایا، وہ کتنا تنگ دل اور تنگ نظر تھا۔

اس ساری رات وہ جاگتا رہا ماں کافی دیر اسے چمکارتی رہی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ماں کے سامنے آنکھیں موند کے سوتا بن

گیا مگر لاشعوری طور پر ساری رات جاگا اور کڑھتا رہا...... احساس کمتری اسے کوڑے مارتی رہی......اس کی ماں اس سے نہیں اس کے بھائی سے پیار کرتی ہے وہ اس کے لیے نہیں اس کے بڑے بھائی کے لیے چیزیں لاتی ہے اور بڑا بھائی محبت سے نہیں رحم سے اپنے حصے کی چیز اسے دے دیتا ہے......اس کا باپ مر گیا اس کی بدقسمتی...... ورنہ وہ بھی لاڈلا ہوتا اپنے باپ کا......وہ بھی اپنے باپ سے فرمائش کیا کرتا جیسے قالو (محلے کا دوست) اپنے باپ سے کیا کرتا تھا روزانہ اس کے کام پر جاتے تھے......وہ کتنے فخر اور یقین سے اسے بتایا کرتا تھا کہ آج ابا میرے لیے میری پسند کی گیند خرید کر لائیں گے پھر وہ اس کے ساتھ گیند بیٹ کھیلا کرے گا......اسی شام اس کے لیے گیند بیٹ آ جاتا ......حاشو کے دل میں حسرت سر ابھارنے لگتی اس نے بھی اماں سے اپنے لیے گیند بلا لانے کو کہا......اس نے اس روز شام تک دروازے کے چکر کاٹ کاٹ کر ماں کی واپسی کا انتظار کیا مگر ماں واپس ضرور آئی مگر خالی ہاتھ......

''تو میرے لیے گیند نہیں لائی اماں؟'' حیرت و دکھ کی زیادتی کے باعث اس کی آواز پھٹ سی گئی تھی ماں دن بھر کی تھکی ہاری اپنی دھن میں بولی تھی اس نے بیٹے کا تاریک پڑتا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

''آج پیسے نہیں ملے حاشو......صبح کا وعدہ کیا ہے صاحب نے وہ کمپنی کے مالک کو صاحب کہا کرتی تھیں''

''صبح لازمی لے آؤں گی تیرے لیے گیند بلا......'' مگر وہ ان کی بات کو نہیں سمجھا اسے بس یہ سمجھ میں آیا کہ اس کی ماں جان بوجھ کر اس کے لیے نہیں لائی اگر خالق کہتا تو وہ اس کے لیے لازمی لے کر آتیں اس وقت تو وہ خاموش ہو گیا مگر شام کو جب گھر سے باہر کھیلنے گیا تو قالو نے اس کے ہاتھ میں گیند بلا نہ دیکھ کر خوب مذاق اڑایا تھا وہ اسے خالی ہاتھ دیکھ کر پیٹ پر ہاتھ رکھ کر خوب خوب ہنسا تھا۔

''ہنس کیوں رہے ہو......'' وہ اس کے پاس جا کے ڈھٹائی سے قدرے سخت لہجے میں بولا تھا جواباً وہ اور بھی زور سے ہنسا تھا۔

''تمہارا بیٹ اور بلا تو بہت پیارا ہے حاشو......'' وہ اس پر طنز کر رہا تھا حاشو کے جبڑے بھینچ گئے۔

''صبح میرا گیند اور بلا آ جائے گا اماں نے وعدہ کیا ہے......'' اس کے لہجے میں واضح شکستگی تھی۔

''اور وہ صبح کبھی نہیں آئے گی ہاہاہا......پچھلی مرتبہ بھی تو نے کہا تھا کہ فٹ بال صبح آ جائے گا میں اس کے ساتھ کے تین منگوا کے کھیل چکا ہوں اس آس پہ کہ تمہارا آئے گا تو تو بھی مجھے کھلائے گا مگر...... مان لے حاشو تیری ماں تیرے سے پیار نہیں کرتی اور تو میری چیزوں سے ہی کھیلا کرے گا،'' قالو کے لہجے میں اپنے کھلونوں کے حوالے سے تکبر اور مان تھا کچھ غلط بھی نہیں تھا، اپنے محلے کے سبھی ساتھ کے لڑکوں میں سب سے زیادہ کھلونے اسی کے پاس ہوتے تھے اور فرمائشیں بھی زیادہ اسی کی پوری کی جاتی تھیں سو اس لحاظ سے اس کا اترانا بنتا تھا۔

''یہی بات اگر خالق کہتا تو اسے خالہ ضرور دلا دیتی......اس کے پاس تو ہمیشہ ہی کھلونے رہتے ہیں اس کے پاس تو لکڑی والا بڑا بیٹ ہے اسے بھی تو خالہ نے ہی لا کے دیا تھا......'' قالو کا اتنا ہی کہنا تھا اس کا دکھ پھر سے تازہ ہو گیا ویسے بھی اس کا شمار ان بچوں میں ہوتا تھا جو دوسروں کے کہے میں جلدی آنے والے ہوتے ہیں اپنی عقل اور سمجھ بوجھ جن کے پاس ہوتی تو ہے مگر وہ اسے استعمال کرنا گناہ سمجھتے ہیں

وہ غصے سے بپھر کر گھر پہنچا رات کا کھانا بھی نہیں کھایا ماں کا دکھی دل مزید دکھی ہو گیا......وہ کل سے ان سے ناراض تھا بات چیت مکمل طور پر بند کر رکھی تھی خالق سے وہ پھر بھی بات کر لیتا تھا کیونکہ ماں کی بجائے وہ اس سے ہی زیادہ ہلا ہوا تھا بلکہ باپ کی وفات کے بعد اسے تو ماں کی آغوش نصیب ہی نہیں ہوئی تھی خالق ہی تھا جس نے اسے ماں اور باپ بن کے پالا تھا وہ اس کی بات مان جایا کرتا تھا مگر اب کی بار اس نے خالق کی بات بھی نہیں مانی تھی جب وہ اس کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ وہ بہت زیادہ حساس بچہ تھا، ضد اور ہٹ دھرمی اس میں کوٹ کوٹ کے بھری تھی اس کے اندر احساس کمتری کا خودرو پودا نمو پا رہا تھا اور کسی کو خبر نہیں ہو رہی تھی اور جب خبر ہوئی اس وقت تک صرف پچھتاوے ہی تھے جو ان کے دامن سے لپٹ گئے تھے۔

"حاشو......کیا ابھی تک ناراض ہے یار......" اٹھارہ سالہ خالق ہاتھ میں پلاسٹک کی چنگیر میں گھی سے سنکی چپاتی اور دال کی کٹوری رکھی تھی پاس آ کر محبت سے بولا تھا۔ وہ جو آنکھیں موندے بازو آنکھوں پر رکھے بظاہر سو رہا تھا خالق کے استفسار پر بس لمحہ بھر کے لیے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا۔

"بھائی......مجھے کھانا نہیں کھانا" اس نے سوال کا جواب نہیں دیا تھا بس اپنی بات ان تک پہنچا دی تھی اور بازو پھر سے آنکھوں پر رکھ کر اجنبی بن گیا تھا۔

"کھانے سے کیسی ناراضگی حاشو......رزق کی ناقدری نہیں کرتے اللہ گناہ دیتا ہے" وہ عمر رسیدہ بان والی جھلنگا چارپائی پر اس کے پاس بیٹھ کر اس کے بازو کو آنکھوں سے ہٹاتے فہم و تفہیم سے اسے سمجھا رہا تھا۔

"مجھے اس وقت کچھ نہیں سننا...... مجھے نیند آ رہی ہے مجھے سونا ہے" وہ کروٹ کے بل لیٹ گیا تھا۔

"حاشو......میری جان میری طرف دیکھو بیٹا" خالق نے اسے پیار سے چمکارتے ہوئے کہا تھا وہ عمر میں اس سے آٹھ برس بڑا تھا لیکن اسے اکثر بیٹا کہا کرتا وہ اس کے لیے ایک بچہ ہی تھا ذمہ داری نہیں جسے وہ بیک وقت سکول کی پڑھائی کے ساتھ نبھا رہا تھا وہ خود بچپن سے ہی بہت سمجھدار بچہ تھا بن کہے ہی اس نے اپنی ماں کے دکھ اور کام بانٹ لیے تھے......اس نے گھر کے ساتھ بھائی کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر پر ڈال لی تھی۔ اس نے اپنی خواہشات کو اپنے دل کے قبرستان میں دفن کر لیا تھا کیونکہ اس کا بھائی بہت چھوٹا تھا اور اکثر بیمار رہتا تھا اسی لیے اسے ماں کا احساس ہوتا تھا وہ اتنا کماتی نہیں تھی جتنا ان کا خرچ ہو جاتا تھا سو وہ محتاط ہو گیا تھا وہ اسکول نہیں جاتا تھا گھر پر ہی تھوڑا بہت یا مدرسے کے مولوی صاحب سے سبق پڑھ کر تھوڑا پڑھنا لکھنا سیکھ رہا تھا اس کے سکول نہ جانے سے اس کی کتابوں اور فیس کا خرچہ بچ گیا اس نے ماں سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی مگر ماں تو ماں تھی اسے خبر ہو جایا کرتی تھی کبھی کبھار عید وغیرہ پر بونس ملنے پر یا کبھی زیادہ چیزیں بیچنے پر اسے اضافی رقم ملتی تو وہ اکثر ہی اپنے بچوں کے لیے کھلونے یا کھانے پینے کی اشیاء لے آیا کرتی تھی وہ ان کو سنبھال کر سینت سینت کر رکھتا کہ بڑا ہونے پر حاشو ان سے کھیلا کرے گا ماں کو دوبارہ پیسے خرچ نہیں کرنا پڑیں گے اسی لیے وقتاً فوقتاً آنے جانے والے

کھلونے اس کے پاس اچھی خاصی تعداد میں جمع ہوگئے تھے جو حاشو کے دوسرے ہی روز یا تو گم ہوجاتے یا وہ خود توڑ دیا کرتا تھا اور انہی کھلونوں کو دیکھ کر حاشو سمیت باقی سب کو بھی یہی لگتا تھا کہ اس کی ماں خالق کی ہر ضرورت اور خواہش بن کہے پوری کر دیتی تھی حقیقت میں وہ بہت صابر بچہ تھا اور صبر کرنے والے لوگ اللہ کو عزیز ہوتے ہیں وہ ان کی خودی کا بھرم خود رکھتا ہے وہ ان کی خواہشوں کا احترام خود کرتا ہے۔

''حاشو......دیکھ اگر تو کھانا نہیں کھائے گا تو میں بھی نہیں کھاؤں گا'' اب کی بار اس نے دھمکی دی تھی اور وہ کارگر بھی ثابت ہوئی تھی حاشو نے کروٹ بدل کر اس کی طرف منہ موڑ لیا تھا۔

''تو کھانا نہیں کھائے گا تو اماں بھی نہیں کھائے گی اور وہ صبح کی بھوکی ہے'' خالق نے اس کے کروٹ بدلنے پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ماں کی طرف سے آیا دل میں میل بھی صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔

''تم کھانا کھالو بھائی......کیونکہ اگر تو بھوکا سویا تو ماں کھانا نہیں کھائے گی حاشو کی قسمت میں ماں کا ایسا لاڈ نہیں لکھا'' اس کی آواز رندھ گئی تھی وہ دودن سے یہی سوچ سوچ کے پاگل ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کے لیے اہم نہیں وہ اسے عزیز نہیں مگر وہ یہ نہیں سوچ پایا کہ ماں مجبور ہے اور غریب بھی......ہمیشہ اس نے یہی غلطی کی اس نے اپنوں کی محبت کو نہ سمجھا نہ جانچا......اس نے ہمیشہ جلنا اور کڑھنا ہی سیکھا تھا۔

''ایسا کیوں سوچتا ہے دیکھ......اماں کتنی پریشان ہے وہ تجھ سے بہت پیار کرتی ہے حاشو......اسے تیری ذات سے بہت امیدیں ہیں وہ کہتی ہے تو اپنے باپ کا نام پیدا کرے گا، تو دنیا میں اپنا نام روشن کرے گا تو اس کے لیے فخر کا باعث بنے گا تو بہت دل لگا کے پڑھتا ہے کلاس میں اول آتا ہے تو وہ کتنی خوش ہوتی ہے تجھے اندازہ نہیں اور تجھے اندازہ ہونا چاہیے اپنی ماں سے محبت کا......اب چل اٹھ کھانا کھالے......ٹھنڈا ہوگیا تو مزہ نہیں آئے گا'' حاشو خاموش ہی رہا خالق نے پہلا نوالہ توڑ کر اس کے منہ میں ڈالا اور اس نے خاموشی سے کھا بھی لیا یہ اس کی ناراضی ختم ہونے کا اشارہ تھا مگر ماں سے وہ ابھی بھی نہیں بول رہا تھا۔

☆☆☆

جلدی جلدی کرنے کے باوجود بھی آج اسے اچھی خاصی دیر ہوگئی تھی کیمسٹری کے پروفیسر نے ان کو کیمسٹری کی ایک اہم اسائنمنٹ حل کرنے کو دے دی تھی جو فوراً ہی انہیں مکمل کر کے دینی تھی اسی لیے وہ چھٹی ہوجانے کے بعد بھی کلاس میں رہی تھی کچھ پریکٹیکل کرنے تھے جن کی ریڈنگز اسے اسائنمنٹ میں سب مٹ کرنی تھیں......اس نے گھڑی پر نگاہ ٹھہرا کر دیکھا تو تین بج رہے تھے آج اس نے لنچ بھی نہیں کیا تھا......پیٹ میں چوہے اودھم مچا رہے تھے مگر اسے بھوک کی پرواہ نہیں تھی اسے بس کالج کینٹین کے اس شیڈ تک پہنچنے کی جلدی تھی جہاں وہ ہر روز پچھلے پندرہ روز سے کھڑا ہو کے چھٹی کے بعد وائلن بجایا کرتا تھا ایک ہی گانے کے وائلن دھن تھی جو وہ ہر روز نئے طریقے سے بجایا کرتا تھا اس قدر دلکش مترنم اور خوبصورت پرسوز ردھم سے بھرپور لے کہ من تیرنے لگتا وہ اس کی خوبصورتی کے ساتھ خود کو بہتا محسوس کرتی وہ پھولی سانسوں کو ہموار کرتی شیڈ کے قریب پہنچی......سارے کیمپس کی لڑکیاں اور لڑکے اس کے قریب کھڑے ہوئے

تھے وہ آنکھیں بند کیے وائلن کے سر بکھیر رہا تھا جس وقت وہ پہنچی وہ ان الفاظ پر تھا

"Every hour, Every minute take my hand and let me the way!"

"All through ur life"

"I will be by ur side"

"Till death do us part"

"I will be ur friend"

"My love will never End, Till death do us part"

"اس کے اردگرد قوس وقزاح کے رنگ بکھرنے لگے......وہ ہواؤں میں تیرتے ہوئے اڑ رہی تھی اس قدر ہلکی پھلکی روئی کے گالوں جیسی......براق اور شفاف......زندگی اس قدر حسین اور مکمل بھی ہو سکتی ہے کیا اس احساس اور الفاظ کی طرح......وہ اس کی مندی آنکھوں پر نگاہ جمائے لاشعوری طور پر سوچ رہی تھی......ایک انجانی کشش، غیر شناسا اجنبی سا احساس......جو اسے اپنی لپیٹ میں لینے لگا تھا وہ ڈرپوک نہیں تھی مگر محبت جیسے صحرا سے خوفزدہ ضرور تھی......وہ محبت نہیں کرنا چاہتی تھی مگر محبت ہی اس کی زندگی کا حاصل تھی وہ سر تا پیر محبت کی یورش میں بھیگا تھا اس کے وجود کے انگ انگ سے محبت نقرئی کی مانند ٹپکتی محسوس ہوتی تھی وہ اس دنیا کا باسی نہیں لگتا تھا......وہ کسی اور راہ کا مسافر تھا محبت جس کا پیرہن تھا اور محبت کے پیرہن میں اس کا لپٹا وجود چھپا ہوا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ آئی......کچھ اس طرح کہ ارد گرد سے بے نیاز اس نے ہجوم کو چیر دیا تھا......وہ بے خودی کے عالم میں آگے بڑھ رہی تھی ایسے لگتا تھا جیسے اسے دنیا کی کوئی پرواہ نہ ہو وہ یک ٹک بغیر جنبش کیے سانس روکے وائلن کے دھیمے سروں میں کھوئی اس کی بند پلکوں پہ نگاہ جمائے کھڑی تھی......کالج کے اسٹوڈنٹس نے اس کی اس اضطراری اور بے گانہ کیفیت کو ٹھٹک کے دیکھا تھا چند ایک نے آپس میں اسے دیکھ کے سرگوشیاں بھی کی تھیں دبی دبی سے مسکراہٹیں، ہلکی ہلکی سی سرگوشیاں......مگر اس کا ارتکاز نہیں ٹوٹا کوئی بیرونی طاقت کوئی غیر مرئی شے اس کا ارتکاز نہیں توڑ پاتی تھی تب تک جب تک وائلن بجنا بند نہ ہو جاتا......وہ اس کے اونچے لمبے وجیہہ سراپے پر نگاہ جمائے کھڑی رہتی اور وہ شان بے نیازی سے وائلن بیگ میں رکھ کر بند کر کے ادھر ادھر دیکھے بنا آگے بڑھ جاتا جب وہ وائلن بجانا بند کرتا تو ہجوم پر جوش انداز میں تالیاں بجا کر اسے خراج تحسین پیش کیا کرتا تھا مگر واحد ایک وہ تھی جو تالیاں نہیں بجاتی تھی وہ اسے نگاہوں سے داد و تحسین پیش کیا کرتی تھی۔ وہ اسے سانسوں سے تعظیم بخشتی تھی وہ اس کے ہر اٹھتے قدم پر اپنے قدموں کے نشان رکھ کے اسے معتبر کرتی تھی وہ ایسا کس لیے کرتی تھی اسے آگاہی نہیں تھی اور کس کے لیے کرتی تھی یہ خبر اسے بھی نہیں تھی......اپنی کیفیات کو وہ کوئی نام نہیں دے سکتی تھی......نہ سمجھ پاتی اور بغیر سمجھے مدعا بیان کرنا نہ آسان ہوتا ہے نہ ممکن......وہ ابھی تک اس کا نام نہیں جان پائی تھی آگے کی معلومات تو بہت دور کی بات تھی......چند دن گزرے وقت کے کشکول میں

کھنکتے ہوئے سکول کی مانند......وہ کالج میں ایک ہاٹ ایشو بن گئی اڑتی پھرتی کافی باتیں ان دونوں کے کانوں میں بھی پڑیں مگر دونوں ہی انجان رہے یوں جیسے ان دونوں کو ہی اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ لوگ ان کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے رہے ہیں اور پرسکون زندگی وہی لوگ گزارتے ہیں جو دنیا والوں کی کہی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے "

☆☆☆

حاشو نے سالن کی کٹوری اٹھا کر پھینکی تھی اس میں موجود واحد بوٹی اور پتلا سا شوربہ زمین پر گرتے ہی مٹی میں مل گئے تھے خالق نے روٹی کا لقمہ حیرت سے حاشو کی اس حرکت کو دیکھ کر واپس چنگیر میں رکھ دیا......اماں نے بھی تاسف و دکھ سے گہری سانس بھری نجانے اب ایسا کیا گناہ سرزد ہو گیا تھا ان سے جو حاشو کا پارہ پھر سے چڑھ گیا تھا۔ روز بروز اس کی بدتمیزیاں بڑھتی جا رہی تھیں غصہ ہر وقت سوا نیزے پہ رہنے لگا تھا چھوٹی سے چھوٹی بات مزاج کو گراں گزرنے پر وہ ہاتھ میں آئی ہر چیز اٹھا کر پٹخ دیا کرتا اس کی ضد اور ہٹ دھرمی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا جو خالق اور اماں کے لیے نہایت پریشانی کا باعث تھی۔

"یہ کیا بدتمیزی کی ہے تم نے حاشو......" ماں کا راکھ ہوتا چہرہ دیکھ کر خالق نے ہی اس سے استفسار کیا تھا۔

"مجھے نہیں کھانا یہ پتلا شوربہ......مہینوں بعد گوشت کی شکل دیکھنی نصیب ہوتی ہے اور وہ بھی اماں پکانے میں خراب کر دیتی ہے ......اس سے بہتر ہے ناں کہ میں نہ کھایا کروں یہاں کھانا......" ایک بات تو طے تھی کہ وہ کبھی بھی حالات سے سمجھوتہ نہیں کر پایا تھا وہ بچپن سے ہی ایسا تھا پھر اب تو جوانی کی دہلیز پر کھڑا شباب کے رنگ چرا رہا تھا امتیازی نمبروں سے میٹرک پاس کیا تھا گورنمنٹ سے باقاعدہ وظیفہ ملا اور اچھے اور بہترین کالج میں داخلہ بھی......وقت اور قدرت ایک ساتھ اس پر مہربان ہو گئے تھے مگر بچپن کی خود ساختہ محرومیوں کے دکھ ذہن کے پردے پر بہت واضح اور روشن تھے اور جب سے مہنگے اور مشہور کالج میں گیا تھا وہاں کے لڑکوں کے ٹھاٹھ اور عیاشیاں صبر اور شکر کے بجائے مزید دماغ خراب کر گئی تھیں وہ اپنا اور ان کا تقابل ہمہ وقت کیے رکھتا......وہ خود کو کبھی حالات کے مطابق ڈھال پایا نہ ہی اس کی ماں اور بھائی اپنی محبت سے اسے سنبھال پائے وہ ایک نہایت مختلف مزاج کا لڑکا تھا اور اس کی بدقسمتی ہی یہی تھی کہ وہ حد سے زیادہ حساس تھا اور غریب کو حساس نہیں ہونا چاہیے۔

"تو کہاں سے لاؤں میں تیرے لیے مرغن کھانے حاشو......" اماں کو ایک دم ہی غصہ آیا تھا۔ ورنہ شاید خالق بات کو سنبھال ہی لیتا......وہ تیر کی سی تیزی سے اس کی طرف آئی تھی اور غصے سے اسے تھپڑ بھی مارا تھا حاشو تو حاشو خالق بھی دم بخود رہ گیا تھا اماں نے آج تک ان دونوں بھائیوں پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا تبھی تو اسے مارنے کے بعد خود کچھ زمین پر گری روٹی اور الٹی پڑی کٹوری کے پاس بیٹھ کر زور زور سے رونے لگ گئی تھیں خالق بے ساختہ ماں کی طرف بڑھا تھا اسے ماں کے آنسو تکلیف دے رہے تھے۔ اس نے کبھی ماں کو یوں بے اختیار روتے اور بلکتے نہیں دیکھا تھا وہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک خاتون تھیں اپنے غم اپنے دکھ اور ان دکھوں کی تھکن چھپانے میں وہ

دن بھر مردوں کی طرح کمایا کرتی تھیں پاؤں میں پلاسٹک کی جوتی گھس کر ایڑیاں پھاڑنے لگتی مگر وہ اپنے لیے جوتا نہ خریدتیں......سردی گرمی وہ کالی لیلن کی چادر میں گزار دیتیں مگر سردی کے سیزن کے مطابق نئے جوڑے تو انہیں کبھی نصیب ہی نہیں ہوئے تھے وہ تو انہی دو جوڑوں کی پیوندکاری کر کر کے انہیں استعمال کے قابل بنائے رکھتیں۔

"بتا اسے خالق......اس کا باپ مرنے سے پہلے کوئی خزانے نہیں چھوڑ کے گیا تھا ہمارے لیے......نہ ہی میں کسی رئیس کی بیٹی تھی جو اس کے ناز نخرے ہی اٹھاتی ساری زندگی دن رات گدھوں کی طرح بار ڈھو ڈھو کے یہ کر پائی ہوں تم دونوں کے لیے اس سے زیادہ نہیں کر سکتی......کہاں سے لاؤں میں اس کے لیے وہ آسائشیں جن کی یہ توقع کرتا ہے مجھ سے......وہ بری طرح رو رہی تھیں سالوں کا غبار تھا جو اس دن نکلا تھا شو نے آگے بڑھ کر ماں سے معافی مانگی نہ ہی اسے چپ کرایا بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے ہی نکل گیا......" خالق نے ٹھنڈی سانس بھر کے ماں کو تسلی دی جو اس کے اس طرح سے جانے پر اور بھی شدت سے رونے لگی تھیں۔

"تو رومت ماں......میں اسے سمجھا دوں گا بچہ ہے ابھی، دیکھا تو نے......ابھی دیکھا تو نے خالق......وہ کیسے نکلا ہے گھر سے جس رزق کے لیے میں سارا دن دھکے کھاتی ہوں اس کی وہ ایسے بے حرمتی کرتا ہے۔ مجھے اس کی ان عادات سے ڈر لگتا ہے خالق یہ کس ڈگر پہ چل نکلا ہے، وہ خالق کے سینے میں منہ چھپا کے روئی تھیں۔"

"ٹھیک ہو جائے گا وہ اماں......بس لاڈ میں ایسی غلطیاں کر جاتا ہے اور کچھ وہ غلط بھی نہیں ہے اس نے باہر کی رنگین اور چمکتی دنیا دیکھی ہے ہمیشہ......روپے پیسے کی ریل پیل......دیکھنا جب پڑھ لکھ کے کسی قابل بنے گا تو خود ہی قدر کرے گا اپنی محنت کی کمائی کی......ہم نے ہمیشہ ہی اسے اچھے سے اچھے سکول میں پڑھا ہے تاکہ وہ کسی قابل بن سکے اور وہ ضرور بنے گا وہ کتنا ذہین ہے ہمیشہ ہر کلاس میں اول آتا ہے تو پھر ایسا چھوٹا موٹا نخرہ تو اس کا حق بنتا ہے ناں اماں، وہ ماں کے آنسو صاف کرتے اپنے کہے کی تائید چاہ رہا تھا، سادہ لوح ماں ممتا کے جذبے سے مجبور سر کو اثبات میں جنبش دینے پر مجبور ہو گئی......یہ ممتا بھی ناں عجیب ہی جذبہ ہے اولاد کو کبھی غلط سمجھنے ہی نہیں دیتا......"

گھر سے وہ بہت دکھی ہو کے نکلا تھا اسے دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ اس نے ماں کا دل دکھایا ہے بلکہ دکھ اس تھپڑ کا تھا جو ماں نے اسے مارا تھا یعنی ماں نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی اپنی غلطی کا ادراک اسے کبھی نہیں ہوا تھا دوسروں کی زیادتی کا احساس اسے بہت جلدی ہو جایا کرتا تھا۔ اسے غصہ آتا تھا تو وہ انتہا پہ جا کے سوچتا تھا مگر دوسروں کو اس کا ردعمل ظاہر کرنے کا حق بھی دینا وہ پسند نہیں کرتا تھا کچی بستی سے دور گندے نالے کے پاس......وہ اکثر ہی ناراض ہو کر روٹھ کر وہاں بیٹھ جایا کرتا تھا......روتے کڑھتے اس نے وہیں پر اپنے لیے ایک خیالی دنیا بسائی تھی......وہ جب بھی ناراض ہوتا وہاں جا کر اپنی حسین سوچوں سے تخلیق کردہ دنیا میں قدم دھر لیتا......وہ دنیا جو مکمل اور حسین تھی خوبصورت پرسکون اور پر آسائش تھی......جہاں وہ ایک بڑے سے گھر میں اپنے ماں باپ اور بھائی کے ساتھ ایک بہترین خوشگوار زندگی گزارتا تھا جہاں نوکروں کی فوج اس کے نخرے اٹھانے کو ہمہ وقت تیار مودب انداز میں کھڑی رہتی تھی اور ماں نک سک سے

تیار اس کے ناز اور لاڈ اٹھانے میں مصروف رہتی تھی اس نے اپنے سکول و کالج میں کبھی نہیں بتایا کہ وہ مزدور کا بیٹا ہے لڑ جھگڑ کر ہی سہی مگر اس نے ہمیشہ اچھا اور بہترین لباس پہنا تھا دوستوں پر پیسہ ویسے ہی لٹایا تھا جیسے موٹر گاڑی میں بیٹھ کر آنے والے بچے اور لڑکے لگایا کرتے تھے ......اسے لگتا تھا اپنی بنائی جھوٹی شان و شوکت کو قائم رکھنے کے لیے وہ ماں اور بھائی سے لڑ کر اپنا حق وصول کرتا ہے بس یہ وہ ایک بات کبھی نہیں سمجھ پایا کہ ماں اور بھائی اس کی محبت میں اس کی کڑوی کسیلی سہہ جاتے ہیں وہ اس سے ڈرتے نہیں پیار کرتے ہیں وہ ان کی محبت کو کبھی سمجھ نہیں پایا یا شاید ان دونوں کو کبھی سمجھانا ہی نہیں آیا مگر آج تو حد ہی ہوگئی تھی آج تو ماں نے اس پر ہاتھ اٹھا دیا تھا ماں نے کبھی اسے بھرپور محبت اور توجہ نہیں دی تھی مگر اسے کبھی یوں مارا بھی نہیں تھا......اس نے کتنی مرتبہ اس بات کو محسوس کیا تھا کہ وہ خالق سے زیادہ پیار کرتی ہے وہ حاسد نہیں تھا اسے اپنے بھائی سے جلن بھی محسوس نہیں ہوتی تھی مگر اسے ماں کی عدم دلچسپی اور بے زاری بھی تکلیف دیتی تھی وہ سارا دن خالق کے پاس رہتا تھا مگر شام کو جب ماں گھر واپس آتی تو اس کا دل چاہتا ماں اس کے لاڈ اٹھائے اسے محبت سے اٹھا کے گھر کے سارے کام کرے اسے اپنی گود میں بٹھائے رکھے مگر وہ گھر آتے ہی اسے کھانے کی کوئی چیز دے کے چمکار کر ایک طرف بیٹھ جانے کو کہتی اور خود گھر کی صفائی ستھرائی اور کپڑوں وغیرہ کی دھلائی میں مصروف ہو جایا کرتی اسے کبھی ماں کی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہوا اسے ہمیشہ لگا کہ ماں اس کے ساتھ زیادتی کرتی ہے......اگر وہ خالق کو زیادہ اہمیت دیتی بھی تھی تو خالق نے بھی تو اس کا ساتھ ویسے ہی دیا تھا جیسا کوئی بھی اچھا بیٹا اپنی ماں کا دیتا ہے......وہ کبھی اسکول نہیں گیا کہ ماں کما نہیں پائے گی چھوٹا بھائی رل جائے گا گھر میں فاقوں کی نوبت آ جائے گی اس سوچ ہمیشہ اپنے ذات کے گرد ہی محو سفر رہی تھی اس نے ہمیشہ میں سے میں تک کا سفر ہی کیا تھا اور یہ خود غرضی نہیں تو کیا تھی کیا فائدہ ایسی حساسیت کا جو صرف اپنی ذات کی محرومیوں کا ہی ادراک بخشے۔اس روز گندے نالے کے پاس بیٹھ کر پہلی مرتبہ اس نے اپنی تخلیق کردہ دنیا کو صفحہ قرطاس پر موتیوں کی مانند اتارا تھا......کمال حیرت کی بات اس کہ اندر سکون کے جھرنے بہنے لگے تھے......اس نے ایک ہی نشست میں ساری کہانی لکھ ڈالی تھی یہ وہ کردار تھے جن کے درمیان وہ رہتا تھا یہ وہ دنیا تھی جس کا وہ باسی تھا یہ اس کے وہ خواب تھے جن کو شرمندہ تعبیر کرنے کی اس کی خواہش تھی پہلی بار اس نے کہانی لکھی تھی اور اس کے لیے وہ ایک کہانی نہیں تھی اپنی محرومیوں تشنگی اور اذیتوں کے بعد کے دیکھے جانے والے حسین خواب تھے خوش امیدی تھی اس کی پہلی ہی کہانی نے تہلکہ مچا دیا تھا اس کا انداز تحریر اسلوب بیان بہت منفرد اور سادہ تھا اور وہ ہٹ کر لکھتا تھا وہ چونکا دینے والی بات کہتا تھا وہ کہانی نہیں لکھتا تھا وہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں خواب بنتا تھا اور کیا کمال بنتا تھا۔

☆☆☆

پاک ٹی ہاؤس ایک ادبی، تہذیبی اور ثقافتی علامت تھا مشاعروں، ادیبوں اور نقاد کا مستقل اڈہ......ادیبوں و شاعروں کا دوسرا گھر بھی کہا جاتا تھا۔حشمت زیدی نے بہت جلد یہاں کے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی تھی وہ پاک ٹی ہاؤس کے ایک خوش گفتار بے حد قابل

اور نفیس طبیعت کے حامل ایک پڑھے لکھے وجیہہ نوجوان تھے ایک زمانہ ان کی ذہانت، وجاہت اور گفتگو کا شیدائی تھا وہ اپنی تحریر میں پور پور ڈوبے نظر آتے تھے۔ بہت محبت کرنے والے باوفا، باکردار، ایثار پسند، کشادہ ذہن...... دیکھنے میں بھی ویسے ہی دکھتے، اپنی کہانیوں اور تحریروں کا سین جو بھی ایک بار ملتا گرویدہ ہوجاتا انہیں بے پناہ ایسے خطوط بھی ملے جن میں ان کے کسی افسانے کسی ناول کے منطقی انجام کی وجہ سے حاصل ہونے والے سبق سے کسی کی زندگی تباہ ہونے سے بچ گئی کئی ایک نے یہ بھی لکھا کہ ان کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ جو کہ غلط ہونے جارہا تھا صرف ان کی تحریر میں چھپے پیغام اور مشورے کی وجہ سے درست ہوگیا......ٹی ہاؤس کے عروج کا زمانہ ان کے لکھنے کا آغاز اور وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سینئر لیڈر چن لیے گئے...... مصنفین کے لیے سہولیات زندگی ادبی محافل کے امور کا انتظام سب ان کے نازک کندھوں پر آ گیا جسے انہوں نے ہمیشہ احسن طریقے سے نبھایا وہ بہت ویل آرگنائزڈ تھے اپنی شخصی خامیوں کو انہوں نے ہمیشہ اپنی خوبیوں کی عظمت اور بڑائی کے پردے میں چھپایا تھا اور بہت زیادہ کامیاب رہے تھے۔ اب وہ بہت مشہور ہوچکے تھے سو انہوں نے کچی بستی کے ساتھ ستر گز کے مکان کو خیر آباد کہہ کے نیلے گنبد کے پاس ایک کمرہ کرائے پر لے لیا......ویسے بھی اپنے تخلیقی کام کے لیے انہیں یکسوئی کی ضرورت تھی اتوار یا جمعے کے دن وہ کھڑے کھڑے بھائی اور ماں سے مل آتے......ویسے بھی ماں اب زیادہ تر بیمار ہی رہنے لگی تھی خالق بھائی کی محلے کی ہی لڑکی سے شادی ہوگئی تھی اماں کی ساری زندگی کی محنت کا جمع جتھا ان دو دکانوں کا حاصل تھا جنہیں خالق بھائی بیک وقت احسن طریقے سے چلا رہے تھے ایک دکان کی آمدنی خود رکھ لیتے اور دوسری کی امانتاً لاکر حاشو کی ہتھیلی پر دھر دیتے جس نے کبھی جھوٹے منہ بھی ماں کے لیے پچاس یا سو روپے نہیں پکڑائے تھے خالق نے کبھی مانگے بھی نہیں اس کی نوبت بھی نہیں آئی کیونکہ حاشو کبھی مطمئن ہوا ہی نہیں تھا دکان کی آمدنی اسے ہمیشہ ہی کم لگتی تھی حالانکہ اس میں حاشو کی محنت، توجہ یا وقت صرف نہیں ہوتا تھا پھر بھی اسے مفت کے پیسے بھی کم لگتے تھے۔

☆☆☆

اس روز وہ بہت جلدی میں تھے انہیں الحمراء آرٹ کونسل میں منعقد ایک مشاعرے میں جانا تھا۔ چائے اور کیسیٹ سگریٹ کی طلب انہیں پاک ٹی ہاؤس میں کھینچ کر لائی تھی مگر علیم الدین صاحب وہاں موجود نہیں تھے وہ بار بار اپنی گھڑی کی جانب دیکھ رہے تھے انہیں وہاں جلدی پہنچنا تھا اسی اثناء میں کاؤنٹر پر رکھے ایس ٹی ڈی کی مخصوص چنگھارتی کانوں کے پردے پھاڑتی بیل بجی تھی......انہوں نے کوفت و بےزاری سے پاک ٹی ہاؤس کے داخلی دروازے کی جانب دیکھا جہاں سے علیم الدین ابھی تھوڑی دیر پہلے کیسیٹ خریدنے کے لیے باہر گئے تھے اور ان کی واپسی کے آثار فی الوقت دکھائی نہیں دے رہے تھے فون کی مسلسل چنگھاڑ نے ان کا موڈ ویسے بھی برگشتہ کردیا تھا انہوں نے بے دلی سے فون اٹھایا تھا اور بڑے بےزار سے انداز میں ہیلو کہا تھا۔

''السلام علیکم......کیا میں حشمت زیدی صاحب سے بات کرسکتی ہوں، بے حد نرم رو لہجہ ان کے سماعتوں میں پھول بکھیر گیا تھا

اس قدر خوبصورت دلکش اور دل آواز آواز انہوں نے آج تک نہیں سنی تھی انہیں اعتراف کرنا پڑا تھا۔"

"جی...... آپ کو کیا بات کرنا ہے ان سے...... کوئی پیغام ہو تو بتا دیجیے ان تک پہنچ جائے گا" کچھ دیر پہلے والی بے زاری بھاپ بن کے یکدم اڑ گئی تھی انہوں نے اپنے شائستہ انداز میں اس خوبصورت آواز والی لڑکی کو جواب دیا تھا۔

"پیغام نہیں...... مجھے ان سے خود بات کرنی ہے اور بہت اہم بات کرنی ہے...... میں ان کا شکریہ خود ادا کرنا چاہتی ہوں انجانے میں جو احسان انہوں نے میری ناتواں ذات پر کیا ہے اس کے لیے میں چاہ کر بھی ان کا شکریہ صحیح معنوں میں ادا نہیں کر سکتی، دوسری جانب وہ لڑکی بہت دھیمے نرم لہجے میں ہلکے ہلکے جوش سے کہہ رہی تھی ایسی تعریف و توصیف کے تو وہ عادی تھے مگر پھر بھی انہیں اس لڑکی کی تفصیل سننے کو دل چاہا تھا مگر وہ اس لڑکی کو یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ حشمت زیدی ہی ہیں کیونکہ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے تو وہ خود ان سے کہہ چکے تھے کہ کوئی پیغام ہو تو بتا دیجیے وہ حشمت زیدی تک پہنچ جائے گا یکا یک انہوں نے ایک فیصلے پر پہنچ کر مقابل لڑکی کو آگاہ کیا تھا"

"اس وقت تو وہ ایک مشاعرہ اٹینڈ کرنے کے لیے الحمرا آرٹ کونسل میں گئے ہوئے ہیں آپ کل دوپہر ایک بجے کے بعد فون کر لیجیے گا میں کوشش کروں گا آپ کی ان سے بات کروانے کی ٹھیک ہے......" انہوں نے نہایت عمدگی سے جواب دیتے اسے بے پناہ خوش کر دیا تھا۔

"ذرہ نوازی ہوگی آپ کی اگر آپ ایک مرتبہ میری ان سے بات کروا دیں گے تو...... میرا ان سے بات کرنا بہت ضروری ہے میں کل دوپہر ایک بجے فون کروں گی...... کیا وہ وہاں خود موجود ہوں گے ناں...... وہ نجانے کس انجانے خدشے کے تحت تائیدہ چارہ رہی تھی تبھی بے ساختہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ امڈ آئی تھی"

"جی محترمہ...... تسلی کے لیے خود بھی تشریف لا سکتی ہیں آپ...... انہوں نے ہنستے ہوئے بس یوں ہی کہہ دیا تھا مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ دوسرے ہی روز سچ مچ ان کے سامنے آ کھڑی ہوگی۔"

☆☆☆

انہوں نے آنے والی دوشیزہ کو ایک نظر دیکھا تھا سفید کلیوں والے کرتے کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تین گز کا آتشی رنگ کا لمبا دوپٹہ سمیٹے اور نفاست سے اوڑھے وہ ایک دیدہ زیب لڑکی تھی...... نزاکت، حسن اور معصومیت کا حسین امتزاج ہے۔ پیچھے کہیں دھیمے سروں میں ریڈیو بج رہا تھا، جانب شیشے کی دیوار کے ساتھ لگے ہونے پر وہ کاغذات کا پلندہ سامنے رکھے سگریٹ والا ہاتھ منہ کے قریب رکھے گہری سوچ میں متفرق تھے شیشے کی کھڑکیوں سے گلابی دھوپ چھن چھن کر اندر آ رہی تھی...... آج موسم میں شدت تھی ناصر کاظمی، انتظار حسین، سجاد باقر رضوی، قیوم منظر احمد، مبارک احمد جیسے بڑے بڑے نام اسی صوفے پر بیٹھ کر شام کے وقت محفل جمایا کرتے تھے مگر اس وقت دن کے ڈیڑھ بج رہے تھے اور وہ صوفہ اس کے سامنے پڑا میز اور کرسیاں ویران تھیں ان پر صرف حشمت زیدی صاحب کا راج تھا

جبھی کوئی بہت ہولے سے ان کے پاس آ کر کھنکھارا تھا انہوں نے مسودے پر سے نظر ہٹا کر دیکھا اور پھر دیکھتے ہی رہ گ ۓ ے تھے ان کی نظر ہٹنے سے انکاری ہو گئی تھی۔ تلے والے کھسے میں مقید نرم گلابی پاؤں پر ان کی نظر پڑی اور وہیں جم گئی کیا کسی کے پاؤں اس قدر حسین اور خوبصورت بھی کھسے میں لگ سکتے ہیں......انہوں نے لحظہ بھر کے لیے سوچا تھا۔

''آداب'' مترنم آواز میں کہا گیا تو وہ چونکے اس قدر حسین عورت انہوں نے اپنے ناولز میں بھی نہیں لکھی تھی نہ کبھی کسی کتاب میں پڑھی تھی وہ ایک ماورائی داستان کا کوئی سانس لیتا چلتا پھرتا مدہوش کرتا ہوا کردار تھی۔

''آداب......تشریف رکھیے'' انہوں نے سگریٹ کی راکھ کو ایش ٹرے میں جھاڑ کر اس کے بیٹھنے کے انداز کو کن انکھیوں سے دیکھا اس کے ہاتھ اپنی گود میں دھرے تھے لمبی لمبی بے حد سفید انگلیاں جلد کی اوپری تہہ اس قدر باریک اور شفاف کے ہری رگیں واضح ہو کر اپنا جلوہ دکھا رہی تھی دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں عقیق کی لمبی نازک سی انگوٹھی میں قید تھا۔

''شکریہ......'' وہ انہیں دیکھ کے ہلکے سے مسکرائی تو نازک ہونٹوں میں انار کے دانوں کی مانند جڑے سفید موتیوں جیسے دانت سارے پاک ٹی ہاؤس کو اپنی جگمگاہٹ سے روشن کر گئے تھے۔

''میرا نام ام کلثوم ہے......حال ہی میں بی۔اے کیا ہے لاہور کالج سے......کل میں نے ہی فون کیا تھا آپ سے بات کرنے کے لیے......پھر سوچا خود ہی جا کے مل آؤں شاید آپ کو بتا سکوں کہ آپ کی تحریر کی وجہ سے کس طرح سے میری زندگی بچ گئی، توقف کے بعد وہ پھر ہولے سے مسکائی حشمت زیدی کی نگاہیں خیرہ ہوتی گئیں اور من سیراب......ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی جن سے ملنے کے بعد آپ کو زندگی حسین لگنے لگتی ہے دھوپ میں بہار اور رعنائی محسوس ہوتی ہے یہی کیفیات اس وقت ان کی بھی تھیں وہ پہلی خوبصورت لڑکی نہیں تھی جو ان سے ملنے آئی تھی بلکہ یہ وہ پہلی خوبصورت لڑکی تھی جو ان کے دل کو اچھی لگی تھی۔''

''بہت نوازش......مگر پہلے بتا دیجیے کہ کیا لیں گی شربت یا چائے'' انہیں اچانک ہی آداب میزبانی نبھانے کا خیال آیا تھا۔

''چائے پلوا دیجیے......میں نے سوچا تھا کہ جب کبھی آپ سے ملی تو چائے ضرور پیوں گی آپ کے ساتھ اور میری یہ خوش نصیبی ہے کہ مجھے یہ موقع آج مل رہا ہے......میں آپ کی تحریروں کی دیوانی ہوں آپ کی ہر تحریر میرے پاس محفوظ ہے......پھر اس نے خود ہی وضاحت کر دی تھی، جس قدر میری خواہش تھی آپ سے ملنے کی میرے پاس الفاظ نہیں اپنی خواہش کو بیان کرنے کے لیے خوبصورت لفظوں کے تو آپ بے تاج بادشاہ ہیں......'' بات کے اختتام پر وہ پھر مسکرائی تھی اس کا انداز بیاں بہت شائستہ اور دلکش تھا حشمت زیدی بے ساختہ مسکرائے تھے تعریف تو ہر کوئی کر لیا کرتا ہے مگر یہ کسی کے بس کی بات ہوتی ہے کہ وہ اپنی خوبصورت تعریف کو انوکھا بنا دے......ام کلثوم اس فن میں طاق تھیں گزرتے وقت نے ان پر اچھے سے واضح کر دیا تھا۔

''بہت نوازش محترمہ......یہ آپ سب کی محبت اور اوپر والے کا کرم ہے کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے آپ بتائیے کہ کس سلسلے

میں ملنا چاہ رہی تھیں،" انہوں نے چائے کا آرڈر دینے کے بعد گفتگو کو بڑھانے کی غرض سے پوچھا تھا۔

"میرے ابا ایڈیشنل جج ہیں ہائی کورٹ کے...... ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں بہن کا نام بتول ہے اور وہ شادی شدہ ہے بھائی لندن میں کیمبرج یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے جبکہ میں نے ابھی ابھی بی۔اے کیا ہے ابا کے دوست کے بیٹے کا رشتہ آیا ہوا ہے میرے لیے، پچھلے کئی دنوں سے...... ابا کا اصرار تھا کہ رشتہ وہاں طے کیا جائے اور والدہ اپنے بھائی کے ہاں مجھے بیاہنا چاہتی تھیں میں ان دونوں کے درمیان پنڈولیم بنی تنگ آ گئی تھی ابا کے دوست کا بیٹا کسی بھی لحاظ سے قابل اعتبار شخص نہیں تھا میں نے کیا ہم سب نے اس کے بارے میں بہت سے قصے سن رکھے تھے ویسے بھی مجھے شادی اپنی مرضی ومنشا سے کرنی ہے کیونکہ زندگی میں نے گزارنی ہے اور کیا فائدہ ایسی زندگی کا جس میں سکھ سکون اور من کی خوشی شامل نہ ہو......" اس نے لمبا توقف کیا اس دوران چائے اور کیک کی پلیٹ ان دونوں کے درمیان رکھی میز پر سج گئی ابھی تک وہ اس کی آمد کا مطلب و مقصد نہیں سمجھ پائے تھے۔

"چند روز پہلے اماں اور ابا کے درمیان زوردار معرکہ ہوا...... میری وجہ سے...... ابا بہت جذباتی اور فطرتاً جھگڑالو ہیں مسئلہ یہ ہے کہ اماں کا مزاج بھی کسی طور ان سے کم نہیں ہے اور میں ان دونوں جیسی تو نہیں البتہ ان دونوں سے زیادہ جذباتی ضرور ہوں...... ان دونوں کے کشیدہ تعلقات کا باعث میں تھی میرے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث تھی میرا دل چاہا میں اپنے آپ کو ختم کرلوں نہ میں ہونگی نہ میرے والدین کے درمیان اس طرح جھگڑا ہوگا...... میں سخت اذیت میں تھی شاید ایسا کر بھی لیتی اگر میں خود کشی کرنے والی لڑکی وہ کہانی نہ پڑھ لیتی جو پچھلے ماہ سیارہ ڈائجسٹ میں چھپی تھی مجھے ایسا لگا انجانے میں آپ نے میرے حالات و جذبات کی عکاسی کردی ہے میں نے کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھایا بلکہ میں نے ایک اور اچھا کام یہ کیا وہ شمارہ جا کہ ابا کی اسٹڈی میں رکھ دیا...... اس بار وہ پھر ہولے سے مسکرائی تھی وہ جتنے دھیمے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولتی تھی مسکراتی بھی اسی طرح سے تھی وہ جو صمٌ بکمٌ اس کی بات سن رہے تھے یکا یک چونکے"

"ارے واہ...... پھر کیا ہوا" کہانی یکا یک دلچسپ ہوگئی تھی۔

"پھر...... ابا نے وہ کہانی پڑھی اور اس رشتے سے خود ہی انکار کردیا وہ جان گئے تھے کہ زور زبردستی سے کیے جانے والے رشتے پائیدار اور دیرپا ثابت نہیں ہوتے نہ ہی وہ سودمند رہتے ہیں اور وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ میرے دل کی خوشی کیا ہے...... حشمت صاحب آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ میں دن رات کس قدر ٹینشن اور ذہنی اذیت میں تھی میرے پاس تیسرا کوئی راستہ نہیں بچا تھا آگ کا کنواں میرے آگے اور پیچھے تھا نہ تو میں اپنے ماموں زاد سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں نہ ہی ابا کے دوست کے اوباش بیٹے سے...... اور جس وقت میں ناامید ہوچکی تھی اس وقت انجانے میں آپ میرے مسیحا بنے میں اکثر سوچتی ہوں اگر اس روز میں آپکی کہانی نہ پڑھتی ٹینشن سے چھٹکارا پانے کے لیے تو آج گناہ کبیرہ کی مرتکب ہوچکی تھی...... آپ کا بہت بہت شکریہ آپ اپنے قلم سے معاشرے کی اصلاح کررہے ہیں آپ واقعی قلم کا حق ادا کرنا جانتے ہیں...... چلتی ہوں انشاءاللہ زندگی نے موقع دیا تو دوبارہ ملاقات ہوگی" وہ اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اس کی

چائے کی آدھی پیالی ویسے ہی رکھی تھی۔

''ارے آپ ایسے نہیں جا سکتیں ام کلثوم...... چائے کی پیالی تو ابھی آپ نے خالی کی ہی نہیں اور کیک کو تو چکھا تک نہیں...... اور مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع بھی نہیں دیا آپ نے...... وہ اسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے مسکرائے تھے ام کلثوم نے استفہامیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے وہ سمجھ رہی تھی۔''

''ایک قلم کار کی تحریر سے اگر کوئی مثبت اور روشن پہلو سیکھ کر اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیتا ہے تو اس سے بڑی بات کسی بھی قلم کار کے لیے ہو ہی نہیں سکتی اور اگر کسی قلم کار کی تحریر کسی کی جان اور زندگی بچانے کے کام آ سکے تو یقیناً یہ اس سے بھی زیادہ بڑی بات ہو گی کیونکہ روزن اور مثبت سوچ بھی کوئی کوئی ہی سیکھتا ہے اور میرے لیے آج خوشی کا دن ہے کہ میری سوچ کسی کے کام آ سکی......'' انہیں حقیقتاً خوشی ہوئی تھی ام کلثوم جیسی خوبصورت سلجھی ہوئی لڑکی کی جان صرف ان کی وجہ سے بچی تھی وہ جو بہت زیادہ جذباتی تھی اگر جذبات میں آ کے کوئی ایسا انتہائی قدم اٹھا لیتی تو اس نقصان کی بھرپائی کون کر پاتا بدنامی و رسوائی الگ ہوتی اور ہمارے معاشرے کے رائج کردہ اصول ایسی جذباتی غلطیوں کی معافی نہیں دیا کرتا بلکہ ایسی غلطیوں کی سزا نسلوں تک چلتی ہے۔

''ام کلثوم آپ نے آج کے دن مجھے بے پناہ خوشی دی ہے...... میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ نے میرے لکھے ہوئے لفظوں کو عزت بخشی ان پر عمل کر کے آپ نے مجھے معتبر کیا ہے میں یقیناً بہت خوش نصیب ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لکھے لفظوں میں اتنا اثر رکھا ہے...... انہوں نے نہایت عاجزی و انکساری سے کہتے ام کلثوم کو متحیر کیا تھا اتنا نامور لکھاری اور غرور نام کو بھی نہیں تھا محبت و اخلاص کی چاشنی جس کی پور پور سے ٹپکتی محسوس ہو رہی تھی اس بات کا اظہار ام کلثوم نے فوراً کر بھی دیا تھا اس کی بات سن کے وہ ہولے سے مسکرائے تھے سامنے ٹیبل پر دھری کیسیٹ کی ڈبیہ اٹھائی اور ایک سگریٹ نکال کر عنابی لبوں میں دبایا......''

''غرور کس بات کا کروں...... میرے پاس ایسا کیا ہے جو رب تعالیٰ کی رحمت کے بغیر میں نے حاصل کیا ہو...... یہ سب نام عزت پیار اور شہرت میرے رب تعالیٰ کی عطا ہے جس کو غرور پسند نہیں اور میں اس ذات واحد کا شکرانہ ادا کروں یہ بری بات ہے'' ام کلثوم نے ان کے جواب سے متاثر ہو کر انہیں اپنی پسندیدگی کی سند بھی بخش دی تھی۔

''پہلے میں صرف آپ کی تحریروں سے متاثر تھی مگر آج آپ سے مل کر یہ احساس ہو رہا ہے کہ آپ خود اپنی تحریروں سے بھی زیادہ اچھے ہیں بہت پیارے دل کے مالک ہیں میں آپ سے بہت متاثر ہوئی ہوں اگر زندگی نے موقع دیا تو ہم دوبارہ ضرور ملیں گے......'' اٹھتے سے تقریباً ان کے ساتھ ڈھائی گھنٹے گزارنے کے بعد اس نے اعتراف کیا تھا وہ اٹھی تو حشمت زیدی بھی اس کی تعظیم میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''مجھے بھی بہت اچھا لگا ام کلثوم اور میں چاہوں گا کہ ایسا موقع زندگی ہمیں بار بار دے......'' انہوں نے بھی دل کی بات کہنے میں

تامل سے کام نہیں لیا تھا ام کلثوم نے یکلخت اپنی بے پناہ حسین نگاہیں ستفامیہہ انداز میں ان کے چہرے پر جمائیں اور وہ بس ایک لمحہ جس میں وہ قید ہو گئے تھے ام کلثوم کی نگاہوں کا کیوپڈ ان پر اس انداز میں گرا کہ وہ چاروں شانے چت ہو گئے محبت نے انہیں گھائل کر دیا تھا۔

☆☆☆

اس کی زندگی محرومیوں اور تشنگی کا حاصل جمع تھی......شعور کی آنکھ کھولتے ہی اس نے اپنی نانی ماں کا چہرہ دیکھا تھا واحد ایک وہ رشتہ تھا جس نے اس کے ہمیشہ ہی لاڈ اٹھائے تھے......اس نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا......مگر ماں کے پاس ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ رہنے کے باوجود اسے ماں کی ممتا اور اس کی گرم آغوش کبھی نصیب نہیں ہو پائی کس قدر دکھ کی بات تھی اسے ماں کا پیار کبھی نہیں ملا کس قدر دلخراش بات تھی اسے باپ کا ذکر تک نہیں کرنے دیا گیا کبھی اس کا نام پتہ نہیں بتایا گیا اس نے اپنے ماں کو اکثر ہی اکیلے بیٹھے روتے اور چلاتے دیکھا تھا......وہ ہذیانی کیفیت میں چیخنے چلانے لگتی تھیں......اس کی ماں ایک بے حد حسین عورت تھی مگر اس نے کبھی بھی اپنی ماں کو خوبصورت اور سجا سنورا نہیں دیکھا تھا وہ جوان تھی، خوبصورت اور حسین بھی مگر اپنے حسن سے کسی قدر بے پرواہ بھی جبکہ اس کی نانی ماں سانولی سلونی مگر پرکشش خاتون تھیں اور کچھ انہیں پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی خوب آتا تھا وہ ہر وقت خوب سجی سنوری رہا کرتی تھیں سفید موتیوں کی مالا ان کے گلے میں ہمہ وقت ڈالی ہوئی ہوتی تھی بالوں کا اونچا جوڑا جس میں وہ باقاعدگی سے چنبیلی اور موتیے کے پھول گوندھا کرتی تھیں ان کی شخصیت بہت متوازن اور دلفریب سی تھی نانی کی آغوش میں رہ کر اسے ہمیشہ ہی ایک سکون اور معطر سا احساس اپنے حصار میں گھیرے رکھتا تھا وہ خود کو مسحور سا محسوس کرتی۔

اس نے شعور کی آنکھ کھولی تو خود کو اسی بڑے سے گھر میں بالکل تنہا پایا تھا دو کنال کا خوبصورت اور بڑا گھر جس میں گنتی کے تین نفوس اس کے علاوہ رہتے تھے اس کے ابا میاں، نانی ماں اور اس کی اپنی وہ ماں جس نے اسے جنم دیا تھا......ابا میاں تو اس کی ماں کی طرح سے کم گو سے ہی تھے اور ماں کو بولتے اور ہنستے اس نے کبھی دیکھا نہیں حالانکہ اس کی اچھی خاصی حسرت بن گئی تھی کہ وہ ماں کو ہنستا بولتا یا زندگی کے جھمیلوں میں دلچسپی لیتا دیکھے......مگر اس کی یہ حسرت ہمیشہ حسرت ہی رہی تھی۔ وقت نے اس کی محرومی پر مرہم نہیں رکھے بلکہ اس کے دکھوں کو ناسور بنا دیا تھا......ابا میاں کا وجود دم غنیمت اس کے لیے اس قت بنا جس وقت وہ چار برس کی تھی......ایک روز وہ آفس سے واپس آئے تھے گرمی زوروں پر تھی اور گھر میں کوئی بھی نہیں تھا وہ آتے ہی صوفے پر بے دم ہو کے لیٹ گئے تھے......وہ اب ان سے ڈرنے اور بدکنے لگی تھی جب اس نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تھا وہ ان کے قدموں سے اکثر ہی آ کے لپٹ جایا کرتی تھی مگر ابا میاں بہت غصے سے اسے جھٹک دیا کرتے ان کا انداز اس کے معصوم فہم سے بالاتر تھا نانی البتہ چپکے چپکے آنسو ضرور پونچھا کرتی تھیں مگر وہ ڈیڑھ برس کی پھول بھر معصوم بچی اکثر ہی ان کی توجہ حاصل کرنے کو ان کی طرف لپکتی ویسے بھی بچوں کی یہ فطرت ہوتی ہے جس چیز سے انہیں روکا جائے وہ اسی کی جانب بار بار لپکتے ہیں تجسس کے مارے وہ بار بار اسے چھونے اور جانچنے کی تگ و دو کرتے ہیں بالکل اسی طرح جو لوگ ان سے

پیار نہیں کرتے وہ ان کی توجہ حاصل کرنے کو ان کی طرف از خود بڑھتے ہیں اور بار بار بڑھتے ہیں مگر اس روز اس کی قسمت نے کروٹ لی تھی ابا میاں شدید گرمی میں لاؤنج کے صوفے پر لیٹے تھے اور آنکھوں کی بند پتلیوں کو داہنے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے ہولے ہولے دبا کر سہلا رہے تھے انہوں نے دو تین بار ملازم کو آوازیں دی تھیں مگر شاید وہ اپنے کوارٹر میں تھا نانی اماں گھر سے باہر تھیں اور اس کی ماں تو کمرے سے نکلا ہی نہ کرتی وہ تو باہری دنیا سے اس قدر غافل تھیں کہ انہیں خبر ہی نہیں ہوتی تھی کہ گھر میں کیا چل رہا ہے...... ابا میاں کو شدید پیاس لگی تھی اور وہ اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ ان میں اٹھ کر کچن سے پانی پینے کی سکت تک نہیں تھی......

''شرفو...... پانی لاؤ...... کہاں مر گئے ہو سارے، آخری بار انہوں نے خشک حلق کو تر کرتے قدرے چلا کر کہا تھا مگر کوئی نہیں آیا تھا مگر اتنا سا چلانے سے ہی ان کا حلق مزید سوکھ گیا تھا گرمی کی وجہ سے ان کا بی پی بہت گر گیا تھا انہیں اس وقت طوری طور پر گلوکوز کی ضرورت تھی مگر انہیں تو پانی پلانے والا بھی کوئی نہیں تھا ان کی آنکھیں غنودگی سے بند ہو رہی تھیں وہ بلڈ شوگر کے مریض تھے اکثر ہی ان کا بلڈ شوگر لیول گرا رہتا ایسے میں ان کی آنکھیں انجانے وزن سے بند ہونے لگتیں بی پی خطرناک حد تک گر جایا کرتا انہیں فوری طور پر کسی میٹھی چیز یا گلوکوز کی ضرورت پڑا کرتی انہیں لگا وہ مر رہے ہیں ان کا آخری وقت بس قریب ہی تھا جبھی ان کے گھٹنے کو کسی نے بہت نرمی اور آہستگی سے چھوا تھا ان کی آنکھیں کھل نہیں پا رہی تھیں مگر انہوں نے بنا جنبش کے اپنے ہونٹوں کو ہلا کر پانی مانگا تھا''

''نانا...... پانی'' چار سالہ وہ ننھی بچی فریج سے پانی کی بوتل نکال کر لائی تھی اس کے قد سے کچن کاؤنٹر کہیں اونچا تھا اسی لیے وہ گلاس نہیں اٹھا پائی مگر وہ پانی لے آئی تھی وہ بچی جس کی طرف وہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے...... وہ بچی جو انہیں اپنی اور اپنی بیٹی کی دشمن محسوس ہوتی تھی وہ بچی جس کا بے ضرر وجود وہ اپنے گھر میں بمشکل تمام برداشت کیے ہوئے تھے جس کی بے ضرر ذات کو وہ نفرت و تحقیر کا نشانہ بنا کر اپنی انا کو تسکین پہنچایا کرتے تھے وہ بچی انہیں پانی پلا رہی تھی اس وقت جب انہیں محسوس ہوا کہ ان کی موت بس ہوا ہی چاہتی ہے کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ قطعاً اس کے ہاتھ سے پانی لے کر نہ پیتے مگر اس وقت انہوں نے ساری بے زاری، بے اعتنائی و نفرت پرے دھکیلتے بوتل تھام کر پانی کے بڑے بڑے گھونٹ حلق کو تر کرنے کے لیے منہ میں انڈیلے تھے انہوں نے وہ ساری بوتل تین سانس میں خالی کرنے کے بعد باقی بچا پانی منہ اور گردن پر ڈال لیا تھا اور پھر بے دم ہو کے صوفے پر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے لیٹ گئے تھے...... وہ ان کے پاس ہی کھڑی رہی تھی اور تفکر سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''نانا...... آپ ٹھیک ہو، بہت دیر بعد اس نے ان سے پوچھا تھا وہ بہت حساس بچی تھی اور سمجھ دار بھی ابھی دو ماہ پہلے ہی اس نے مونٹیسوری سکول جانا شروع کیا تھا اس نے اپنی ذہانت اور سمجھ داری سے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ اس کے نانا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے انہوں نے اس کے سوال پر نہیں اس کے انداز تخاطب پر آنکھیں کھولی تھیں یہ لفظ اور یہ رشتہ ان کے لیے انجانا نہیں تھا لیکن اس بچی کے پاس اس رشتے کا حق جتانے کی ضرورت ان کی طرف سے ابھی درکار نہیں تھی......''

''دبادوں'' وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان کی پنڈلیوں کی طرف بڑھی اپنے پھول جیسے وجود کا سارا بوجھ ڈال کر وہ انہیں دبانے لگی انہوں نے سکون سے آنکھیں موندلی تھیں اس نے از خود ہی ان کے بغیر تسموں والے بوٹ اتارے تھے اس کا معصوم بے ضرر لمس ان کے وجود میں سکون بھرتا جارہا تھا انہیں یوں لگ رہا تھا گویا کوئی ان کے منہ سے مے کے جام لگا رہا ہے ان کے اندر سکون ہی سکون تھا اطمینان ہی اطمینان فرحت بخش، دل آویز اطمینان......

بے زاری، نفرت، بے اعتنائی غسہ کوئی دکھ اس وقت اس احساس پر حاوی نہیں ہوسکا تھا بس ایک احساس ان سب پر غالب تھا کہ اگر آج یہ بچی انہیں بروقت پانی نہ پلاتی تو شاید وہ مرچکے ہوتے پیاس کی شدت نے انہیں نڈھال کردیا تھا وہ صحیح معنوں میں بے بس ہوگئے تھے......

''بس کرو بیٹا...... تھک جاؤ گی'' پندرہ منٹ وہ انہیں مسلسل دباتی رہی تھی اور وہ آنکھیں موندے لیٹے رہے تھے یکا یک انہیں احساس ہوا کہ وہ تھک گئی ہوگی وہ معصوم سی بچی انہیں اپنی ہمت وطاقت سے بڑھ کے دبارہی تھی ان کے دل میں پہلے اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوا جو آنے والے دنوں میں محبت کے سوتے میں بدل گیا۔

''میں اچھی بچی ہوں میں نہیں تھکتی'' اس نے اپنے معصوم سے انداز میں شرما کر مسکرا کر کہا تھا اس کی آواز اور لہجہ بہت صاف اور دھیما تھا انہیں بے ساختہ اس پر پیار آیا۔

''اچھا...... کیا اچھے بچے تھکتے نہیں'' انہوں نے بس ویسے ہی پوچھ لیا تھا اس وقت انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوسکا کہ انہیں اس کے جواب نے متاثر کیا تھا۔

''نہیں...... اس نے فوراً تردید کی تھی، نانی اماں کہتی ہیں جو بڑوں کا کہنا مانتے ہیں وہ ہمیشہ خوش رہتے ہیں وہ کبھی بیمار نہیں پڑتے وہ کبھی نہیں تھکتے'' ان کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی تھی وہ اکثر اپنی نصف بہتر کے منہ سے سنتے آرہے تھے کہ وہ بہت ذہین بچی ہے باتیں ہمیشہ یاد رکھتی ہے تبھی اچانک انہیں یاد آیا یہ بات تو سکول کا ہوم ورک کرواتے اس کی نانی اسے اکثر سمجھایا کرتی ہے۔

''آپ واقعی میں بہت اچھی بچی ہو'' انہوں نے اعتراف کرنے مین مزید تاخیر نہیں کی تھی کیونکہ پہلے ہی کافی تاخیر ہوچکی تھی...... اس کے بعد اس گھر کی فضا میں واضح طور پر تبدیلی آئی تھی اب نانی اماں کے ساتھ ساتھ نانا بھی اس کے لاڈ اٹھانے لگے تھے وہ ان کی فرمائش پر انہیں ابا میاں کہنے لگی تھی وہ ابا میاں کی چہیتی تھی نانی کی لاڈلی تھی مگر ماں نے ساری زندگی اس کے وجود سے لاپروائی برتی تھی وہ اپنے غموں میں اس قدر الجھی رہی ساری زندگی کہ اپنی عمر رائیگاں کردی پھر اپنی بچی کی کیا پرواہ کرتی...... اس کے اندر ضد ہٹ دھرمی اور غسہ تھا مگر وہ صابر تھی اس میں اس قدر خوبیاں تھیں کہ اس کی خامیاں معنی ہی نہ رکھتی تھیں وہ ایک مثبت سوچ کی حامل ایثار پسند لڑکی تھی جو خود سے زیادہ دوسروں کی خوشی کا خیال کرتی تھی اور کیسی عجیب لڑکی تھی۔ کم از کم آج کے دور میں تو نایاب ہی تھی۔

☆☆☆

اس کا پوائنٹ مس ہو گیا تھا...... بلیک جینز کی پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر اس نے بٹوہ نکالا تو وہ خالی تھا...... اسے اپنے لاپروائی پر جی بھر کر غصہ آیا والٹ میں اے۔ ٹی۔ ایم اور کریڈٹ کارڈ رکھ کر وہ یہ بھول جاتا تھا کہ پاکستان میں ہر جگہ کریڈٹ کارڈ اور اے ٹی ایم کی سہولیات میسر نہیں ہیں کافی جگہ پر کیش کی ضرورت بھی ہوتی ہے...... اب وہ کسی ٹیکسی یا رکشے کو نہیں روک سکتا تھا اور اس کا کالج اس کی کالونی سے بہت دور تھا...... وہ پریشان سا خود کو کھڑا کوس رہا تھا اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا کر سکتا تھا...... وہ کالج سے باہر نکل آیا فٹ پاتھ چمکیلی دھوپ سے چمک رہی تھی مگر وہ اس کی تپش کا اندازہ دور سے ہی لگا سکتا تھا سو وہ کالج کے باجر جو کالج کیمپس زیادہ تھا برگد کے درخت یک پاس کھڑا ہو گیا تھا ابھی وہ اپنے کسی دوست کو فون کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اسے دور سے ایک لڑکی اپنی طرف آتی دکھائی دی تھی اسے کچھ امید بندھی...... وہ ایک سرو قد، نازک سراپے والی خوبصورت لڑکی تھی اس کے بال بے تحاشہ چمکدار اور کالے تھے سیاہ...... جسے اس نے ہلکی ڈھیلی پونی سے باندھ رکھا تھا...... وہ اسے دیکھ کر یکلخت مسکرایا...... یہ وہی لڑکی تھی جو بلا ناغہ تواتر کے ساتھ اس کا وائلن سننے آتی تھی مگر وہ اسے آج غور سے دیکھ رہا تھا بلاشبہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

”کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں“ وہ خوبصورت چہرے پر مسکراہٹ سجائے بہت اپنائیت سے پوچھ رہی تھی دور سڑک پر اس کی گاڑی کھڑی تھی اور شاید وہ اسے یہاں کھڑا دیکھ کر ہی آئی تھی یوں جیسے وہ اس کی مجبوری سمجھ گئی ہو۔

”آپ میری کیا مدد کر سکتی ہیں“ اس کے سوال پر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا ابھی ان کے درمیان جان پہچان نہیں تھی وہ دونوں ایک دوسرے کا نام تک نہیں جانتے تھے پھر بھی وہ اس کی مدد کر رہی تھی اسی لیے اس نے اس سے پوچھا تھا...... وہ متانت سے اس کے سوال پر مسکرائی تھی۔

”آج شہر بھر میں ٹریفک کی ہڑتال ہے...... جو ہمارے کیمپس کے چند ایک پوائنٹس تھے وہ بھی کب کے نکل گئے میں نے بھی گھر سے ڈرائیور کو بلوایا ہے...... اور شاید آپ کا بھی پوائنٹ مس ہو گیا ہے اور کسی رکشے یا ٹیکسی کے منتظر ہیں...... میں اسی لیے یہاں آئی ہوں کہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو ڈراپ کر سکتی ہوں“ اس نے اپنی بات ختم کی تو اسے یاد آیا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے سڑک اس وقت غیر معمولی رش سے خالی تھی وہ کیش کے چکر میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ خالی سڑک کی طرف دھیان ہی نہ گیا تھا اسے بے ساختہ اس لڑکی کی اچھائی دل کو بھائی......

”تھینکس مس...... مگر ہو سکتا ہے میرا اور آپ کا روٹ الگ الگ ہو......“ وہ نیم رضامند سا تامل سے کہہ رہا تھا کیونکہ اگر شہر میں ہڑتال تھی تو پھر وہ شام تک کھڑا رہتا اسے کوئی سواری نہیں ملنی تھی۔

”اس کی فکر آپ بالکل بھی مت کریں مجھے اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا...... اتنا کہہ کہ وہ فٹ پاتھ کی سمت بڑھ گئی تھی سو اسے بھی اس کے پیچھے چلنا پڑا تھا۔“

”آپ وائلن بہت اچھا بجاتے ہیں کہاں سے سیکھا آپ نے“ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا تھا

اس کی بات سن کے وہ دلکشی سے مسکرا دیا تھا۔

"وائلن بجانا میرا شوق ہے اور میں نے اسے کہیں سے باقاعدہ نہیں سیکھا وہاں ابتدائی ٹریننگ فیوژن بینڈ سے کی تھی وہ بھی تھوڑی بہت......زیادہ نہیں' وہ بھی اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا جس کے چہرے کی کوملتا اسے بہت دلکش بنا رہی تھی۔

"مجھے وائلن سننا بہت پسند ہے انفیکٹ آپ بہت اچھا بجاتے ہیں میں ہر روز سنتی ہوں آ کے جب آپ کینٹین کے پاس والے شیڈ کے نیچے بجاتے ہیں کیا یہ سانگ آپ کا بہت پسندیدہ ہے جسے آپ وائلن پر بجاتے ہیں"

"جی...... مجھے یہ بہت زیادہ پسند ہے یہ ہے ہی اتنا اچھا اور جتنے بھی سنگرز نے وائٹ لائن بینڈ کے علاوہ نے گایا ہے ان سب کے ورژن میرے پاس ہیں اور میڈونا نے بھی تو اس کو بہت اچھا گایا ہے کیا آپ کو یہ گانا پسند نہیں، وہ جو بہت غور سے اس کی بات سن رہی تھی یکدم چونکی اور پھر مسکرادی"

"یہ گانا مجھے وائلن پر بہت پسند ہے اب...... مجھے نہیں پتہ تھا کہ کوئی وائلن اس قدر خوبصورت بجا سکتا ہے اور کوئی گانا اس قدر خوبصورت بھی ہو سکتا ہے پتہ نہیں اب اس میں کمال کس کا ہے وائلن کا یا اس گانے کی شاعری کا......" وہ یہ نہیں کہہ سکی کہ وائلن بجانے کا کمال بھی ہو سکتا ہے۔

"کیا آپ وائلن سیکھیں گی" اچانک ہی اس نے کسی انجانے خیال کے تحت پوچھا وہ خود بھی نہیں جان سکا کہ وہ ایسی آفر کیوں دے رہا ہے ابھی چند منٹ پہلے جس لڑکی سے اس کی شناسائی ہوئی ہے اور تا حال جس کا وہ نام بھی نہیں جان پایا وہ اسے وائلن سکھانے کی پیش کش کیوں کر رہا تھا۔

"آپ مجھے سکھائیں گے" وہ بھی اتنا ہی حیران ہوئی تھی......کیا ایسا ممکن تھا کہ اسے اس شخص کے قریب رہنے کا موقع ملے......وہ دم بخود ہو گئی جب اس نے سر کرا اثبات میں جنبش دی تھی۔

☆☆☆

وہ جلدی جلدی تیار ہو کے باہر نکل رہی تھی کہ اسے امی جان کی آواز نے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو ام کلثوم......کاندھے پر موجود بیگ پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی بے ساختہ اسے پلٹنا پڑا"

"مائرہ کے گھر امی جان" اسنے نگاہیں جھکا لیں تھیں مبادا آنکھوں میں تحریر غلط بیانی کی خو ماں پا نہ لے......

"مائرہ کے ہاں تمہارے چکر بہت بڑھ گئے ہیں......خیرت تو ہے ناں؟" وہ اسے جانچ رہی تھیں کڑی نگاہوں سے......ام کلثوم کی ہتھیلیاں پانی سے نم ہو گئیں۔

"سب خیر ہے امی جان......بس آج کل امتحانات سے فارغ ہیں تو اس کی والدہ سلائی کڑھائی سکھا رہی ہیں میں بھی جا کر

وہاں تھوڑا بہت سیکھ لیتی ہوں'' بروقت اسے بہانہ بالآخر سوجھ ہی گیا تھا۔

''تمہیں کب سے شوق ہو گیا ان سب چیزوں کا تمہیں تو یہ سب خرافات لگتی تھیں......وہ ہلکا سا مسکرائی تھیں تو اس کی بھی جان میں جان آئی تھی۔''

''مائرہ کی امی کہتی ہیں کہ لڑکیوں کے پاس ہر قسم کا ہنر ہونا چاہیے تاکہ وقت پڑنے پر انہیں کسی معجزے کا انتظار نہ کرنا پڑے وہ خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں وہ مائرہ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی سکھا دیتی ہیں......وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جھوٹ بول رہی تھی اور کس قدر مہارت سے بول رہی تھی بیٹی پر اندھا اعتماد رکھنے والی ماں کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ بیٹی کی آنکھوں میں دیدہ دلیری واضح دکھنے لگی ہے وہ کسی اور راہ کی مسافر بن گئی ہے جہاں سے ایک الگ نگری کا آغاز ہوتا ہے اور جس کا راستہ جھوٹ کی راہ سے گزرنے کے بعد ملتا ہے''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے ام کلثوم......مائرہ کی امی کا میری طرف سے بھی شکریہ ادا کرنا......وہ بیٹی کو امور خانہ داری میں حصہ لیتا دیکھ کے آسودگی سے مسکرائی تھیں''

''جی......جی ضرور امی جان......'' ماں کو یقین دلاتی وہ تیزی سے باہر نکلی تھی، پاک ٹی ہاؤس پہنچتے پہنچتے اسے کافی دیر ہو گئی تھی اور حشمت زیدی اس کے انتظار میں کھڑکی سے باہر جھانک جھانک کر دیکھتے اب تھک گئے تھے......اتنی دیر پہلے تو کبھی بھی ام کلثوم کو نہیں ہوئی تھی جتنی دیر اسے آج ہو گئی تھی......اپنی بے چینی پر انہیں خود بھی حیرت ہوئی وہ کس قدر مضطرب ہو گئے تھے وہ بے ساختہ مسکرائے......وہ تو خود کو بہت مضبوط سمجھتے تھے انہیں لگتا تھا کہ کوئی لڑکی انہیں متاثر نہیں کر سکتی مگر ان کی یہ بھول تھی ام کلثوم نے سیدھا ان کے دل پر وار کرتے انہیں گھائل کر دیا تھا بہت جلدی وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔

''کہاں رہ گئی تھیں ام کلثوم......'' اسے پاک ٹی ہاؤس کے کشادہ مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ بے چینی سے اس کی جانب بڑھے تھے ام کلثوم نے رک کر سانسوں کی ترتیب درست کی اور مسکرائی۔

''کچھ نہ پوچھیں......آج تو امی جان نے پوچھ لیا کہ کہاں جا رہی ہو......بمشکل انہیں مطمئن کر کے آئی ہوں......'' وہ پسینہ پونچھتے ہوئے بولی تو حشمت زیدی ٹھٹک کر رک گئے

''ایسا کب تک چلے گا......'' کچھ دیر بعد چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتے انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا یہ سوال کمال حیرت کہ بہت جلدی ان دونوں کے درمیان آ گیا تھا ام کلثوم پانی پی رہی تھی اور پانی کا گھونٹ حلق سے اتارتے اس نے منہ کو بائیں ہاتھ کی پشت سے عادتاً صاف کیا۔

''مطلب'' اس نے گلاس سفید پتھر کی چوکور میز پر رکھ دیا اور ابرو اچکائے۔

''ام کلثوم......کیا ہمارے درمیان ابھی بھی کچھ کہنے سننے کو رہ گیا ہے......مجھے تو یہ لگتا تھا کہ تم میرے جذبات کو نہ صرف سمجھتی ہو

بلکہ ان کی قدر بھی کرتی ہو' ان کے لہجے سے ان دیکھا سا دکھ جھلکنے لگا۔

''حشمت......آپ کیا کہہ رہے ہیں ......جتنی محبت آپ مجھ سے کرتے ہیں میں اس سے کہیں زیادہ کرتی ہوں کیسے یقین دلاؤں آپ کو......کیا دل کاٹ کے رکھ دوں اس میز پر آپ کے سامنے......'' حشمت زیدہ کے دل پر پھوار سی برسی اقرار کا خمار ہی ایسا تھا اور ان کا بے ساختہ دل چاہا کہ سامنے براجمان کو کبھی زوال نہ ہو۔

''مجھے تمہارے خون جگر کے ٹکرے نہیں چاہئیں ام کلثوم ......مجھے تمہارا ساتھ چاہیے'' انہوں نے اچانکل بالکل اچانک اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔ ام کلثوم کے گرد زندگی قوس وقزاح کے رنگ برسانے لگی رنگوں کی بارش ہونے لگی جس میں پور پور وہ بھیگنے لگی تھی۔

''تو آپ کو ابھی بھی شک ہے کہ ہم ایک نہیں ہوں گے'' وہ محبت کے رنگوں میں بھیگنے کے بعد دلفریب انداز میں مسکرائی تھی۔

''مجھے اپنے نصیب سے ڈر لگتا ہے ثومی......میں تمہیں کھونے سے ڈرتا ہوں......مجھے نہیں لگتا کہ تمہارے والدین مجھ جیسے کنگلے کا رشتہ قبول کریں گے اور وہ واقعی جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے انہیں سچ میں یہ خوف دن رات ستائے رکھتا تھا کہ وہ کسی بھی لحاظ سے ام کلثوم کے خاندانی میعار پر پورا نہین اترے تھے'' وہ لوگ خاندانی رئیس تھے اور اس کے والد ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج تھے روپے پیسے، نوکر چاکر اور دیگر مراعات کی ریل پیل تھی ام کلثوم بہت لاڈ اور ناز نخرے سے پلی بڑھی تھی انہیں ڈر تھا کہ کہیں ام کلثوم خود ہی انہیں چھوڑ نہ دے کیونکہ سوائے محبت کے ان کے پاس اس کے لیے کچھ قابل ذکر تھا بھی نہیں......

''ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ......'' وہ تو جیسے ایک دم تڑپ اٹھی تھی مجھے یقین ہے ابا جان آپ کی قابلیت اور شہرت کو دیکھتے ہماری شادی پر راضی ہو جائیں گے اور پھر ان کے لیے میری خوشی زیادہ مقدم ہوگی میں انہیں منالوں گی اسے تو جیسے یقین کامل تھا اور وہ جسے اس کی سادگی پر مسکرائے تھے اس طرح جیسے کوئی بچے کی سادہ معصومیت بھری کسی بات پر مسکراتا ہے۔

''ایک معمولی لکھاری ان کی بیٹی کے شایان شان نہیں ہوگا ثومی جان......جو چاندی کے برتنوں میں کھانے کی عادی ہو......وہ کسی طور پر بھی میرے دل کے نہاں خانوں میں گڑی تمہاری محبت کے شجر نہیں دیکھیں گے ایسی بصارت سے وہ محروم ہوں گے جس سے محبت کو جانچا یا ناپا جائے......ان کی نظر میں صرف دولت کا پیمانہ فٹ ہے......اور کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے پیسہ اس زندگی کی تلخ اور کڑی سچائی ہے، وہ آزردہ سے کہتے دلگرفتہ تھے''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا حشمت......وہ میرے والد ہیں اور میری خوشی ان کے لیے اہم ہونی چاہیے میں کسی بھی طرح انہیں منالوں گی......'' ام کلثوم خود بھی دل ہی دل میں پریشان ہوگئی تھی محبت کی جادونگری میں قدم رکھتے اس نے ان تلخ حقیقتوں سے پہلو تہی کیونکر برتی تھی وہ تو سمجھ ہی نہیں پائی اسے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ انہیں یہ مسائل بھی درپیش آسکتے ہیں۔

''خدا کرے کہ تمہارا مان نہ ٹوٹے ثومی جان......ورنہ مجھے تو دن رات چین وسکون نہیں ملتا......'' یہ خیال ہی سوہان روح ہے کہ

تم اگر مجھے نہ ملیں تو کیا ہوگا اور اگر سچ میں نہ ملیں تو مجھے نہیں لگتا کہ میں زندہ بھی رہ پاؤں گا اور میں سچ کہہ رہا ہوں ثومی...... اگر مجھے تم نہ ملیں تو زندگی بالکل میرے لیے بے معنی ہو کے رہ جائے گی۔

''اللہ نہ کرے حشمت...... آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں اللہ آپ کو میری عمر بھی لگا دے...... میں آپ کے ساتھ ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کا ساتھ کبھی کسی حال میں نہیں چھوڑوں گی...... چاہے جتنے بھی طوفان آئیں آپ ہمیشہ مجھے اپنے ہمقدم کھڑا پائیں گے آزما کے دیکھ لیں......'' ام کلثوم جی جان سے ان پر فریفتہ حد درجہ جذباتی ہو رہی تھی۔ حشمت زیدی نے آسودگی سے مسکرا کر اس کے بھولے خوبصورت چہرے کو دیکھا وہ بہت جذباتی لڑکی تھی ذرا سی محبت ملنے پر دل و جان وارنے کو قربان ہو جانے والی پھر اب تو مقابل حشمت زیدی تھے جو ان کی زندگی تھے...... اسی لیے تو اتنا بڑا وعدہ کر رہی تھی...... پاک ٹی ہاؤس کی بلند اور روشن عمارت نے ام کلثوم کا دعوی سنا اور محفوظ کر لیا ٹی ہاؤس کی عمارت ہمیشہ کے لیے ان کی محبت کی گواہ بن گئی تھی۔

☆☆☆

ملاقاتیں بڑھیں تو ایک دوسرے کے ساتھ کا اصرار اور وجاحت و خواہش بھی......

ہر ملاقات ام کلثوم کی محبت میں اگر اضافہ کرتی تو اضافہ حشمت زیدی کے جنون میں بھی ہوتا...... بلاشبہ صحیح معنوں میں وہ ام کلثوم کی زلفوں کے اسیر ہوئے تھے وہ ایک ایسی ساحرہ تھی جس نے انہیں ہر طرح سے اپنے بس میں کر لیا تھا کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئے تھے اس کے ساتھ کی چاہ کے علاوہ انہیں اپنی زندگی کا جیسے کوئی اور مقصد ہی نظر نہیں آتا تھا ام کلثوم کے زندگی میں آتے ہی ان کی زندگی کا نصب العین ہی بدل گیا تھا...... ہر چیز اپنے مقام پر تھی مگر پھر بھی سب کچھ بدل گیا تھا۔

علیم الدین اکثر انہی خیالوں میں گم بیٹھا دیکھ کر معنی خیز انداز میں کھنکھارتے...... حشمت زیدی جھینپ کر مسودے پر جھک کر یکسوئی سے لکھنے کی کوشش کرنے لگتے...... ایک واضح تبدیلی جو ان کی تحریروں میں آئی تھی ان کی تحریروں میں پہلے سے زیادہ شدت، طوفانی جذبے اور رومان پیدا ہو گیا تھا...... وہ سراپا محبت بن گئے تھے محبت کی بارش میں جب وہ پور پور بھیگے ان کے کردار سنسنی خیز اور ہیجان سے پر ہو گئے...... تحریر مہکنے لگی سب پڑھنے والوں کے دلوں میں جذبات و محبت کے حصول کے لیے سلگن کا جذبہ بیدار ہو کے بھڑکنے لگا۔

ان کی ہر تحریر کا انتساب ام کلثوم کے نام ہونے لگا اور ام کلثوم محبت کی فضا میں تتلی بن کے اڑتی رہتی۔

''بتائیں ناں...... آپ کب ملنے آئیں گے ابا جان کو......'' ام کلثوم اس روز ملنے آئیں تو زیادہ اصرار اسی بات پر تھا وہ اس کے بے تابی دیکھ کر مسکرا دیے اپنی جلد باز طبیعت کے پیش نظر وہ ہر کام وقت سے پہلے کر لینا چاہتی تھی صبر کا مادہ تو اس میں تھا ہی نہیں......

''ابھی کچھ وقت دو جان...... خود کو تمہارے ابا جان کے سامنے لانے کے لائق تو بنا لوں''

''کیا کمی ہے آپ میں...... جو آپ ایسی باتیں سوچتے ہیں فضول میں خود کو پریشان کرنے کا فائدہ۔ حتمی فیصلہ تو میرا ہی ہوگا ناں،

اس کا دوسرا بڑا مسئلہ بغیر سوچے سمجھے بولنا بھی تھا اور بلند و بانگ دعوے کرتے بھی وہی ہیں جو حقیقت کو سمجھتے نہ ہوں۔''

''اچھا...... وہ دل کھول کے ہنسے...... اگر تمہارے ابا نہ مانے تو...... تم مجھ سے پھر بھی شادی کرلو گی کیا......'' انہوں نے بس ویسے ہی اسے چھیڑنے کی غرض سے کہہ دیا تھا۔

''ہاں...... کرلوں گی'' ترنت جواب ملا تھا۔

''میرے حالات تمہارے ابا جیسے نہیں میں ایک سفید پوش بندہ ہوں جس کے پاس کوئی نوکری اور اپنا مکان تک نہیں ...... اعزازیے کی رقم پر گزارہ کرتا ہوں اور کرایے کے مکان میں رہتا ہوں......'' انہوں نے سچائی بتائی مگر ام کلثوم ان حقائق سے پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی اب...... وہ عشق کی راہ پر بہت آگے بڑھ چکی تھی۔

''میں گزارہ کرلوں گی اور ایک کمرے کے مکان میں بھی رہ لوں گی میرے لیے اہم صرف آپ کا ساتھ ہونا چاہیے۔ اس کا لہجہ رعب دار اور قطعی تھا''

''بتائیں ناں...... کب بھیج رہے ہیں اپنے گھر والوں کو......'' وہ بہت لاڈ سے ٹھنک کے پوچھ رہی تھی۔

''بہت جلد...... مگر اگر انہوں نے انکار کردیا یا میرے ماں اور بھائی کو برا بھلا کہا تو...... وہ لکھاری تھی ان کا مشاہدہ سمجھ بوجھ انہیں احساس دلاتی تھی کہ معاملہ اتنا سیدھا ہرگز نہیں جتنا ام کلثوم اسے سمجھے ہوئے ہے اور یہ کوئی کہانی بھی نہیں تھی جہاں وہ فرضی واقعات اور معجزات کا سہارا لے پاتے...... حقیقی زندگی میں معجزات بہت کم ہوا کرتے ہیں اور وہ بھی ولیوں کے ساتھ ہی رونما ہوتے ہیں اگر ہوں بھی تو......''

''کیوں ڈرا رہے ہیں مجھے...... زندگی مجھے تو اپنی مرضی سے گزارنی ہے اور ابا میرے ساتھ کبھی برا نہیں ہونے دیں گے پہلے بھی تو نہیں ہونے دیا تھا......'' ام کلثوم کے لہجے میں باپ کے لیے مان اور پیار تھا حشمت زیدی دل ہی دل میں ان کا مان سلامت رکھنے کی دعا کرنے لگے۔

☆☆☆

''حاشو...... اماں نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو سامنے حشمت زیدی کو خوشبوؤں میں مہکتا ہوا کھڑے دیکھا وہ بہت عرصے کے بعد وہاں آیا تھا غالباً یہی کوئی آٹھ نو ماہ پہلے وہ خالق کی شادی پر آیا تھا ماں اور بھائی نے ساری زندگی محنت کرکے تین دکانیں اور ایک چھوٹا سا مکان تعمیر کرلیا تھا حالات پہلے سے اچھے ہوگئے تھے لیکن انہوں نے کچی بستی کو نہیں چھوڑا تھا اور حشمت زیدی کو جی بھر کر کوفت ہوا کرتی وہ تو اب یہاں اس جگہ آنا پسند بھی نہیں کرتے تھے انہیں تو یہاں گندگی ہی گندگی نظر آتی تھی پورا علاقہ بدبودار محسوس ہوتا اپنی سانسیں متعفن زدہ محسوس ہوتیں''

''کیسی ہو ماں......'' خالدہ نے اس کا سر ماتھا بہت محبت سے چوما تو حشمت زیدی کو بھی نحیف و نزار ماں کی مامتا دل پر پڑتی

محسوس ہوئی تبھی انہوں نے بھی ماں کا حال احوال پوچھا تھا۔

"اب تجھے دیکھنے کے بعد بالکل بھلی چنگی ہوگئی ہوں" وہ آنکھوں میں آئی نمی کو بے ساختہ چھلکاتے محبت سے چور لہجے میں بولیں حشمت زیدی کا دل یکدم اس ماحول سے کھڑے کھڑے مکدر ہوگیا......اسے ماں کے آنسو ڈھکوسلے لگے۔

"بہت یاد کرتی ہوں اور تیرا انتظار تو دن رات رہتا ہے مجھے......اور تو تو اب بہت بڑا آدمی بن گیا ہے حاشو...... ہر روز تیرا اخبار میں چھپا فوٹو دیکھتی ہوں......" حشمت زیدی کے لبوں پر ایک بے دم مسکراہٹ نے دم توڑا وہ مسکرا بھی نہیں سکے۔

"جب میں نے کہا تھا کہ میرے ساتھ چل کے رہو تو پھر آئی کیوں نہیں تھیں اماں......" بہت پرانا مگر جان لیوا شکوہ لبوں پر مچل رہا تھا خالدہ بی بی نے سر جھٹکا وہ ابھی تک ان سے ناراض تھا خالق کی شادی کے بعد اس نے ماں کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی تھی بلکہ عادت کے برخلاف خاصا اصرار بھی کیا تھا مگر انہوں نے ساتھ چلنے سے انکار کردیا تھا ساری زندگی خالق نے ان کے ساتھ محنت کی تھی حاشو تو صرف اپنی تعلیم پوری کرنے میں جتا رہا تھا اور اب اس وقت جب خالق نئی زندگی کا آغاز کررہا تھا تو ماں ہونے کے ناطے وہ اپنے بیٹے اور بہو کے کچھ لاڈ اٹھانا چاہتی تھیں سو انہوں نے قصداً اسے منع کردیا تھا اور وہ ناراض ہو کے چلے گیا تھا اور اتنے عرصے کے بعد وہ آج آیا تھا ......ناراض اور روٹھا روٹھا سا۔

انہیں اس وجیہہ نوجوان میں وہی بچپن کا معصوم غصیلا اور ضدی حاشو نظر آیا جو چھوٹی چھوٹی بات پر کئی کئی دن تک ان سے ناراض رہا کرتا تھا اور تب تک نہ مانتا جب تک اس کا اپنا غصہ ختم نہ ہوجاتا اور اسکا اپنی جی صلح کرنے کو نہ چاہتا تو......اور آج وہ اتنے عرصے بعد آیا تھا تو وہ بھی اپنی مرضی سے......

"آؤں گی تیرے پاس رہنے کو......جب تو گھر میں بہو لے آئے گا تو......" ماں کے کہنے پر حاشو بے ساختہ مسکرادیا بالکل ویسے جیسے بچپن میں ماں اسے پسندیدہ کھلونا دلانے کے بعد اس کے چہرے کی مسکراہٹ دیکھا کرتی تھی ام کلثوم کا خیال ہی ان کا موڈ خوشگوار کر گیا تھا۔

"تو پھر تیاری کر اماں......تمہارا بیٹا بہت جلد بیاہ کررہا ہے اور تمہاری بہو مکھن ملائی سے بنی ہوئی ہے اتنی خوبصورت ہے کہ چاند بھی بادلوں کی اوٹ سے اکثر اسے چھپ چھپ کے دیکھتا ہے شاید اسے بھی یہ ڈر ہے کہ ام کلثوم کو دیکھنے کے بعد کہیں وہ خود پر ناز کرنا چھوڑ نہ دے......" وہ بے ساختہ مسکرائے تھے اماں کو باقی استعاروں کی زبان تو کیا سمجھ آنی تھی وہ تو بس اتنا ہی جان پائیں کہ لڑکی کا ام کلثوم ہے اور وہ بہت حسین ہے۔

"اچھا تو اسکا نام ام کلثوم ہے......" بیٹے کے چہرے پر پھیلی مسرت دیکھ کر انہوں نے اسے چھیڑا تھا وہ تو ان کا بہت لاڈلا بیٹا تھا مگر اکثر ہی ان سے نالاں رہتا تھا مگر وہ اس کی ناراضگی اور بدگمانی کبھی دور بھی نہیں کرپائی تھی شاید انہیں سلیقہ ہی نہیں آتا تھا یا شاید حشمت زیدی

ہی بہت مشکل انسان تھا"

"کب جاؤں تمہارا رشتہ مانگنے پھر....." وہ بیٹے کو محبت سے دیکھتے ہوئے چھیڑ رہی تھیں اسی اثناء میں خالق کی بیوی شربت کا جگ بنالائی تھی سانولی سلونی وہ ایک چھوٹے قد کی قدرے فربہی مائل عام سے نقوش کی مالک لڑکی تھی......حشمت زیدی نے بے ساختہ ہی ام کلثوم کے ساتھ اپنی بھابھی کا موازنہ کیا......ایک چودھویں کا چاند تھی جبکہ دوسری اماوس کی رات......خالق بھی عام نقوش کا چھوٹے قد کا مالک ہی تھا جبکہ حشمت زیدی قد کاٹھی اونچی اور مضبوط تھی......انہیں بے ساختہ برتری کا احساس ہوا......جو کہ کہیں نہ کہیں ہمیشہ سے ہی ان کے وجود میں رہتی تھی۔

"ابھی کچھ دن ٹھہر جاؤ اماں......تمہاری بہو بہت اونچے شملے والی ہے ایسے کیسے چلیں ان کے گھر رشتہ مانگنے" اماں نے تو بیٹے کی بات پر بے ساختہ دل پر ہاتھ رکھا تھا۔

"حاشو......اتنے بڑے گھر کی لڑکی ہماری بہو بننے پر راضی ہو جائے گی بھلا......" انہیں حیرت سے زیادہ صدمہ ہوا تھا اپنی مالی حیثیت سے خوب واقفیت رکھتی تھیں وہ بھی......

"وہ اگر بڑے گھر کی ہے تو تمہارا بیٹا بھی کسی سے کم نہیں ہے اماں......مہینے کے ڈھائی سے تین سو کما لیتا ہوں ایک کہانی کے ......زیادہ لکھوں تو پانچ سات سو آسانی سے مل جایا کرتے ہیں" انہیں ماں کی حیرت سے کہی گئی بات برہم کر گئی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا......مگر دنیا داری کے بھی تو کچھ تقاضے ہوتے ہیں کہ نہیں......اور لڑکی کو چھوڑ و اس کے والدین کو جو تسلی کرانی ہوگی ناں اور بڑے لوگ ہمیشہ اپنی بیٹیوں کو خود سے اونچے اور بڑے گھرانوں میں بیاہنا پسند کرتے ہیں اور میں یہ تو نہیں کہتی کہ تمہارے جیسے لڑکے کو وہ رشتہ نہیں دیں گے مگر بیٹا......ان کے خاندان میں تو تمہارے سے زیادہ قابل لڑکے ہوں گے......ماں نے دنیا دیکھی تھی ساری زندگی اس نے دنیا ریت رواج کی چکی میں پستے ہی تو گزاری تھی اس کا فہم اس کی سوچ ہر حال حشمت زیدی کے علم و مشاہدے سے زیادہ پختہ تھی حشمت زیدی وہاں سے بڑے بھاری دل کے ساتھ لوٹے......ماں نے کڑوی سچائی کا ایک نیا وار کیا تھا ان کے لیے......مگر یہ بھی طے تھا کہ انہیں ہار نہیں ماننی تھی نہ دنیا والوں سے نہ اپنے حالات سے......انہیں ام کلثوم کو حاصل کرنا تھا کسی بھی حال میں......اسی لیے تو انہوں نے وہ فول پروف پلان بنایا تھا تا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"

☆☆☆

دوسرے ہی دن وہ اس کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا......وہ کیمسٹری کی کلاس لے کر نکل رہی تھی اسے سیڑھیوں کے قریب کھڑے دیکھ کر بے ساختہ ٹھٹک کے رکی......

"السلام علیکم کیسے ہیں آپ......" وہ بے ساختہ خود ہی اس کی طرف بڑھی تھی۔

''وعلیکم السلام......میں ٹھیک ہوں کیا میں آپ کا تھوڑا وقت لے سکتا ہوں'' اس نے نہایت مودب سے انداز میں اس کی کومل و نرمل چہرے کی طرف دیکھتے پوچھا تھا تو وہ بے ساختہ مسکرا کر رہ گئی تھی پھر اثبات میں سر ہلا کر اس کے ساتھ کنٹین والے ایریے کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

''جی بتائیے......کیوں ملنا چاہتے تھے آپ مجھ سے......کینٹین کی کونے والی میز پر بیٹھے ہی اس نے پوچھا تھا اس وقت کینٹین میں غیر معمولی خاموشی تھی کیونکہ چھٹی کا وقت تھا اور سب اسٹوڈنٹس گھروں کو لوٹ رہے تھے''

''میں اصل میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کل والی فیور کے لیے......کل اگر آپ مجھے ڈراپ نہ کرتیں تو نجانے کیا ہوتا ......میرے انکل کی طبیعت اچانک بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی......کل جب میں گھر پہنچا تو وہ بے ہوش پڑے ہوئے تھے......مگر صد شکر کے میں بروقت پہنچ گیا......میں کل ساری رات آپ کے بارے میں سوچتا رہا اگر آپ اس وقت میری مدد کو نہ آتیں تو میں گھر کس قدر دیر سے پہنچتا اور نجانے اس وقت کیا......خدانخواستہ میرے منہ میں خاک......گھبراہٹ کے مارے وہ بات مکمل نہیں کر پایا تھا''

''اٹس اوکے......آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں آپ کے انکل ٹھیک ہو جائیں گے اور میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا جو آپ میرا شکریہ ادا کر رہے ہیں میں نے جو کچھ بھی کیا وہ انسانیت کے ناطے میرا فرض تھا'' وہ مبہم سا مسکرائی تو اس نے اس کے گالوں میں پڑے ڈمپل کی گہرائی کو محبت سے دیکھا، پھر اس کی بے پناہ خوبصورت آنکھوں کو۔

''کیا ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں......'' اچانک ہی اس نے پوچھا تھا لڑکی مدھم سا مسکرائی۔

''میرے خیال سے تو ہم دوست بن چکے ہیں......'' مسکراہٹ نے ابھی بھی اس کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا ہونٹوں میں شرارت مچل رہی تھی۔

''میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں'' وہ جھجک گیا تھا۔ مگر لڑکی بے ساختہ مسکرا دی تھی سب سے پہلے پوچھے جانے والا سوال وہ اب پوچھ رہا تھا۔

''میرا نام ارسہ ہے......'' لڑکی نے بالآخر اپنا نام بتا ہی دیا تھا۔

☆☆☆

ان دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ بہت خوبصورتی سے پروان چڑھا تھا دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو گئے تھے وہ اب بھی وائلن بجاتا ارسہ دم سادھے سانس روکے اب بھی سنتی مگر اب ایک فرق پیدا ہوا تھا وہ اب وائلن صرف ارسہ کیلئے بجاتا تھا۔

When i wake up everyday

with you lying in my arms

I wonder if i'm dreaming

when I look into ur eyes

I just can beleive its true

That my heart belongs to you

baby u can have it all

Take my hend and let me lead the way

All through your life

I ill be ur side

Till death do us part

وہ اکثر ہی ارسہ کو دیکھتے یہ مصرعے گنگنانے لگتا......ارسہ کو یقین ہو گیا کہ اس کی آواز کا صحر اس دنیا کی رنگینی و لطافت سے زیادہ خوبصورت ہے......وہ صرف وائلن ہی اچھا نہیں بجاتا تھا وہ گانا بھی بہت اچھا گاتا تھا وہ حوا کی بیٹی تھی جو آدم کے بچھائے محبت کے جال مں ہمیشہ کی طرح پھنس رہی تھی......مگر محبت کے دام میں الجھنے پر وہ بہت خوش مطمئن اور آسودہ تھی۔ محبت کا خوش رنگ جال ہوتا ہی اس قدر حسین اور مکمل ہے کہ دل خود بخود اس جال میں پھنسنے کو چاہنے لگتا ہے ارسہ بھی دام کی پکڑ میں آ کر خوش تھی......پورے کیمپس میں وہ ہاٹ ٹاپک بن گئے اکثر سٹوڈنٹس تو ارسہ کا بے تابی سے اس کے وائلن سننے کے وقت سے ہی یہ جانتے تھے کہ ان دونوں کی باؤنڈنگ ہو جائے گی اب وہی سٹوڈنٹس اپنے اندازے کی درستگی پر شاداں و فرحاں تھے جنہوں نے شرطیں لگائی ہوئی تھیں وہ شرط جیتنے پر ٹریٹس مانگ رہے تھے مگر وہ دونوں اس بات سے بے نیاز بس ایک دوسرے کی سنگت میں مخمور تھے ان کے لیے ایک دوسرے کی ذات اہم تھی ارسہ اس سے جونیئر تھی مگر اس کا آخری سال تھا ارسہ کو ابھی سے لگتا کیمپس جب وہ چلا گیا تب وہ کیا کرے گے......اس کے بغیر اس کے وائلن کے بغیر اس کا دل اس کالج میں نہیں لگے گا اور پوری زندگی کی جدائی کا تو اس نے تصور بھی نہیں کا ی تھا ہر محبت کرنے والے کی طرح اسے بھی اپنے اور اس کے وصال کا جیسے یقین سا تھا اور یہ یقین تقدیر پر نہیں اسے اپنے محبت پر تھا جو وہ اس سے بے تحاشہ اور بے حد و حساب کرتی تھی ارسہ نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا پہلی بار وہ اپنے دکھ کسی سے کہہ رہی تھی وہ تمام محرومیاں وہ تمام تشنگیاں جو اس نے ابا میاں اور نانی اماں کی بے پناہ محبت کے باوجود بھی محسوس کی تھیں ماں کی بے رخی بے اعتنائی اور باپ کی کمی کا دکھ......یہ سب پھوڑے کی مانند دکھتے دکھ......اس نے پیپل کی گھنی شاخوں کے نیچے بیٹھ کر اسے کہہ سنائے تھے......اپنے دکھ اسے سنا کر وہ روئی کے گالوں کی مانند ہلکی پھلکی ہو گئی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ مقابل اس کے دکھوں کا بار اٹھا پائے گا کہ نہیں وہ ایسی لڑکی کو اپنا سکے گا یا نہیں جس کا باپ اس کی ماں کو اس کی

پیدائش سے بھی پہلے چھوڑ گیا تھا اور جس کی ماں نے بعد کی ساری زندگی نیم دیوانی حالت میں گزاری تھی اور اس کی پرورش اس کے نانا اور نانی نے کی تھی مگر اس کے باپ کے متعلق اسے کبھی کچھ نہیں بتایا گیا تھا ارسہ جانتی تھی یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی یہ ایک بہت بڑی بات تھی مگر اسے جیسے یہ امید سی تھی کہ وہ اس حقیقت کا بار اٹھالے گا اور امید والی جگہ اکثر خالی ہوا کرتی ہے مگر دنیا کے سارے نظام ممکنات اور ناممکنات پر ہی ٹکے رہتے ہیں۔

☆☆☆

ام کلثوم یہ نہیں جانتی تھیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوا کرتے......غلط بیانی کرتے سمے اسے بھی خبر نہیں تھی کہ اس کا جھوٹ صرف ایک ڈیڑھ ماہ بعد ہی پکڑا جائے گا......اس روز بہت دنوں کے بعد مائرہ کی امی ان سے ملنے کیلئے آئی تھیں......مائرہ البتہ ساتھ نہیں تھی ورنہ وہ ہی شاید بات کو سنبھال لیتی......باتوں ہی باتوں میں انہوں نے ام کلثوم کے بارے میں پوچھا تھا کہ کافی دن ہو گئے وہ ان کے گھر مائرہ سے ملنے نہیں آئی تھی تبھی ام کلثوم کی والدہ نے کسی قدر حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہیں......وہ تو روز شام کو آپ سے سلائی کڑھائی سیکھنے کیلئے جاتی ہے......"

"میری طرف" مائرہ کی والدہ کو ازحد اچنبھا ہوا تھا۔

"نہیں......نہیں بہن......آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے......میری طرف آئے تو اسے بہت دن ہو گئے ہیں اور پھر میری تو نظر کا مسئلہ ہی بہت خراب ہے میری تو آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے میں تو سلائی کڑھائی کر ہی نہیں سکتی پھر سکھاؤں گی کیسے" انہوں نے تفصیل سے بتاتے امی جان کو شرمندہ کرنے کیساتھ ساتھ ازحد پریشان بھی کر دیا تھا جوان اور خوبصورت بیٹی اگر جھوٹ بولنے لگے تو اس کے معنی و مطالب بہت واضح ہوتے ہیں کہ وہ کسی غلط یا قابل مذمت راہ گزر کی مسافر بن گئی ہے......ان کے اندر بھی خدشات کے کالے ناگ پھن پھیلانے لگے وحشتیں ان کے اندر بسیرا کرنے لگیں جیسے تیسے انہوں نے اس وقت بات کو سنبھالا دیا مگر رات کو وہ ام کلثوم کے کمرے میں بہت طیش کے عالم میں آئی تھیں......وہ اس وقت ایس ٹی ڈی فون سیٹ اپنے کمرے میں چپکے سے لے آتی تھی اور رات گئے تک وہ حشمت زیدی سے باتوں میں محو رہا کرتی......ابھی بھی وہ ان سے بات کر رہی تھی جبھی اس کی والدہ کمرے میں غیض و غضب کا نمونہ بنے داخل ہوئی تھیں......

"جی امی......آپ اس وقت خیریت؟" اس نے ریسیور کے سپیکر پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے پوچھا تھا۔

"کس سے بات کر رہی ہو اس وقت" انہوں نے کڑی نگاہوں سے دیکھتے اس سے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔ام کلثوم گڑبڑا گئی......فی الفور کوئی بہانہ نہیں سوجھا اسی لیے فوراً مائرہ کا نام جڑ دیا۔

"مائرہ ہے امی جان......اس کی طبیعت خراب تھی تو اس نے مجھے فون کر دیا"

''اچھا......امی جان کا لہجہ طنزیہ ہو گیا آج شام کو انہی کے گھر سے تو آئی ہو......پھر اتنی جلدی اس کی یاد کیوں آ گئی وہ جتاتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں خیر......مائرہ سے میری بھی بات کروا دو......میں بھی اس کی طبیعت کا پوچھ لوں ذرا......'' وہ آگے بڑھ کر اس سے فون لینے کے لیے آئیں تو مارے گھبراہٹ کے ام کلثوم نے فون کریڈل پر پٹخ دیا تھا سب کچھ واضح ہوتا گیا امی جان نے بیٹی کو نظریں چراتے دیکھا تو انہوں نے کس کے ایک تھپڑ اس کے گال پر جڑا۔

''بے شرم......ماں سے جھوٹ بولتے شرم نہیں آئی تجھے......کہاں کمی رہ گئی تیری تربیت میں مورکھ''

''پلیز امی جان......میری بات تو سنیں'' ام کلثوم خود کو ان کے تھپڑوں سے بچانے کی کوشش میں تھی مگر وہ غصے و طیش کے عالم میں اسے پیٹے جا رہی تھیں ان کے اعتماد کا جو خون اس نے کیا تھا اس کا دکھ ساری زندگی کیلئے کم نہیں ہونے والا تھا۔

''کیا سنوں میں تمہاری......کیا پھر کوئی نیا جھوٹ نیا کوئی ڈرامہ'' وہ غصے سے چلائیں ام کلثوم کا سر جھک گیا ماں کو دکھی کرنے کا اسکا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''مجھے معاف کر دیں امی جان......میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتانے ہی والی تھی......'' ام کلثوم نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے......اب موقع آ گیا تھا اور چھپانے کا کوئی فائدہ تھا ہی نہیں اس کے نزدیک......امی جان کے ہاتھ تھم گئے بیٹی کس سچائی کی بات کر رہی تھی ایسی کون سی حقیقت تھی جس پر سے وہ پردہ چاک کرنا چاہ رہی تھی جوانی کی دہلیز پر کھڑی اپنی بے حد حسین بیٹی پر اندھا اعتماد کر کے کیا انہوں نے کوئی غلطی کر دی تھی......

''امی جان......حشمت زیدی بہت اچھے انسان ہیں'' وہ ان کے پیروں میں آ کے بیٹھ گئی تھی۔

''آپ لوگ ان سے پلیز ایک دفعہ مل لیں......پلیز امی جان......'' امی جان تو جوان و خوبصورت بیٹی کے منہ سے ایک غیر مرد کا نام سن کر ہی ساکت رہ گئی تھیں کجا اس کا وکالت کرنا......وہ لوگ جتنے بھی آزاد خیال سہی مگر بہت اقدار والے لوگ تھے ان کے گھرانے کے بھی کچھ اصول تھے اور اپنے اصول و روایات میں وہ لوگ بہت کٹر تھے مگر وہ اپنی ہی دھن میں بول رہی تھی۔

''امی جان......مجھے دولت کا انبار نہیں چاہیے......مجھے زندگی میں صرف دلی خوشی اور اطمینان چاہیے اور وہ صرف مجھے حشمت دے سکتے ہیں''

''تم جانتی ہو ام کلثوم......تم کیا کہہ رہی ہو تمہارے ابا کو پتا چل گیا تو کس قدر برگشتہ ہوں گے وہ تم پر......تم نے تو ہماری ساری زندگی کی بنی بنائی مٹی میں رول دی......وہ تو کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہی تھیں بڑی مشکل سے اتنا بول پائی تھیں''

''پلیز امی......میں مر جاؤں گی حشمت زیدی کے بغیر......امی آپ اس سے ایک دفعہ مل کر تو دیکھیں......وہ اس قدر خوبصورت دل کا مالک انسان ہیں امی کہ ان کی گفتگو کے دوران پھول جھڑتے ہیں وہ اس قدر تہذیب یافتہ اور سلجھے ہوئے ہیں کہ اس دنیا کے محسوس

ہی نہیں ہوتے ......اس قدر محبت واحترام سے بات کرتے ہیں کہ......''

''جتنا عزت دار انسان وہ ہے ......اسکا اندازہ مجھے تمہاری ان باتوں کو سن کے اچھی طرح سے ہو رہا ہے ام کلثوم ......ایک شخص جو اس قدر عزت دار و شریف ہے جو کسی بھی لڑکی کو محبت کے دام میں پھنسا کے والدین کے سامنے محبت کی جنگ لڑنے کو کھڑا کر دیتا ہے وہ بہت عزت دار اور مہذب ہے ام کلثوم ......وہ واقعی میں بہت با کردار اور شریف انسان ہے......'' ان کے طنز پر ام کلثوم کا سر جھک گیا وہ بتا نہیں سکی کہ اس میں قصور حشمت زیدی کا نہیں خود اس کے اپنے دل کا ہے جو انہیں پہلی نظر دیکھ کر ہی بے اختیار ہو گیا تھا۔

''امی جان ......وہ کوئی عام انسان نہیں ہے بہت سلجھے ہوئے انسان اور نامور شخصیت ہے ان کی ......ان کی تحریروں میں معاشرے کے لیے سکون اور لوگوں کے لیے جو درد ہے وہ کسی میں نظر آنا بہت مشکل ہے خصوصاً آج کے دور میں جب سب کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے ان کی تحریر ان کی سوچ اور دل کی عکاسی کرتی ہے...... کیونکہ ان کے اپنے دل میں درد ہے احساس ہے اسی لیے وہ تحریر میں بھی نظر آتا ہے''

''ام کلثوم ......کسی شخص کو پہچاننے کیلئے ضروری نہیں کہ ہر دفعہ اس کی سوچ کے پیمانے سے جانچا جائے کبھی کبھی عمل سے پہچاننا بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے......اسکا کردار......خاندانی پس منظر مالی حیثیت سب باتیں دیکھنی پڑتی ہیں......اور میرا نہیں خیال وہ کسی بھی لحاظ سے ہمارے خاندان، وقار اور حیثیت سے میل کھاتا ہو......اس لیے اس بات کو دل سے نکال دو تمہارے ابا کبھی نہیں مانیں گے''

''امی جان......'' ام کلثوم کو لگا اس کی گردن پر کسی نے برچھی رکھ کر بے دردی سے چلا دی ہو۔

''ایسا مت کہیں امی جان......حشمت زیدی میری زندگی بن گئے ہیں'' بے ساختہ وہ تڑپ اٹھی امی جان نے بیٹی کی تڑپ کو دیکھا اور محسوس کیا ان کی اپنی لاڈلی، پیاری بیٹی کسی کی خاطر رو رہی تھی اور وہ کسی کوئی اور نہیں ایک بے حد عام سا لکھاری تھا جس کا معاشرے میں مالی لحاظ سے کوئی مقام نہیں تھا نہ ہی ایسی قابل فخر شجرہ نسب......جو کسی بھی لحاظ سے ان کے ہم پلہ ہوتا اور بیٹی محبت کر بیٹھی تھی۔

''اتنی خودسری اچھی نہیں ہوتی ام کلثوم ......تم تو میری بہت فرمانبردار اور اچھی بیٹی تھیں......'' مسز حسینہ انوار نے خود کو لمحوں میں بوڑھا محسوس کیا تھا جن ماؤں کی بیٹیاں خودسر ہو جاتیں وہ یونہی بوڑھی ہو جایا کرتی ہیں لمحوں میں صدیوں کا سفر طے کر لیتی ہیں وہ غموں کی دا اوڑھ کر منہ کو جامد خاموشی کے قفل لگا لیتی ہیں......آہ یہ مائیں بھی کس قدر مجبور ہوتی ہیں مسز حسینہ انوار بھی مجبور ہو گئی تھیں بیٹی کے آنسو دیکھ کر ......مگر وہ اپنے مجازی خدسے بھی بہت ڈرتی تھیں جو بے حد سخت مزاج کے نہیں تھے نہ ہی انہوں نے کبھی بچوں پر زندگی تنگ کی تھی مگر اس کے باوجود بھی وہ کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ والے مقولے پر سختی سے عمل پیرا رہنے والے انسان تھے اپنے اصولوں میں سخت اور قطعی......

''امی جان پلیز ......میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں ......مجھ سے میرے خواب نہ چھینیں ......میں زندگی میں اور کبھی کچھ نہیں مانگوں گی حشمت کے ساتھ کے سوا......'' وہ ان کے قدموں میں کسی داسی کی مانند بیٹھی تھی متورم آنکھیں ......سرخ ناک کپکپاتے ہونٹ......وہ ان کی بیٹی تو نہیں تھی وہ تو محبت کی پجارن تھی جو دیوتا کے جزبوں میں برسوں سے بیٹھی معلوم ہو رہی تھی ان کا دل گزار ہو کر پھیلا

مامتا کا دل تھا ناں...... بالآخر انہیں کہنا پڑا نہ کہتیں تو قیامت آ جاتی اور انہیں قیامت سے بڑا ڈر لگتا تھا قیامت آ جائے تو ہر چیز تہس نہس ہو جایا کرتی ہے اور اگر بیٹی ضد پکڑ کر کھڑی ہو جائے تو وہ قیامت سے بھی بڑی قیامت ہوتی ہے جس میں نسلوں کا غرور اور فخر نیست و نابود ہو جایا کرتا ہے......لہٰذا وہ بھی ڈر گئی تھیں بیٹی کی جوانی اور روپہلے عشق سے خوف زدہ ہو گئی تھیں انہوں نے ہار مان لی تھی شکست تسلیم کر لی تھی انہوں نے بیٹی کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''میں بات کروں گی تمہارے ابا جان سے......انہیں قائل کرنے کی بھی پوری کوشش کروں گی آگے جو تمہارا نصیب......مگر پھر تم مجھے مجبور نہیں کرو گی'' انہوں نے اس کے آنسو صاف کرتے اسے وعدے کی ڈور میں باندھنے کی کوشش کی، وہ تو لڑنے آئی تھیں اس سے ......اسے اس کی غلطی کا احساس دلانے کیا خبر تھی کہ واپسی پر......بیٹی کی محبت کی رازدار و امین بن ک یلوٹنا پڑے گا ایک ماں ہونے کے ناطے بیٹی کی عزت اور اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے وہ اس کے علاوہ کیا کر سکتی تھیں۔

☆☆☆

اب کیا ہوگا...... یہ وہ سوالیہ نشان تھا جن سے ہمیشہ ہی محبت کرنے والے خوف کھاتے ہیں محبت لکھنا اس کی باتیں کرنا آسان جبکہ محبت کرنا اس کے مسائل بھگتنا کہیں زیادہ مشکل امر تھا حشمت زیدی کیلئے......کیا کریں کیا نہ کریں کے درمیان پنڈولیم کی مانند جھولتے وہ دو نفوس ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے آنے والے وقت پر کسی غیر مرئی نقطے کی طرح نگاہیں جمائے دبیز خاموش کی لہر میں چھپی محبت کی سسکیاں...... پورے ماحول کو بوجھل کیے ہوئے تھیں الفاظ دم توڑ گئے تھے ہمت جواب دے رہی تھی اور سانس......بھی رک رک کر آنے لگی تھی جدائی کا سوچا بھی نہیں جا رہا تھا کجا جدا ہو کر زندگی بتانا......اس عفریت نما سوال پر ہی دل بند ہو جائے سانس تھم جائے......ام کلثوم تو لگتا تھا جیتے جی مر گئی ہے حشمت زیدی نے خود کو سنبھالتے ہوئے اس کی دگرگوں حالت کو پریشانی کی نظر سے دیکھا......تسلی و تشفی کے روایتی الفاظ جو ام کلثوم کا حوصلہ بندھا پاتے ان کی ڈکشنری میں ناپید ہو گئے......انہوں نے خود کو اس وقت خالی ذہن اور خالی دل محسوس کیا بہت کربناک لمحہ تھا وہ......ام کلثوم کی آنکھوں میں تیرتے گلابی ڈورے دیکھنا اور برداشت کرنا......وہ بے بسی سے بیٹھی لب کاٹ رہی تھی......

''بس کرو دو ثومی......اور کتنا روؤ گی تم...... بالآخر ان کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ اسے ٹوک بیٹھے''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے حشمت......اگر ابا جان نہ مانیں تو'' خوفناک اژدھے ان کے لہجے میں پھنک رہے تھے۔

''تمہیں اپنی محبت پر یقین ہے ناں تو......ادھر دیکھو میری طرف، انہوں نے اس کے جھکے چہرے کو ٹھوڑی سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر اپنا سوال دہرایا ام کلثوم نے روتی نظر دیکھ کر سر کر اثبات میں جنبش دی۔''

''تو بس پھر بے فکر رہے کوئی ہمیں جدا نہیں کر سکتا انہوں نے اس کا بے حد سفید گلابی ناخنوں والا ہاتھ اپنے چوڑے بھاری گداز ہاتھوں میں لے کر دبایا''

''نہیں حشمت ......ابا جان نہیں مانیں گے......میں ان کی ضد کو اچھے سے جانتی ہوں اگر وہ ایک بار انکار کر دیں تو پھر دنیا بدل جائے وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلتے ......''ام کلثوم ان کے جذبات سے مزین گداز ہاتھوں کی حدت سے بھی مطمئن نہیں ہو پائی اس کے اپنے خدشات تھے اور کچھ غلط بھی نہیں تھے۔

''اچھا سوچو تو ماجان ......خود کو ٹینشن سے کیا حاصل ......ایسے مسئلے مسائل ختم تو نہیں ہوں گے ......''وہ اپنی پریشانی چھپاتے اسے تسلی دے رہے تھے مگر ام کلثوم سنبھلی تو خاک الٹا مزید بکھر گئی پھوٹ پھوٹ کے روتے وہ اظہار کی تمام حدیں پار کر گئی۔

''میں نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر حشمت ......مر جاؤں گی میں اور میں ایسا محاورتاً نہیں کہہ رہی ہوں وہ بے دم ہو کے چلائی حشمت زیدی نے سر جھٹکا پل صراط پہ کھڑے انہوں نے خود کو دار پہ چڑھنے کی اذیت میں گھرا محسوس کیا۔''

''ابا جان نے صاف صاف انکار کر دیا ہے......وہ سسکی اسے امید بھی کہاں تھی کہ ایک کہانی پڑھ کے بیٹی کی زندگی کا فیصلہ بدلنے والا شخص اس کی بیٹی کی مرضی سی شادی کرنے کے خلاف ہو جائے گا''

''میں ملوں جا کر تمہارے ابا جان سے......شاید میں انہیں یقین دلا سکوں کہ میں تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گا اور تمہیں ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہوں گا کم از کم انہیں مجھ سے مل کر اندازہ تو ہو جائے گا اور شاید فیصلہ ہمارے حق میں ہو ام کلثوم نے ان کی اس بات پر انہیں چونک کے دیکھا اور بے ساختہ اپنے آنسو پونچھے امید کا جگنو ان کے آس پاس جگمگایا......حشمت زیدی ان کے ابا جان کو سمجھا سکتے تھے قائل کر سکتے تھے اس کے اندر سکون اتر آیا''

''اور اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو......مگر اس کا اضطراب وقتی کم ہوا تھا مکمل طور پر نہیں تبھی دوبارہ پوچھنے لگی''

''میں اپنی پوری کوشش کروں گا اور اگر میں پھر بھی ناکام رہا تو......پھر بھی میرا یہ وعدہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر پائے گی اور تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کر رکھا ہے......تمہیں یاد ہے ناں ......''اس نے بے ساختہ سر ہلا کر تائید کی تو وہ مسکرا دیے۔

''آؤ میرے ساتھ......انہوں نے اچانک ہی اسکا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا تھا......ام کلثوم جو آج بہت مشکل سے ایک آخری بار ان سے ملنے آئی تھی ان کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی وہ انہیں کہہ نہیں پائی کہ اسے دیر ہو جائے گی امی جان کی خالہ کے گھر واپسی سے پہلے اسے واپس جانا ہے لیکن حشمت زیدی نے ان کی ایک نہیں سنی تھی وہ اسے کورٹ لے جا رہے تھے۔''

☆☆☆

وہ اپنے باپ کی عدالت میں سر جھکائے کھڑی تھی مگر وہ نادم نہیں تھی اور شرمندہ تو بالکل بھی نہیں انہوں نے اسے سر تا پیر ایک غصیلی نگاہ سے دیکھا تھا اور لب بھینچ لیے تھے وہ ان کی کس قدر پیاری اور لاڈلی بیٹی تھی انہوں نے تو کبھی خواب میں بھی گمان نہیں کیا تھا کہ وہ

یوں ان کی توقعات کو چکنا چور کر دے گی۔

''کیا کر رہی تھیں تم کچہری میں ......'' انہوں نے دبنگ لہجے میں پوچھا تھا......ان کے منشی نے ام کلثوم کو وہاں ایک لڑکے کے ساتھ دیکھا تھا جو اکثر ہی ان کے گھر آتا رہتا تھا اس نے ہی پہچان کر اطلاع دی تھی ام کلثوم محبت میں سرخروئی کے چکر میں باپ کی پگڑی کو سربازار رول آئی تھی حشمت زیدی نے صرف اپنے اندر کے احساس کمتری اور ٹھکرائے جانے کے خوف سے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا انکار کی سہی جانے والی ذلت سے بچنے کو انہوں نے پہلے ہی ایسا قدم اٹھا کے اپنے تئیں انگار کے سارے جواز مسترد کر دیے تھے مگر ایسا کرنے سے وہ اپنی عزت تو بچا گئے تھے مگر اپنی محبت کو سربازار نیلام کر دیا تھا یہ محبت نہیں ان کا گھٹیا پن تھا محبت کو رسوا نہیں کیا جاتا اسے امر کیا جاتا ہے اور جن سے محبت کی جاتی ہے اس کی عزت و آبرو کو اپنی عزت و آبرو ہی سمجھا جانا چاہیے اور ان کے بڑوں کی عزت کو یوں پامال نہیں کرتے ......یہ بات ام کلثوم کے علاوہ سبھی نے سمجھ لی تھی ......ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ان کے گھر کی عزت یوں کچہری میں جائے ان کی بڑی بیٹی بتول نے لاء پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو مسٹر انوار نے اسے پہلے ہی وضاحت کر دی تھی۔

لاء پڑھنا تمہارا شوق ہے ضرور پڑھو مگر یہ بات ذہن میں رکھنا کہ میں تمہیں پریکٹس کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا ......وہ بہت روایتی سوچ کے حامل شخص تھے عزت دار اور نام والے اونچا حسب نسب رکھنے والے خاندانی نواب تھے بہو بیٹیوں کو چار دیواری میں رکھنے والے گو کہ ان پر کوئی دباؤ یا روک ٹوک نہیں تھا مگر پھر بھی ان کے خاندان کی کچھ حدود و قیود تھیں جن کو کاٹنا وہ کسی طور بھی پسند کرتے تھے نہ ہی اس کی اجازت دیتے تھے......اور اب ان کی بیٹی ام کلثوم کچہری میں کیا گل کھلا آئی تھی ......ساری زندگی کی بنی بنائی وہ لمحوں میں خاکستر کر گئی تھی وہ سر اٹھا کر چلنے کیقابل بھی نہیں رہے تھے ان کا جی چاہا وہ کھڑے کھڑے اس کے وجود پر مٹی کا تیل ڈال کر اسے آگ لگا دیں تا کہ کچھ تو ان کے جلتے دل کو سکون مل سکے......

''بولو......جواب دو......کیا کر رہی تھیں اس دو ٹکے کے لکھاری کے ساتھ......'' وہ اس کے سر پہ آ کے گرجے تھے ام کلثوم دہل سہی گئی اس کے باپ کا غصہ تو زمانے میں مشہور تھا جانے وہ کیسے بھول گئی نجانے اسے اس وقت ہوا کیا تھا جو وہ مدہوش سی حشمت زیدی کے ساتھ کھینچتی چلی گئی تھی۔

''ابا جان......وہ......وہ مگر نہ اس سے جواب بن پڑا نہ ہی زبان نے ساتھ دیا کچھ مہلت بھی نہ ملی ابا جان نے پوری طاقت سے اس کے پھول جیسے گال پر تھپڑ رسید کیا تھا اس کا نازک وجود اس تھپڑ کی اذیت سہہ نہیں پایا جس کی وجہ سے وہ دور صوفے کے نزدیک نیچے جا گری تھی''

''یہ دن دکھانے کو تجھے پال پوس کر جوان کیا تھا میں نے تمہیں کہ تم اٹھو اور میرے چہرے پر کالک پوت دو......'' ان کے لہجے میں اپنے ٹوٹتے ہوئے مان کی کرچیاں تھیں ایک باپ کا مان ٹوٹا تھا ایک عزت دار شریف اور مہذب انسان کی پگڑی اچھلی تھی، بہت

بدنصیب ہے تو ام کلثوم......تو بہت بد بخت ہے......تم نے خود اپنے ساتھ جو کیا سو کیا کم سے کم مجھے تو زمانے میں جینے کا چھوڑا ہوتا......وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے تھے مسز حسینہ انوار ان کے نزدیک آئی تھیں ام کلثوم کی طرف انہوں نے دیکھنا بھی پسند نہیں کیا تھا انہوں نے اپنے مجازی خدا کے کندھے پر تسلی آمیز دلاسہ دینے کو ہاتھ رکھا وہ اور بکھر سے گئے

''اسے کہو حسینہ......کہ یہاں سے چلی جائے......میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ اس کا گلا گھونٹ سکتا......''ام کلثوم سن پڑ گئی اس کے تو سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی سب کو خبر ہو جائے گی اور اس فعل کا ایسا گھناؤنا انجام ہو گا وہ تو بس حشمت زیدی کی نظروں میں سرخروئی کی آرزومند تھی یہ تو بھول ہی گئی کہ یہاں تک پال پوس کر بڑے کرنے والے باپ کے ساتھ وہ کیا کر رہی ہے اور کاش وہ جان پاتی وہ کبھی بھی ایسا قدم نہ اٹھاتی مگر اب اس کے لیے ساری راہیں بند ہو چکی تھیں وہ معتوب ٹھہرائی جا چکی تھی اس کا جرم سنگین تھا اور اسے بھی سزا دی جانی تھی۔

''بات ابھی تک آپ کے دوست وکیل اور آپ کے درمیان ہی ہے انوار......ابھی بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے''

''نہیں......ہرگز نہیں......میں مزید اپنا تماشا نہیں لگوانا چاہتا اسے کہو جس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے اسے ابھی کے ابھی اس کے پاس چلی جائے میرے لیے یہ مر چکی ہے خاندان بھر میں منادی کرا دو کہ یہ مر چکی ہے......''اتنا کہہ کے وہ اٹھ کے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے مسز حسینہ بھی اپنے شوہر کے پیچھے چلی گئیں وہ اکیلی گم صم حالت میں زمین پر بیٹھی رہ گئی......کچھ ہی دیر میں اس کا بہنوئی اور بہن بھی آ گئے تھے کسی نے نہ اس کی طرف دیکھا نہ کلام کیا......لمحوں میں اسے اپنے اوقات پتہ چل گئی......بند کمرے میں جانے کیا میٹنگ ہوئی اسے خبر نہیں اسے وہاں بیٹھے بیٹھے دوپہر سے رات ہو گئی وہ بھوکی پیاسی وہیں بیٹھی رہی ہاں اسے اپنی غلطی کا ادراک ضرور ہو گیا تھا کچھ دیر بعد اس کی بہن اس کے پاس آئی تھی اس کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے......آج اس کی آنکھوں میں بھی اس کے لیے نفرت تھی۔

''بلاؤ اپنے شوہر کو......ابا جان سے آ کے ملے......اور رخصتی کی تاریخ لے جائے ویسے تو تم دونوں کو شاید اپنے بڑوں کی ضرورت نہیں ہے مگر ہمیں تو اپنی عزت بچانی ہے جو کہ تمہارے معاشقے کی وجہ سے بچی تو پہلے بھی نہیں مگر......بچی کھچی عزت کا جنازہ نکالنے کیلئے اس سے پہلے کہ تم مزید کوئی سامان کرو......تمہارا اس گھر سے عزت سے چلے جانا ہی بہتر ہے......''

''آپی......آپی پلیز میری بات تو سنیں مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دیں پلیز......وہ اٹھ کر ان کے ہاتھ تھام کر بولی مگر بتول آپی نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی جو کچھ وہ کر چکی تھی اسے اچھے سے ادراک ہو گیا تھا کہ اب اس کی اس گھر میں کوئی جگہ نہیں بچی......اس نے ایک غلط قدم اٹھایا تھا مگر اب مزید کوئی غلطی نہیں دہرانا چاہتی تھی سو اس نے حشمت زیدی کو فون کر کے ساری صورتحال کہہ سنائی تھی وہ تو پہلے سے ہی تیار بیٹھا تھا فوراً چلا آیا......پہلی بار وہ اپنے سسرال آ رہا تھا بے حد شان وشوکت سے کھڑی ان کی حویلی میں قدم رکھتے وہ تفاخر سے مسکرائے آج وہ اس قابل تھے کہ سر اٹھا کے چل سکتے کیونکہ آج اس گھر کے مکینوں کی نظریں ان کے لیے

جھکی ہوئی تھیں اور انہوں نے اسی دن کیلئے تو اتنا بڑا کھیل کھیلا تھا...... محبت اپنی جگہ مگر محبت میں وہ ذلیل ہونے کے قائل بالکل بھی نہیں تھے ......انہوں نے ہمیشہ ہی امیروں کو غریب لوگوں کو من کی عزت نفس روندتے دیکھا تھا وہ محبت کے ہاتھوں ان امیر لوگوں کے پیروں میں نہیں لوٹنا چاہتے تھے ان کی خودداری، اناء اور عزت نفس انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی ان کی خود غرضی انہیں ہمیشہ اپنے لیے اچھا سوچنے کی ترغیب دیتی رہی تھی اسی لیے وہ خود کو ہمیشہ سرفہرست رکھتے سرفہرست گنا کرتے۔ وہ ڈرائنگ روم میں بڑی شان کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ جمائے سگار سلگا کے بیٹھے تھے وہ کورین سگار تھا جو چند دن پہلے ان کے کسی فین نے انہیں بھجوایا تھا اور جسکا ذائقہ انہیں بہت پسند آیا تھا آج کل اکثر ہی پیتے رہتے اور آج تو سگار پینے کا انہیں جس قدر لطف آ رہا تھا پہلے کبھی نہیں آیا......انہوں نے شہر کے معزز ترین شخصیت ایڈیشنل جج مسٹر انوار حسین کو دیکھا...... جو لمحوں میں بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے لمحے بھر کو حشمت زیدی کو ان پر ترس آیا مگر وہ مجبور تھے کیونکہ انوار حسین کو حشمت زیدی پر ترس نہیں آ تا تھا......ام کلثوم انہیں پل پل کی خبر دیا کرتی تھی کس قدر ہتک آمیز اور قابل نفرت لہجہ ہوتا تھا ان کے لیے انوار حسین کا......وہ اس ک نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے وہ اسے دو ٹکے کا لکھاری کہا کرتے تھے اور آج وہی دو ٹکے کا لکھاری......ان کے سامنے نظر اور سر اٹھا کر فخر سے بیٹھا تھا......"

"جو حرکت تم نے کی ہے برخودار......وہ کسی شریف خاندان کے اطوار میں شامل نہیں ہوتی تمہاری اس حرکت نے تمہاری اوقات کو واضح کر دیا ہے...... بہر حال...... جو تم نے ہمارے ساتھ کیا ہماری بیٹی کو ورغلا کے......اس کے لیے ہم تمہیں معاف نہیں کر سکتے مگر اپنی عزت بچانے کیلئے ہم تمہیں اپنی بیٹی کو رخصت کر کے ضرور دیں گے اب......حشمت زیدی کے منہ پر زوردار طمانچہ پڑا تھا وہ جو یہ سمجھ کر آئے تھے کہ انہوں نے اپنی اس حرکت سے اپنی سسرال کو اپنے سامنے زیر کر لیا ہے تو وہ غلط تھے اس کے سسرال والے زخمی حصے کو ناسور بنا کر ساتھ لے کر چلنے والوں میں سے نہیں تھے بلکہ اس زخمی حصے کو کاٹ کر جسم سے علیحدہ کرنے والوں میں سے تھے"

"جمعے کو چار معزز لوگوں کو لے کر آ جانا اگر خاندان میں وہ موجود ہوں تو......ہم تمہیں رخصتی کر دیں گے اور ہاں جہیز کے نام پر ام کلثوم کو یہاں سے ایک تنکا بھی نہیں ملے گا تم اتنا تو کما ہی سکتے ہو کہ اسے بہترین معیار زندگی فراہم کر سکو......انہوں نے بس نہیں کی تھی بلکہ ان پر جوتوں کی بوچھاڑ کر دی تھی وہ لال بھبو کا چہرہ لیے وہاں سے اٹھ آئے تھے جس متوقع ہتک، بے عزتی سے انہوں نے بچنے کی کوشش کی تھی وہ ہو کر ہی رہی تھی حشمت زیدی کے دل میں اپنی سسرال والوں کے لیے ایک گرہ سی پڑ گئی آغاز زندگی کچھ اچھے انداز میں نہیں ہوا تھا ان کی جانب سے مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ پہل ان کی طرف سے ہوئی ہے اور وہ بھی کچھ اچھے انداز میں نہیں ہوئی تھی......انہوں نے اچانک ہی ماں کو کچھ پیسے دے کر ایک سونے کی انگوٹھی اور چار جوڑے دو جوتے خریدنے کو کہا تھا......اگر ام کلثوم کو جہیز مل رہا ہوتا تا شاید وہ یہ تردد بھی نہ کرتے مگر اب وہ ان لوگوں کی طرح بھوکے ننگے طریقے سے اپنی بیوی کو گھر نہیں لا سکتے تھے......یہ ان کی غیرت پر تازیانہ تھا ......ماں اور بھائی اس اچانک کی شادی پر حیران رہ گئے تھے مگر کچھ بھی پوچھنے کی جرات انہیں حشمت زیدی کے قطعی رویے نے نہیں دی تھی

......ویسے بھی وہ اب بڑے لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا اور بڑے لوگ کیسے شادیاں کرتے ہیں یا ان کے کیسی ریتی رواج تھے اس کی خبر بہر حال وہ نہیں رکھتے تھے سو قصداً خاموش ہو گئے تھے اس کی ماں اور بھائی بازار جا کے بری خرید لائے تھے عام سی سرخ رنگ کی فلیٹ تھی جس کے ساتھ سرخ رنگ کا گوٹا لگا ڈوپٹہ تھا جو ام کلثوم کا عروسی لباس تھا ساتھ بے حد عام سے ہلکے میٹریل والی ہیل کی سنہری جوتی......جس کی ایڑی ہاتھ لگاتے ہی ہلتی محسوس ہوتی تھی اور ام کلثوم کو ڈر تھا اگر وہ ذرا زور سے زمین پر پاؤں رکھے گی تو وہ یقیناً ٹوٹ جائے گی سستا سا تیز رنگوں والا میک اپ تھا"

"یہ لائی ہے تمہاری سسرال تمہاری بری......کیا تم یہی سب ڈیزرو کرتی تھیں ثومی؟"

"بتول آپ کو دکھ ہوا تھا کلیوں جیسی نازک اور دلنشین ان کی بہن مقدر کے معاملے میں بہت کم رو ثابت ہوئی تھی اور اس میں زیادہ غلطی ان کی اپنی بہن کی تھی ام کلثوم کچھ نہیں بولیں خامش ہو رہی جانتی تھی کہ اس کا دیا جواب بحث کو جنم دے گا اور وہ کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتی تھی وہ خوبصورت تھی اور بے حد حسین بھی اسی لیے تو فلیٹ کے عام سے سستے سوٹ اور گوٹے کناری والے دوپٹے میں بھی نظر لگنے کی حد تک حسین لگ رہی تھی......بارات میں مسٹر انوار کے حسب منشا شہر کے معزز ترین لوگ شامل تھے ان کے خاندان سے کوئی شامل نہیں ہوا تھا اور صرف خالق اس کی بیوی اور اس کی ماں تھے......بارات کا انتظام ہوٹل میں کیا گیا تھا اور اس ہوٹل کا انتظام و انصرام دیکھ کر خالدہ بی بی اور خالق کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے کہ اتنی ڈشیں تھیں کہ وہ کچھ بھی پیٹ بھر کے نہیں کھا پائے تھے انہیں حشمت زیدی کے نصیب پر رشک آیا تھا وہ اپنے بیٹے کو بڑا آدمی بنا دیکھنا چاہتی تھی اور وہ آج بن گیا تھا......شہر بھر کے معروف ادیب و شعرا آج کے علاوہ ان کے دوست احباب کی لمبی فہرست تھی......کچھ نہ کچھ بھرم انوار حسین کا بالآخر حشمت نے ان کا رکھ ہی لیا تھا بھلے اس اقدام کے پیچھے اس ہتک کا عنصر شامل تھا جو اس کے سسر نے اس کی کی تھی......رخصتی کے وقت ام کلثوم باپ کے گھٹنوں کو چھو کر معافی مانگ کے روئی تھی وہ آخر باپ تھے......اور جانتے تھے کہ ام کلثوم سے غلطی ہوئی ہے اور اگر انہیں کسی بھی لحاظ سے حشمت زیدی اپنی بیٹی کے قابل لگتا تو وہ اپنے ہاتھوں سے اسے بیٹی بیاہ دیتے......انہوں نے اس کے بارے میں پتہ کروایا تھا مکمل چھان بین......اس کا نچلی بیک گراؤنڈ اس کا رہن سہن اس کی اٹھک بیٹھک......وہ ایک متکبر اور خود غرض شخص تھا وہ کسی بھی لحاظ سے انہیں انسانیت کے درجے پر فائز محسوس نہیں ہوا تھا ورنہ وہ خود ہی ام کلثوم کا رشتہ حشمت زیدی کے ساتھ کر دیتے......ان کی بیٹی آگ میں کودنے کی خواہش کر رہی تھی وہ کیسے اسے خود دھکا دے دیتے اور جب اولاد خود سر ہو جائے تو والدین انہیں ان کی غلطی کا احساس دلانے کو سزا دیا ہی کرتے ہیں تبھی بچے ان کی غلطی دہرانے کو سوچتے بھی نہیں ہیں......انہوں نے ام کلثوم کو اس گھر سے بے شک خالی ہاتھ رخصت کیا تھا مگر پھر بھی انہوں نے اپنی بیوی کو بیس ہزار کا چیک لکھ کر چلتے سمے ام کلثوم کو دینے کو کہا تھا......مگر ام کلثوم نے وہ چیک لینے سے انکار کر دیا تھا"

"مجھے ان پیسوں کی نہیں معافی کی ضرورت ہے امی جان......آپ لوگ میری اس غلطی کی مجھے معافی دے دیں مجھے اور کچھ بھی

نہیں چاہیے......وہ ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی"

"بغیر کہے ہی وہ جانتی تھی کہ اس گھر سے ناتا اس کا ہمیشہ کیلئے ٹوٹ رہا ہے مگر وہ خود کو مضبوط کیے آگے کا سوچ رہی تھی اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ گھر بسا کر دکھائے گی......اور جب وہ اپنے گھر میں خوش وخرم زندگی بسر کرے گی تو کبھی نہ کبھی اس کے والدین بھی اسے معاف کر دیں گے اور وہ ان لوگوں سے دوبارہ ملنے بھی لگے گی......اس کی بہن کو تو اس پر اتنا غصہ آیا تھا کہ رخصتی کے وقت وہ اس کے قریب بھی نہ پھٹکی تھی شاید وہ ایسا نہ کرتی اگر اس کا شوہر اور ساس قریب نہ کھڑے ہوتے اس کی ساس تو ام کلثوم کو اپنے بھانجے کے لیے مانگ رہی تھیں اور اب جب سے انہیں اپنے بیٹے کی زبانی ام کلثوم کی حرکت کے بارے میں علم ہوا تھا وہ اٹھتے بیٹھتے خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں جس نے انہیں ام کلثوم جیسی بدطینت وبدکردار لڑکی کے چنگل میں پھنسنے سے بچا لیا تھا......بتول کو یہ سب سن کر کس قدر سبکی وہتک محسوس ہوتی اس کا اندازہ سوائے اس کے اور کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا"

☆☆☆☆

وہ بازار میں دکانوں کے اوپر بنا ایک کمرہ کچن اور چھوٹے سے برآمدے پر مشتمل اسکا گھر تھا جس میں اسے بیاہ کر لایا گیا تھا ......گھر میں کسی بھی قسم کی آرائش نہیں کی گئی تھی ا......اس کے واحد اور اکلوتے کمرے و بیڈروم میں اسے لاکر بٹھایا گیا تھا ام کلثوم نے گھونگٹ اٹھا کر پورے کمرے کو ایک طائرانہ نگاہ سے دیکھا......جس میں فرنیچر کے نام پہ اونچے پایوں والی مسہری ایک رائٹنگ ٹیبل چیئر اور دو کرسی اور میز تھے......سامنے کی دیوار والی کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی جس پر کوئی پردہ نہیں لگا تھا......کھڑکی سے اندر آتا ٹریفک اور لوگوں کا بے ہنگم شور ان کے کان کے پردے پھاڑ رہا تھا مگر وہ خود پر ضبط کیے بیٹھی رہی تھی اس کے لیے کمرہ بھی نہیں سجایا گیا تھا اس کی آمد کے ایک گھنٹے بعد حشمت زیدی کے چند دوستوں نے آکر ٹیبل پر کچھ فروٹس، کیک کے علاوہ گلاب کے پھولوں کی لڑیاں بھی لا رکھی تھیں......ام کلثوم کے دل میں حشمت زیدی کے لیے شکوہ نہیں تھا کہ اس کے استقبال کے لیے کچھ اہتمام نہیں کیا مگر پھر بھی اگر وہ ایسا کرتا تو ام کلثوم کو اس عزت و تکریم پر بہت زیادہ خوشی محسوس ہوتی جیسے کہ اس وقت ہو رہی تھی اس کی ساس اسے اٹھا کر باہر برآمدے میں لے گئی تھیں اور حشمت کے دوست اندر کمرہ سجانے لگ گئے تھے خالدہ بی بی اپنی بے حد حسین بہو کو نرم نرم نگاہوں سے دیکھتی خوش ہو رہی تھیں وہ واقعی میں چاند سے بھی زیادہ خوبصورت تھی پھر بے ساختہ انہوں نے دوپٹے کے پلو سے دس روپے نکال کر اس کے سر پر سے وارے اور مٹھی میں کسی ضرورت مند کو دینے کیلئے دبوچ لیے تھے۔

"سدا سہاگن رہے......دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو" انہوں نے اسے بے ساختہ دعا دی تھی ام کلثوم بے ساختہ مسکرائی

"جانتی ہے حاشو نے جب تیرے بارے میں مجھے بتایا تو اس نے کیا کہا......اس نے کہا تھا اماں ......تیری بہو کو چاند بھی دیکھنے سے شرماتا ہے کیونکہ وہ چاند سے بھی زیادہ پیاری ہے اور اس نے کس قدر سچ کہا تھا......بس اللہ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے......وہ

اپنے سادہ انداز بیان میں تعریف کرتی اور دعائیں دیتیں ام کلثوم کو بہت اچھی لگی تھیں چلو کوئی تو تھا جوان کی نئی زندگی کے لیے دعا گو تھا ......ورنہ جو اس نے اپنے والدین کا دل دکھا کے کیا تھا ایسے میں اسے امید نہیں تھی کہ وہ لوگ اسے دل سے معاف کر دیں گے......اس کے دل پر بھاری بوجھ تھا وہ تو صحیح طرح سے خوش بھی نہ ہو پا رہی تھی ......کاش وہ اس وقت نہ بہکتی تو آج وہ کس قدر آسودہ طریقے سے بہت دھوم دھام سے حشمت زیدی کی زندگی میں داخل ہوتی''

''لو بیٹا......کچھ کھالو......اس کی ساس کچھ دیر بعد اس کے لیے کھانا لے کر آئی تھی ام کلثوم نے حیرت سے دیکھا شادی والے روز وہ اپنے گھر میں پہلے ہی ان حشمت کے بغیر کھانا نہیں کھانا چاہتی تھی''

''رہنے دیجیے خالہ......مجھے بھوک نہیں ہے''اس نے نہایت آہستگی سے دھیمے پڑتے لہجے میں کہا تھا خالہ بی بی بمشکل سن پائیں وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ دھیمے لہجے میں بات کرنے کی عادی ہے۔

''اچھا ٹھیک ہے......میں رکھ دیتی ہوں رات میں جب بھوک لگے تو کھا لینا......ٹھیک ہے بیٹا......ان کی پیار بھری تائید و تاکید پر وہ محض سر ہلا کے رہ گئی تھی......''ستمبر کا آخیر تھا مگر گرمی ابھی بھی پوری طرح پڑتی تھی......دو گھنٹے بعد حشمت زیدی کے دوست کمرہ سیٹ کر کے نکلے تو اسے اندر لایا گیا حشمت زیدی کے دیرینہ دوست جسے سب لوگ پیار سے مفتی صاحب کہتے تھے کیمرہ کرائے پر لائے تھے انہوں نے ہی ان دونوں کی کچھ تصاویر اکٹھی اتاری تھیں ورنہ تو شاید ان کی شادی کا کوئی ثبوت کوئی یادگار نشانی ان کے پاس نہیں ہونی تھی چلتے سمے مفتی صاحب نے اپنی بھابی کو پانچ روپے سلامی دی تھی اس وقت کے پانچ روپے آج کے پانچ سو کے برابر سمجھے جاتے تھے ام کلثوم کو پہلی بار کسی نے سسرال میں سلامی دی تھی اور راہ اتنی کم تھی کہ ام کلثوم کو لیتے ہوئے شرم محسوس ہوئی تھی......رات گئے کمرہ خالی ہوا تو اسے آرام کرنے کا موقع ملا......مارے حجاب کے وہ کہہ نہ سکی کہ بیٹھے بیٹھے اس کی کمر تختہ ہو چکی ہے......حشمت زیدی اسے پلنگ پر بٹھا کے خود اس کے بالکل سامنے کرسی پر آ بیٹھے......ام کلثوم کی ایک سرسری سی نگاہ حشمت زیدی پر پڑی جو آج مکمل موڈ میں پورے استحقاق کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے ام کلثوم کے اندر ٹھنڈے میٹھے پانیوں کے جھرنے بہنے لگے جنگل میں موروں کا ناچ شروع ہو گیا......کوئل ان کے ملن کے گیت گانے لگ گئی تھی دونوں ایک دوسرے کی قربت میں مدہوش ہو رہے تھے جبھی حشمت زیدی نے بات چھیڑ دی تھی انہوں نے ام کلثوم کے نازک سپید گلابی ناخنوں والے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہنائی جو وزن میں قدرے ہلکی تھی مگر ڈیزائن خوبصورت تھا۔

''میں اس طرح سے میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا ثوما جان......مگر تم جانتی ہو ناں اگر میں یہ سب نہ کرتا تو ہمارا ملن ناممکن ہو جاتا اور یہ مجھے کسی بھی طور گوارا نہیں تھا......اور میں جانتا ہوں کہ تم بھی میرے بغیر زندہ نہ رہ پاتیں''وہ اس کا ہاتھ تھامے بہت نرمی سے کہہ رہے تھے ام کلثوم نے ہلکے سے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

''مگر میں تمہارے والدین سے سخت مایوس ہوا ہوں......انہیں کم از کم تمہارے ساتھ ایسا ظلم نہیں کرنا چاہیے تھا......بخدا مجھے تو

تمہارے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے زندگی میں...... مگر تم تو آسائشات کی عادی تھیں انہیں تمہارا تو سوچنا ہی چاہیے تھا......انہوں نے تو تمہیں خالی ہاتھ رخصت کر کے بالکل ہی بے وقعت کر دیا......" ام کلثوم کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں سر مارے شرمندگی کے نا چاہتے ہوئے بھی جھک گیا۔

"غلطی تو ہم نے بھی کی ہے ناں حشمت" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بمشکل بول پائیں

"یہ غلطی نہیں ہمارا شرعی حق تھا ثوما...... جو ہم نے استعال کیا ہے تم اس بارے میں مزید کچھ مت سوچو......سوائے اس کے کہ ہماری محبت سچی تھی کہ ہم ہزار کٹھنائی کے بعد بھی ایک ہو گئے اور اب تم مسز حشمت زیدی بن گئی ہو سو ان سب لوگوں سے جنہوں نے تمہارے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا ہے یا تمہارا دل دکھایا ہے تو ایسے ہی پیش آنا جیسے ایک نامور معروف ادیب کی بیوی کو آنا چاہیے......آخر کو ہزاروں چاہنے والیوں میں سے تمہیں ہی یہ منصب نصیب ہوا ہے" وہ شرارت و تکبر کے ملے جلے تاثرات سے کہہ رہے تھے ام کلثوم کے لبوں پر ایک بے دم مسکراہٹ نے آ کے دم توڑ دیا

"اور میں نہیں چاہوں گا کہ میری بیوی...... میری بیوی یہ خاصا زور دے کے" اب اس جگہ جائے جہاں سے اسے نہایت بے عزت کر کے نکالا گیا ہے بھلے وہ تمہارا میکہ ہے مگر اب تمہاری عزت میری اور میری عزت تمہاری ہوگی...... ہے ناں ثوما جان، بہر حال تم پر کوئی روک ٹوک یا دباؤ نہیں ہوگا مگر تم بھی مجھے مجبور نہیں کرو گی......ام کلثوم محض سر ہلا کے رہ گئی......شادی کی پہلی رات جب وہ پہلے ہی ذہنی دباؤ میں تھی ایسی باتیں......اسے سمجھ نہیں آئی کہ کیا جواب دے......بہر حال اس نے تائید کر لی تھی اور اسی میں اس کی بھلائی بھی تھی......

☆☆☆

ساری رات وہ بے چین رہی......کھلی کھڑکی سے ساری رات ٹریفک کا بے ہنگم شور اس کے کان کے پردے پھاڑتا رہا......اسے بے اختیار اپنا پرسکون و پر آسائش کمرہ یاد آیا......بس کل رات ہی کی تو بات تھی وہ اے سی آن کر کے مکمل طور پر مصنوعی سردی کا ماحول بنا کر کمبل اوڑھ کے دن چڑھے تک سوئی رہتی تھی اور آج کی رات وہ یہاں تھی یہاں اس چھوٹے سے کمرے میں جس کی کھڑکی کی چوڑی سلاخیں لکڑی کی بڑی کھڑکی سے محروم تھی اور پردے سے بھی......ام کلثوم کو سخت کوفت ہوئی اگر مسینے کی کھڑکی ہوتی تو شاید اس بے ہنگم شور سے کچھ جان چھوٹ جاتی صبح وہ جلدی ہی اٹھ گئی جبکہ حشمت زیدی تو بڑے مزے سے سو رہے تھے......ام کلثوم نے خود کو اس نئی زندگی اور اس میں درپیش آنے والے مسائل کے لیے خود کو تیار کرنے کی کوشش کی تھی......اسے محل سے اٹھ کر اس ایک کمرے کے مکان میں آنے کا کوئی افسوس نہیں تھا......نہ ہی اسے یہاں کے مسائل سے کوئی مسئلہ تھا اسے بس دکھ تھا کہ اس کی جذباتیت اور جلد بازی کی وجہ سے اس کے والدین اس سے ناراض ہو گئے تھے اور اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے والدین کبھی اس سے راضی بھی ہوں گے کہ نہیں

اس نے بے خبر سوئے ہوئے حشمت کی گھنی پلکوں والی آنکھوں کو دیکھا جو گہری نیند میں ہونے کے باوجود بھی ہولے ہولے لرز رہی تھیں......ام کلثوم کو ان کی آنکھوں پر بے ساختہ پیار آیا......ان کی ذہانت سے بھرپور بے حد خوبصورت آنکھیں تھیں اس قدر پرکشش

اور سحر زدہ کہ ام کلثوم ڈوب ڈوب جاتی بہت دیر ان کی طرف دیکھتے اور آنکھوں کے راستے دل میں سموتے رہنے کے بعد وہ غسل کے لیے اٹھی تھی باتھ روم کا حال بھی کم وبیش ویسا یہ تھا مگر ام کلثوم نے اسے استعمال کیا۔

''آہستہ آہستہ وہ سب کچھ ٹھیک کرے گی ......ویسے بھی حشمت تو مرد ہیں انہیں کیا پتہ کہ گھر کو کیسے سنوارا جاتا ہے یہ تو خالصتاً عورتوں کے کام ہوتے ہیں ......''اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال بناتے مسکراتے ہوئے سوچا تھا......تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو ام کلثوم کو حشمت کو جگانا ہی پڑا......مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے۔

''حشمت اٹھیے پلیز......دروازے پر دستک ہو رہی ہے دیکھیں ناں جا کر کہ کون آیا ہے؟''

''خود ہی دیکھ لو جا کر یار......مجھے تو سونے دو......اتنی دنوں کی تھکاوٹ ہے'' وہ کروٹ بدل کر پھر سو گئے تو ناچار ام کلثوم کو ہی دروازہ کھولنا پڑ گیا تھا......اسے تو بالکل ایک فی صدی بھی امید نہیں تھی اسے حیرت ہوئی تھی دیکھ کر کہ اس کے میکے سے اس کے لیے ناشتہ بھیجا گیا تھا بتول آپی اور اس کی دوست مائرہ تھے۔

''السلام علیکم آپی......''ام کلثوم نے ہی سلام میں پہل کی تھی ورنہ بتول آپی تو اس کے بھیگے بھیگے روپ کو دیکھنے میں اتنی مگن تھیں کہ حال احوال پوچھنے کا تو خیال ہی نہیں آیا......وہ بے حد سادہ سے ساٹن کے سوٹ میں اس قدر دلکش وحسین لگ رہی تھی کہ نظریں ہٹانا مشکل ہو رہا تھا بتول آپی نے بے ساختہ اسے گلے لگا کر پیار اور دعا دی......جو بے وقوفی وہ اپنی جذباتیت کے ہاتھوں کر چکی تھی اب ضرور نہیں تھا کہ وہ ساری زندگی اس پاداش میں معتوب ٹھہرائی جاتی۔

''میرا خیال ہے تم اکیلی ہو یہاں پر......تمہاری ساس اور باقی سسرال والے کہاں ہیں'' ڈرائیور برآمدے میں رکھی تپائی پر ناشتے کے ڈھیروں لوازمات رکھ گیا تھا حشمت کمرے میں سو رہے تھا ناچار ام کلثوم کو ان لوگوں کو برآمدے میں بٹھانا پڑا تھا......

''وہ لوگ تو رات کو ہی چلے گئے تھے آپی......ابھی شاید آنے والے ہوں اور حشمت ابھی سو رہے ہیں میں جگاتی ہوں انہیں ......''وہ فوراً ہی اٹھ گئی تھی اندر آ کر حشمت کو جگانے کے لیے تو وہ پہلے سے ہی جاگ رہے تھے اور سگریٹ پی رہے تھے ام کلثوم کو اچنبھا ہوا کہ وہ جاگ جانے کے باوجود باہر اس کے میکے والوں سے ملنے کیوں نہیں آئے......شادی کے بعد وہ لوگ پہلی دفعہ ان کے گھر آئے تھے۔

''اچھا ہوا......آپ اٹھ گئے باہر بتول آپی اور مائرہ آئی ہیں ناشتہ لے کر......آپ جلدی سے فریش ہو کر آ جائیں''

''کہہ دو ان سے کہ میں سو رہا ہوں ......میرا موڈ نہیں ہے ابھی کسی سے ملنے کا''انہوں نے صفا چٹ انکار کر دیا تھا اور اس کی امید ام کلثوم کو بہر حال نہیں تھی۔

''ایسا اچھے لگے گا کیا؟''ام کلثوم بس اتنا ہی کہہ پائی۔

''ثوما......کیا فرق پڑتا ہے یار......اور پھر میں منافق نہیں ہوں جن لوگوں نے میری بیوی کی انسلٹ کی ہو میں ان لوگوں کی

عزت نہیں کر سکتا...... آئم سوری' انہوں نے ہاتھ اٹھا کے منع کر دیا۔

''آہستہ بولیں حشمت...... وہ لوگ سن لیں گے اور پھر وہ باہر ہی تو موجود ہیں...... ام کلثوم کو خوف ہوا کہیں اس کی آپی سن ہی نہ لیں ورنہ تعلقات میں بہتری بس کو ایک خواب ہی رہ جاتا۔''

''تم چلو میں آتا ہوں' شادی کی پہلی ہی صبح شاید حشمت زیدی کو احساس ہو ہی گیا تھا کہ اسے ایسا رویہ اختیار نہیں کر ان چاہیے یا شاید اسے ام کلثوم کا دکھی چہرہ اچھا نہیں لگا تھا۔

''میں نے حشمت کو جگایا ہے...... ابھی آتے ہیں تھوڑی دیر میں'' اس نے باہر نکلتے ہی زندگی کا پہلا بھرم رکھا بتول آپی کچھ نہیں بولیں

''تیار ہو جاؤ ثومی...... ہم تمہیں لینے بھی آئے ہیں......'' مائرہ نے اسے کہا تو وہ چاہتے ہوئے بھی کوئی جواب نہیں دے پائی تھی۔

''کہاں رہ گئے دلہا میاں...... آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ان کا انتظار کرتے کرتے تم تو ناشتہ کر لو ام کلثوم......'' بتول آپی نے بے حد سنجیدگی سے اسے تحکمیہ انداز میں کہا تھا۔

''بھوک نہیں ہے آپی...... بعد میں کھا لوں گی''

''بعد میں...... کیا مطلب تم ہمارے ساتھ نہیں جا رہی ہو کیا؟'' بتول آپی معاملے کو سمجھ رہی تھیں پھر بھی اس کے منہ سے سننا چاہتی تھیں ام کلثوم کی آنکھیں یکلخت نمکین پانیوں سے بھر گئیں وہ بے ساختہ آپی کے پاس آ بیٹھی۔

''آپی...... پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے گا...... میں آؤں گی ضرور آؤں گی مگر ابھی نہیں...... اس وقت تک جب تک ابا جان کا غصہ و ناراضی ختم نہیں ہو جاتی...... اور میں وہاں اکیلی بھی نہیں آنا چاہتی...... آپی' موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے بے ربط انداز ٹوٹا بکھرا لہجہ...... بتول آپی کے دل پر برچھی چلا گیا انہوں نے بے ساختہ اس کے آنسو صاف کر کے اسے تسلی دی تھی۔

''تم فکر نہیں کرو...... آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا'' چلتے سمے انہوں نے اس کے ہاتھ پر کچھ رکھا تھا ام کلثوم نے چونک کر دیکھا سوالیہ نگاہوں سے پوچھا یہ کیا ہے؟

''رکھ لو...... انکار مت کرنا ابا جان نے بھیجا ہے...... کل بھی امی جان تمہیں دینا چاہ رہی تھیں زیادہ نہیں ہے مگر تمہارے کچھ نہ کچھ ضرورتیں پوری ہو ہی جائیں گی اور نہیں تو کسی اچھے علاقے میں گھر ہی لے لینا''

''کہا ناں رکھ لو......'' اسے بولنے کیلئے پر تولتا دیکھ کر انہوں نے چیک اس کی مٹھی میں رکھ کے دبایا تو اسے خاموش ہونا پڑا...... اسے بھی یکدم ہی اس گھر میں بہت سی کمیاں نظر آنے لگی تھیں...... اب وہ ایک گھر والی تھی سو ایسی سوچیں نامناسب نہیں تھیں...... جب وہ لوگ دو گھنٹے بعد چلی گئیں تھیں حشمت زیدی اٹھ کر نہایا، ام کلثوم نے ناشتے کا پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔

''نہ بھئی میں تو سسرال سے آیا ایک دانہ بھی نہ کھاؤں جنہوں نے میری بیوی کی قدر نہیں کی...... اسے اس کے حق سے محروم رکھا

میں انہیں کا بھیجا اناج کھالوں کہ حق کی بات نہ کرسکوں نہ بابا نہ میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی......ام کلثوم خاموش ہو رہی کیونکہ وہ بات ہی اس کے حوالے سے کر رہا تھا......اور اس کے واقعی ناشتہ نہیں کیا تھا بلکہ اپنی اماں کا لایا ہوا دوپہر کا کھانا ہی کھایا تھا ام کلثوم کے میکے سے آئی مٹھائی اور فروٹس پاک ٹی ہاؤس میں موجود ان کے دوست احباب میں بانٹ دیے گئے دوستوں میں ہمیشہ کی طرح ان کی واہ واہ ہوگئی تھی''

☆☆☆

خالق کا بیٹا ہوا تھا......آج صبح ہی اماں نے فون کر کے بتایا تھا ام کلثوم کی شادی کو دس روز ہو گئے تھے اس دوران ام کلثوم گھر میں ضرورت کی کافی چیزیں لے آئی تھی سب سے پہلے اس نے کھڑکی کے آگے پردہ لگوایا تھا......حشمت زیدی اسے دیکھ دیکھ کر ہنستے......وہ روز شام کو جب گھومنے کے لیے باہر نکلتے تو ام کلثوم روزانہ ہی گھر کی کوئی نہ کوئی چیز خرید لاتی......کچن میں برتن اور راشن ڈالا......بیڈ شیٹس، کمبل وغیرہ خریدے......حشمت زیدی کے اندر کی طعنہ باز عورت جاگ اٹھی۔

''ہاہا......یہ تمہارے کرنے کے کام تو نہیں تھے ثوما جان......یہ سب ضرورتیں تو والدین پوری کیا کرتے ہیں کیا کوئی مان سکتا ہے کہ اتنے بڑے باپ کی بیٹی اچھرہ بازار سے گھر کی چیزیں خریدتی ہے'' وہ کف افسوس ملتے ام کلثوم کی جان سولی پر لٹکا دیا کرتے ام کلثوم شرمندہ ہو جاتی......وہ اس سے اس انداز سے ہمدردی کرتے کہ وہ جواب میں یا اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ بول پاتی اسے کبھی یہ نہیں لگا وہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں یا در پردہ اسے اس کی غلطی پر ٹارچر کرتے ہیں وہ جذباتی ضرور تھی مگر اتنی معاملہ فہم یا ذہین نہیں یا پھر حشمت زیدی ہی زیادہ ہوشیار تھے۔

''ہر کسی کو اپنے نصیب کا ملتا ہے اور میں اپنے نصیب پر شاکر ہوں حشمت......'' وہ ان کے قریب بڑھ آئی ان کی آنکھوں میں محبت سے دیکھا۔

''میں تمہیں تمہاری حیثیت کے مطابق خوش نہیں رکھ پاتا ناں؟'' وہ اپنے احساس کمتری کو نا چاہتے ہوئے بھی عیاں کر گئے حالانکہ ایسی احساس کمتری کو دبانے کیلیے وہ ام کلثوم کے والدین پر چوٹ کیے رکھتے۔

''ایسا کیوں سوچتے ہو آپ......میں بہت خوش ہوں آپ کے ساتھ......اور مجھے زندگی میں کچھ بھی نہیں چاہیے'' جانے حشمت زیدی مطمئن ہوئے یا نہیں مگر خاموش ہو گئے تھے۔

''اچھا چلیں تیار ہو جائیں......ہمیں خالق بھائی کے بیٹے کو دیکھنے کیلیئے جانا ہے''

''کیا ضروری ہے یار......کہ ہم ابھی چلیں......ہم دوبارہ بھی تو جا سکتے ہیں'' انہیں ہمیشہ ہی اس محلے میں جانے سے کوفت ہوتی تھی۔

''جی......اور ہم ابھی چلیں گے بس جلدی سے تیار ہو جائیں میں نے آپ کے کپڑے نکال دیے اور ابھی آپ نے مجھے شاپنگ بھی کروانی ہے بچے کے لیے، وہ جانے کیلیئے تیار تو ہو گئے لیکن بچے کے تحائف کیلیئے ان کی جیب خالی تھی۔

''آج ویسے ہی ہو آتے ہیں......تحفہ پھر کسی دن لے جائیں گے......''انہوں نے بازار میں آتے ہی ام کلثوم کے چہرے سے نظریں چراتے کہا۔

''جی نہیں......آج میں آپ کی کوئی بات نہیں مانوں گی......ہم ابھی تحفہ لے کر جائیں گے''ام کلثوم کو ضد ہوگئی تھی۔

''مگر ثوما......اس وقت میرے پاس ایک دھیلا بھی نہیں ہے......ڈائجسٹ سے منی آرڈر ملنے میں ابھی کچھ دن باقی ہیں اور بچہ کا تحفہ کونسا ستا آجائے گا''انہوں نے اپنی پریشانی کی وجہ فوراً ہی بتادی تھی اس سے پہلے کہ وہ کسی دکان میں گھس جاتی انہوں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر

''آپ چلیں تو اندر......اور فکر نہیں کریں میرے پاس کچھ پیسے ہیں ہم آرام سے شاپنگ کرلیں گے وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر اندر بڑھ گئی تھی نوزائیدہ بچے کے تین سوٹ اس کی ماں باپ کے علاوہ اس نے اپنی ساس کے لیے بھی سوٹ خریدا تھا......حشمت زیدی کی تو آنکھیں ابل کر باہر آگئیں وہ کس قدر فیاضی سے ان کے رشتے داروں کے لیے شاپنگ کررہی تھی جبکہ انہیں تو آج تک کبھی احساس ہی نہ ہوا تھا۔''

''آپکو اچھی لگی میری شاپنگ حشمت'' وہ ان سے تائید چاہ رہی تھی تبھی وہ کہہ گئے۔

''کیا ضرورت تھی اتنا روپیہ خرچ کرنے کی ثوما جان......ان پیسوں سے ہم اپنی ضروریات بھی تو پوری کرسکتے تھے ناں؟ام کلثوم تو چڑی ہی رہ گئی جبکہ وہ تو شادی کے بعد کا سارا وقت حیران ہی ہورہی تھی''

''ان سب پر خرچ کرنا بھی تو ہمارا فرض ہے ناں حشمت'' وہ دھیمے لہجے میں جتا گئی مگر مقابل کو چنداں پرواہ نہیں تھی،اور پھر آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ ہمارے انشتوں کا ہم پر بہت قرض ہوتا ہے ان کی محبتوں کا قرض......تو پھر ہم عملی زندگی میں اس قرض سے کوتاہی کیوں برتیں۔وہ انہیں ان کے مشہور ناول میں لکھے جملے کو یاد کرواتے کہہ رہی تھی حشمت زیدی کو لب بھینچ کر خاموش ہونا پڑا وہ کہہ نہ سکے کہ عملی زندگی اور فکشن میں فرق ہوتا ہے......

اماں کے گھر انکا والہانہ استقبال ہوا تھا......محلے بھر کی تمام خواتین یکدم ہی ام کلثوم کو دیکھنے کے لیے جمع ہوگئی تھیں اور وہ سب بار بار حشمت زیدی اور خالدہ بی بی سے کہہ رہی تھیں۔

''وے حشمت......تو کتنا خوش قسمت ہے پتر......تیری ووہٹی تو دودھ ملائی سے بنی لگتی ہے انی سوہنی اور بولتی تو اتنا ہولی (آہستہ) ہے کہ کان لگا کے سننا پڑتا ہے سچ سچ بتا کہاں سے ڈھونڈا ایسا ہیرا......تقریباً تمام محلے والی عورتوں کے تعریفی جملے اسی طرح کے تھے حشمت زیدی بڑائی اور فخر کے تاثرات سجائے ان تعریفوں کو اس طرح سے وصول کررہے تھے جیسے یہ سب ان کا حق ہو جبکہ ام کلثوم شرما رہی تھی اسے اپنی تعریف میں سچائی سے زیادہ ان سب سادہ لوگوں کا پیار اور محبت کی حد تک نظر آرہی تھی اس روز وہ شام کا کھانا کھا کر

وہاں سے نکلے تھے شام کے کھانے کی تیاری ام کلثوم نے خالدہ بی بی کے ساتھ ملکر کروائی تھی وہ تو نہال ہی ہو گئی تھیں انہیں تو اندازہ تک نہیں تھا کہ اتنے بڑے گھر سے آنے کے باوجود بھی ان کی بہو اس طرح سے کام کرے گی بلکہ انہیں تو اس کے شایان شان جگہ ہی گھر میں نظر نہیں آ رہی تھی......ام کلثوم کی عادات انہیں قدم قدم پر چونکا رہی تھیں پھر وہ سب گھر والوں کے قیمتی جوڑے بھی لائی تھی جبکہ حشمت اپنی ماہوار حاصل رقم میں سے بھی ماں کو پانچ دس روپے تک نہ دیتا تھا بلکہ وہ تو اس قدر گھل مل گئی تھی کہ خود ہی خالق سے فرمائش بھی کر دی کہ بچے کا نام میں رکھوں گی......انہوں نے فوراً اجازت دیتے پوچھا تھا کہ کیا نام رکھو گی......''

''آفاق کیسا ہے؟'' حشمت زیدی کی طرف دیکھتے اس نے نام کے متعلق پوچھا تھا۔

''بہت پیارا ہے......آج سے یہ آفاق ہی پکارا جائے گا'' خالق بھائی نے اٹھ کر اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا تھا......واپسی پر وہ دونوں بہت خوش تھے......کچی بستی سے مین روڈ تک وہ لوگ پیدل چل کر آئے تھے......جس وقت وہ لوگ لوٹے مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں میں روڈ پر رکشہ روکنے کیلئے وہ سڑک پر کھڑے تھے تبھی اچانک بہت اچانک ایک گاڑی اس کے پاس آ کر رکی تھی......چند لمحوں کے لیے ساری کائنات رک گئی چرند پرند سانس لینا بھول گئے ام کلثوم بھی سانس لینا بھول گئی تھی وہ گاڑی چند لمحے اس کے پاس رکنے کے بعد آگے بڑھ گئی تھی......مگر ام کلثوم آگے نہیں بڑھ سکی اور آگے تو حشمت زیدی بھی نہیں بڑھ سکے تھے......انہوں نے بھی گاڑی میں بیٹھے اس شخص کو دیکھ لیا تھا......وہ ام کلثوم کے ابا جان تھے......

اور یہ سچ تھا کہ انہیں ام کلثوم کو یوں شام کے وقت فٹ پاتھ پہ کھڑے دیکھ کر دکھ ہوا تھا وہ تو عادی تھی ہمیشہ آرام دہ گاڑی میں سفر کرنے کی......واپسی کا سفر کم تکلیف دہ ان کے لیے بھی نہیں تھا، ان دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے سے اس چھوٹے سے واقعے کا ذکر نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

''آج واپسی پہ میں نے ابا جان کو دیکھا حشمت! رات کو ان کے چوڑے کشادہ سینے پر سر رکھے اس نے نم لہجے میں ہولے سے سرگوشی کی......وہ جو اس کے گھنے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلا رہے تھے ان کے ہاتھ یکلخت تھے''

''کتنے روز کے بعد میں دیکھ رہی تھی انہیں......پورے دس روز کے بعد......پہلے اتنے روز میں کبھی ان سے جدا نہیں ہوئی اگر وہ بیرون ملک بھی جائیں تو بھی وہ فون لازمی کرتے تھے مجھے......اس کے لہجے میں اداسی تھی رخصتی کے وقت اسے تو باپ کے کندھے پر سر رکھ کر جی بھر کے رونے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا'' حشمت زیدی اس کی اداسی کو لب بھینچ کر محسوس کرتے رہے......مگر بولے کچھ نہیں''

ان کی آنکھوں میں اس قدر حیرت تھی مجھے فٹ پاتھ پہ کھڑا دیکھ کے......کہ چند ثانیے کے لیے میں خود دم بخود رہ گئی......انہیں یقیناً دکھ ہوا ہوگا اپنی ام کلثوم کو یوں سڑک پر کھڑے دیکھ کر......میں عادی بھی کہاں تھی یوں لوکل ٹرانسپورٹ میں سفر کرنے کی......وہ تو اپنی

ہی دھن میں بولے جارہی تھی مگر اسکا اتنا ہی کہنا غضب ہو گیا۔

''پچھتا رہی ہو مجھ سے شادی کر کے......'' حشمت زیدی کا لہجہ سرد ہو گیا ان کی انگلیاں ام کلثوم کے بالوں میں منجمد ہو گئیں۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا تھا اپنی مالی حیثیت......میں نے تم سے کوئی دھوکا نہیں کیا جو تم ایسی باتیں کر رہی ہو......ام کلثوم اس قدر سرد اور برفیلے لہجے پرسن پڑ گئی وہ اٹھ بیٹھی۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا حشمت......میں تو بس ویسے......''

''تو پھر کیا مطلب تھا تمہارا......میری انسلٹ کرنے کے علاوہ......میں اغوا کر کے نہیں لایا ہوں تمہیں تمہاری پوری رضا مندی کے ساتھ تمہیں بیاہ کر لایا ہوں میں......بلکہ میں تو عدالتوں میں جا کر ذلیل ہوا ہوں تمہارے باپ سے جوتیاں کھائی ہیں اپنے منہ کے اوپر......مگر سچ کہا ہے کسی نے عورت ذات کبھی راضی نہیں ہوتی'' وہ بھڑک اٹھے تھے۔

''حشمت'' ام کلثوم کی آواز بھرا گئی دکھ سے وہ اپنی بات مکمل کرنا بھول گئی آپ غلط سمجھ رہے ہیں......۔

''میں غلط سمجھ رہا ہوں......وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئے غصے سے ان کا تنفس پھول رہا تھا'' ایک دنیا دیکھی ہے میں نے......میں جانتا ہوں تم مجھے کیا باور کروانا چاہ رہی ہو......رتم مجھے جان بوجھ کر میری کم مائیگی کا احساس دلانا چاہتی ہو۔ وہ بات کو طول دے کر جھگڑا کر رہے تھے ام کلثوم نہیں جانتی تھی کہ وہ جلدی غصے میں آ جاتے ہیں بلکہ وہ تو ان کے بارے میں بہت کچھ نہیں جانتی تھی ابھی تو ابتدائے دوستی تھی اور وہ ابھی سے پریشان ہو اٹھی تھی۔

''حشمت......میں بھلا کیوں کرنے لگی ایسا......'' وہ اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہتی تھی مگر حشمت زیدی نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

''بس......مجھے کوئی صفائی نہیں چاہیے......اور اب مجھے سونے دو نیند آ رہی ہے مجھے......'' وہ کروٹ بدل کر سو گئے تھے مگر ام کلثوم ساری رات نہیں سو سکی۔ صرف دس روز ہوئے تھے ان کی شادی کو ......اور کبھی زندگی میں جھگڑا نہ کرنے کا عہد کرنے والے عہد توڑ گئے تھے......اور وعدے تو ہوتے ہی توڑنے کیلئے ہیں حشمت زیدی نے بھی وعدہ توڑ دیا تھا دس روز بعد ان کا پہلا جھگڑا ہوا تھا...... پہلا جھگڑا ایک بے حد معمولی بات پر مگر وہ معمولی بات معمولی جھگڑے پر نہیں ختم ہوئی تھی......حشمت زیدی کا غصہ طول پکڑ گیا تھا وہ ساری رات ام کلثوم نے جاگ کر گزاری تھی مگر اس ادراک کے ساتھ کہ حشمت زیدی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی معاف کرنے والا نہیں اسے محتاط رہنا تھا کیا خبر کس لمحے اس کی کوئی بات حشمت زیدی کے مزاج گرامی کو ناگوار گزر جائے دوسری صبح وہ بغیر ناشتہ کیے سویرے ہی پاک ٹی ہاؤس کی جانب چل دیے تھے۔......انہوں نے ام کلثوم کی جانب دیکھا تک نہیں تھا ام کلثوم نے بات کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے جواب نہیں دیا بلکہ سرے سے نظر انداز کر دیا وہ ہر روز صبح بیڈ ٹی لینے کے عادی تھے ام کلثوم بنا کر لے گئی مگر انہوں نے چائے کی طرف نگاہ غلط بھی نہ ڈالی۔ خود ہی اپنے کپڑے نکال کر استری کیے اور تیار ہو کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ام کلثوم پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ ایک نا کردہ جرم کی

سزا اس قدر سخت اتنی کڑی......اس کی فہم سے بالاتر......محبت کمال کرتی ہے محبت اپنے کمالات دکھانے کا آغاز کر چکی تھی......

☆☆☆

تین دن کے بعد ان کا غصہ خود ہی ٹھنڈا ہو گیا تھا وہ بالکل پہلے والے ٹھنڈے میٹھے جان نثار والہانہ محبت چھڑکنے والے حشمت زیدی بن گئے تھے مگر ان تین دنوں میں ام کلثوم کی جان سوکھ گئی تھی شاید وہ ابھی بھی نہ مانتے بلکہ وہ ام کلثوم کو اچھے سے یاد کراتے کہ وہ اپنے میکے کے حوالے سے کوئی ایسی بات نہ کرے نہ سوچے......وہ اس کو ذہنی طور پر دبا کر مفلوج کر رہے تھے تاکہ وہ کبھی پچھتا نہ سکے اور اگر پچھتائے تو اس کا اظہار نہ کرے......مگر انہیں اس سے بات کرنا پڑتی تھی انہیں اپنا موڈ ٹھیک کرنا پڑا تھا ان کی خالی جیب انہیں یہ سب کرنے پر مجبور کر گئی تھی۔

"تمہارے پاس اگر پانچ سو کھلا ہو تو دے دو......میری جیب خالی ہے بالکل" وہ شرمندہ شرمندہ سے مسکرائے تھے۔ ام کلثوم نے اثبات میں سر ہلا کر اندر گئی اور پیسے لا کر دیے یہ وہ قلیل رقم تھی جو اس کے پاس کچھ پہلے سے موجود تھی تھوڑی بہت سلامی کی جمع تھی۔

"نوازش بیگم صاحبہ......جلد ہی لوٹا دوں گا"

"میں نے کب آپ سے واپس مانگے ہیں جو ایسی غیروں جیسی باتیں کر رہے ہیں" ام کلثوم خوشی سے رہی مخمور لہجے میں شکوہ کر رہی تھی اس کے لیے تو آج عید کا دن تھا حشمت کا موڈ اس کے ساتھ پہلے جیسا ہو گیا تھا......

"پھر بھی......میاں بیوی میں بھی حساب کتاب تو ہوتا ہی ہے......" انہوں نے سگریٹ جلا کر لبوں میں دبایا۔

"میاں اور بیوی کا ایک دوسرے پر حق بھی تو ہوتا ہے کہ نہیں" وہ مسکرائے۔

"ہاں کہہ تو ٹھیک رہی ہو" انہوں نے شرارت سے اس کی ریشمی لٹ کھینچی۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ کیا پکا رہی ہو آج......"

"جو آپ کا کھانے کا موڈ ہو......جلدی سے بنا لوں گی" ام کلثوم واری صدقے ہونے لگی۔

"ایسا کرو جان......کہ تم اپنے لیے بنا لو......میں تو آج دوستوں کے ساتھ کھاؤں گا آج ٹی ہاؤس والے دوستوں نے شادی کی خوشی میں عشائیہ مانگا ہے ناں" ان کے بتانے پر ام کلثوم کا منہ لٹک گیا اسے اب سمجھ میں آ گیا تھا کہ حشمت پیسے کیوں مانگ رہے تھے۔

"حشمت......پھر تو پیسے کم نہیں آپ کے پاس" یکدم ہی اسے تشویش بھی ہوئی تھی۔

"نہیں......بہت ہیں کچھ میں نے علیم الدین سے مانگ لیے تھے"

"آپ کوئی جاب کیوں نہیں کر لیتے......ساتھ ساتھ" ام کلثوم نے عادت کے مطابق مشورہ دیا مگر اگلے ہی لمحے زبان دانتوں میں داب لی مبادا حشمت کا مزاج پھر بگڑ جائے۔

''پیسے تو پہلی بار مانگے ہیں تم سے اور وہ بھی ادھار اور تم مجھے مشورے بھی دینے لگیں......'' انہوں نے سنجیدگی سے جتلایا تھا ام کلثوم کی جان تختہ دار پر لٹک گئی وہ پھر ناراض ہونے والے تھے مگر اگلے ہی لمحے وہ حیران رہ گئی جب انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''اس کے بارے میں بھی...... کچھ نہ کچھ سوچتے ہیں'' ام کلثوم نے بے ساختہ شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔

☆☆☆

''جونیئر سیکشن میں وہ بھی شامل تھی اور فائنل والوں کے فیئر ویل فنکشن کی تیاریوں میں پیش پیش بھی...... وہ نئی کلاس میں آنے پر پر جوش بھی تھی مگر اس کے چلے جانے سے اداس بھی...... یہ سچ تھا کہ اس ایک سال میں اس نے کبھی بھی اس کے بغیر یونیورسٹی آنے جانے اور یہاں اکیلے وقت بتانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا مگر وہ بہت خوش تھا اس کا بی اے آنرز مکمل ہو رہا تھا اس کی کامیابی کی سیڑھی پر پہلا قدم پوری طاقت سے پڑ گیا تھا...... اس کی زندگی کے حوالے سے ترجیحات بہت بلند تھیں اسے بہت آگے جانا تھا خوب ڈھیر سارا پیسہ کمانا تھا اسے اپنے لیے اپنے نام کے ساتھ قابل فخر ڈگریوں کی لمبی فہرست لگانی تھی اسے خود کو کامیاب ترین انسان کہلوانا تھا اور یہ بات طے تھی کہ وہ اپنے ارادوں میں اٹل تھا ارسہ کو اس بات کی واضح طور پر خبر تھی مگر وہ یقین نہیں کر پائی کہ اس کی زندگی کی ترجیحات، ضروریات اور خواہشات میں وہ کس مقام پر کس جگہ پر کھڑی ہے وہ ان سب میں شامل ہے بھی یا نہیں......'' وہ اس سے کبھی بھی پوچھ نہیں سکی اور وہ اسے کبھی بتا نہیں پایا......

''مگر ارسہ کی یہ شدت سے خواہش تھی کہ وہ بس ایک بار ہی سہی مگر اس کے دل میں جھانک لے اور دیکھے کہ اس کے دل میں کیا ہے اس کا مقام کیا ہے وہ اس کے دل کے کسی کونے میں بستی ہے آیا بستی بھی ہے یا نہیں...... یہ خیال جان لیوا سہی مگر حقیقت پسند ہونے کے ناطے وہ ایسا سوچتی ضرور تھی''

''تمہارے کیا پلانز ہیں فیوچر کے حوالے سے'' اس روز فیئر ویل فنکشن سے دو دن پہلے اس نے پوچھ لیا تھا وہ خود کو روک نہیں سکی اس سوال کو پوچھنے سے......

''ابھی فی الحال تو اچھے پیپرز کی دعا کر رہا ہوں باقی پلاننگ میں نہیں کیا کرتا جو بھی قسمت میں لکھا ہوگا وہ ہو کر رہے گا اس کے انداز میں لاپروائی کا عنصر معمول سے کہیں زیادہ تھا یا پھر ارسہ کو محسوس ہوا تھا۔''

''شادی کب کرو گے؟'' اس نے فضول میں وقت ضائع کرنے کی بجائے صاف سیدھے انداز میں پوچھ لیا تھا۔

''شادی...... آں...... وہ سوچ میں پڑ گیا تھا اور اس دوران اس کا دل سوکھے پتے کی مانند لرزنے لگا تھا۔''

''کسی ایسی لڑکی سے کروں گا جسے میرے وائلن سے محبت ہوگی...... کیونکہ میری پہلی محبت میرا وائلن ہی ہے اس نے یکدم اظہار کر دیا تھا ارسہ دم بخود بیٹھی رہ گئی اظہار کا انداز بہت انوکھا اور قدرے مبہم تھا''

''کیا تم نے ایسی لڑکی ڈھونڈی ہے جسے تمہارے وائلن سے محبت ہے؟'' اس نے یقین دہانی کرنا ضروری سمجھی تھی۔

''تم محبت پر یقین رکھتی ہو ارسہ؟'' یکدم اس نے پوچھا تھا ارسہ کا سوال دھرارہ گیا......ارسہ نے بے ساختہ اور ترنت اثبات میں سر ہلایا۔

''میں نہیں رکھتا......کیوں کہ میرا یہ ماننا ہے کہ محبت دکھ کے علاوہ زندگی میں اور کوئی تحفہ دان نہیں کرتی اس نے خود ہی وضاحت کرتے اور سر پر دکھ کا پہاڑ گرادیا تھا وہ بول نہیں پائی۔''

''تمہیں ایسا کیوں لگا؟'' بہت دیر بعد خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

''یہ میرا تجربہ و مشاہدہ ہے......محبت انسان کو زندگی میں صرف دکھ، تنہائی اور پچھتاوے ہی سونپتی ہے یہ سب کو راس نہیں آتی اسی لیے میں محبت کرنے سے ڈرتا ہوں......مگر یہ بہت ظالم شے ہے یہ اسی انسان کا پیچھا کرتی ہے جو اس سے دور بھاگتا ہے'' وہ بے بسی سے کہہ رہا تھا اور وہ تو اتنی حیران تھی کہ پوچھ ہی نہیں پائی کہ کیا تمہیں بھی اس ظالم محبت نے ڈس لیا ہے جو تم ایسا کہہ رہے ہو یا......یا کسی تجربے سے ڈرتے ہو یا محبت سے ڈرتے ہو۔

''تو تم شادی نہیں کرو گے......'' وہ الٹا سوال کر گئی تھی وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ پھر کیا تم محبت نہیں کرو گی......مگر اس کے حواس نے اسکا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

''میں نے کب کہا کہ میں شادی نہیں کروں گا بلکہ میں تو محبت بھی کروں گا'' وہ مبہم سا مسکرایا تھا۔ ارسہ میں ہمت مفقود ہوگئی کہ وہ پوچھ سکے کہ کب اور کس سے......محبت اور اس کے خدشات نے اس کی زبان کو مفلوج کردیا تھا مگر وہ مگن سا ارد گرد دیکھنے میں گم رہا تھا۔

☆☆☆

نانی اماں......کیا یہ سچ ہے کہ محبت دکھ کے علاوہ اور کچھ دان نہیں کرتی زندگی کو......اس روز بہت دنوں کے بعد اسے وقت ملا تھا نانی اماں کے پاس بیٹھنے کا......نانی اماں کی گود میں سر رکھے وہ لیٹی ہوئی تھی جبکہ ابا میاں لاؤنج میں ذرا فاصلے پر ٹی وی پر لگے ٹاک شو میں گم تھے......

''ضروری نہیں ارسہ......کہ محبت ہمیشہ غم ہی دے جس رشتے میں توقعات زیادہ ہوں وہ سبھی غم دیتے ہیں صرف محبت کو پوائنٹ آؤٹ کرنا غلط ہے......'' انہوں نے نرمی سے سمجھایا تھا۔

''تو پھر محبت اتنی بدنام کیوں ہے؟'' وہ بھی الجھ گئی تھی اس کے عمر بھی تو ایسی ہی تھی۔

''کیونکہ محبت میں ہی توقعات وہ چیز ہے جو حد سے زیادہ دونوں فریقین ایک دوسرے سے وابستہ کر لیتے ہیں اور اکثر دونوں فریقین ہی اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرنی چاہیے بگاڑ تو تبھی پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنے اپنے فرائض سے پہلو تہی کرتے ہیں......اور یہ ہر رشتے میں ہی ہوتا ہے......ارینج میرج میں بھی ایسا دیکھنے میں اکثر آتا ہے۔''

''مگر سب سے اچھی بات یہ ہے کہ بیٹوں کو ہمیشہ ہی اپنے والدین کی مرضی کے مطابق شادی کرنا چاہیے...... کیونکہ والدین ہمیشہ اپنی بچیوں کا بھلا چاہتے ہیں ان کی دعائیں ان کے زادِراہ کے طور پر ہمیشہ کام آتی رہتی ہیں...... نجانے کس وقت ابا میاں اٹھ کے ان کے قریب آئے تھے ان دونوں کو پتہ نہیں چلا تھا...... ارسہ جان گئی وہ اسے کیا سمجھانا چاہتے ہیں ویسے بھی وہ بہت حساس اور ذہین لڑکی تھی اور ابا میاں سے بے پناہ محبت کرتی تھی ان کے وجود میں اس نے ہمیشہ باپ کی مہک وشفقت ڈھونڈی اور محسوس کی تھی...... اس نے جان لیا تھا کہ اسے اپنوں کا دل کبھی نہیں توڑنا اسے ان کی خاطر جینا ہے اسے محبت نبھانی ہے اسے احسان اتارنا ہے اور محبتیں احسان ہی تو ہوا کرتی ہیں انہیں صرف حق سمجھ کر ہی نہیں وصولنا چاہیے انہیں احسان سمجھ کر بدلے کی طرح ہمیشہ اتارنا کی کوشش کرنی چاہیے اس روز کے بعد وہ پھر کبھی اس سے نہیں ملی...... دانستہ جب تک فائنل والوں کو کالج سے فری نہیں کر دیا گیا وہ یونیورسٹی نہیں گئی تھی اس نے اپنی معصوم سی محبت کا گلا خود ہی گھونٹ دیا تھا...... کیونکہ محبت میں وہ زبردستی کی قائل نہیں تھی...... اور جب وہ یونیورسٹی گئی وہ تب وہاں نہیں تھا اس کے اور اس کے وائلن کے بغیر پورا کیمپس اداس اور مغموم تھا اور تنہا بھی اور تنہا تو وہ بھی ہو گئی تھی جس محبت کا آغاز ہوا تھا وہ انجام سے پہلے ہی بیچ راہ میں کہیں کھو گئی تھی...... مگر بات یہ تکلیف دہ نہیں تھی بلکہ جس محبت کا وہ دم بھرتی تھی اس محبت کے سفر میں وہ اکیلی تھی...... اس کی وجہ کیا تھی اسے جاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا......''

☆☆☆

''پیسے کی اہمیت کا اندازہ ام کلثوم کو اس وقت ہوا جب اس نے عملی زندگی میں اس کی بار بار اور بے شمار قلت دیکھی تھی...... اب بھی تقریباً ہر دوسرے دن حشمت زیدی کی جیب خالی رہنے لگی تھی پہلے ہی کی طرح سے دوستوں کو کھلانے پلانے کے قائل تھے مگر گھر میں راشن ڈالنا بھول جایا کرتے تھے...... پہلے وہ متواتر لکھا کرتے تھے تو ماہوار اچھی آمدنی ہو جایا کرتی تھی مگر اب وہ صرف ایک ڈائجسٹ میں ہی سلسلے وار ناول لکھ رہے تھے اور اس کا اعزازیہ بہرحال اتنا کسی طور پر بھی نہیں تھا کہ ایک گھر کا خرچ علاج معالجہ اور دیگر ضروریات کے ساتھ ساتھ دوستوں پر بھی لٹایا جا سکے۔...... ان کے کپڑے پہلے پہل دھوبی سے دھل کر آتے تھے مگر اب ام کلثوم خود ہی دھو کر کلف لگا کر استری جما کرنا سیکھ گئی تھی...... اس کے اخلاق اور اخلاص کی وجہ سے آئے دن اس کے سسرال والوں سے بھی کوئی نہ کوئی آیا رہتا...... اس کے میکے سے تو کبھی بھی کوئی نہیں آیا تھا اس کی شادی کو ایک سال ہو گیا تھا اور اس ایک سال میں اس نے زندگی کے بہت سے رنگ و روپ و اتار چڑھاؤ دیکھ لیے تھے...... حشمت زیدی کی بے پناہ محبت، غصہ اہانت وہ جیسے عادی ہو گئی تھی حشمت زیدی بہت روکھے مزاج کا بندہ تھا اس قدر گنجلک سوچ کا حامل کہ ام کلثوم اس کی ذات کے ریشمی لچھے دار الجھنوں میں الجھ کے رہ گئی تھی کبھی اتنا نرم رو کہ ام کلثوم کو کلیوں کی مانند سہلاتا مگر کبھی ایسا چٹان اور سخت کہ ام کلثوم کی محبت سر پٹخ پٹخ کر رہ جایا کرتی مگر اس سب کے باوجود بھی ام کلثوم کی محبت اس تنگ دستی، تنگ نظری میں بھی ایک دن کیلئے بھی نہیں پچھتائی تھی اس روز جب خالق بھائی اور ان کی بیگم آفاق کی سالگرہ کا کہنے کیلئے آئے تو گھر میں چینی

تک نہیں تھی کہ وہ خالی چینی کا شربت ہی بنا کر انہیں پلا سکتی ......وہ تو اتفاق ایسا تھا کہ وہ لوگ شام کو بازار سے شاپنگ کر کے کھانا کھا کر لوٹے تھے بس کھڑے کھڑے ان دونوں کو دعوت دے کر گھر چلے گئے بلکہ وہ لوگ آتے وقت ام کلثوم کے لیے بھی دو کباب اور دو پراٹھے لے کر آئے تھے انار کلی کے بہت مشہور کباب پراٹھے تھے......ام کلثوم کو بہت خوشی ہوئی تھی کباب تو اس کے پسندیدہ تھے اکثر ہی امی جان سے فرمائش کر کے بنوائے رکھتی تھی مگر اب تو بہت عرصہ ہو گیا تھا اس نے کباب چکھے تک نہیں تھے حشمت کی محدود آمدنی اسے ایسی شاہ خرچی کی اجازت نہیں دیتی تھی گو کہ حشمت دل کے خاصے کھلے انسان تھے مگر انہوں نے کبھی خود سے لا کر دینے کی زحمت کی تھی نہ ہی ام کلثوم نے کہنے کی......سو دل کی وہ دل ہی میں دبائے بظاہر مطمئن اور خوش تھی مگر اس روز والی صورت حال پر وہ سچ مچ میں پریشان ہو گئی تھی اس نے نوکری کا پکا ارادہ کر لیا تھا اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ حشمت سے لازمی آج ذکر کر کے ہی رہے گی آج وہ ان کے کسی بہلاوے میں نہیں آئے گی اور وہ واقعی میں نہیں آئی تھی۔

''ایسا کب تک چلے گا......آپ کوئی جاب کیوں نہیں ڈھونڈتے اب تو گھر میں فاقوں کی نوبت آنے لگ گئی ہے......پہلی بار وہ تھوڑا سا تلخ ہوئی تھی حشمت زیدی نے اسے چونک کے دیکھا تھا''

''بس......عشق کا بخار اتر گیا جانِ من......'' وہ الٹا اس پر طنز فرمانے لگ گئے تھے۔

''میں نے تو تمہیں اپنی حیثیت پہلے ہی بتا دی تھی......'' وہ ام کلثوم جب بھی کوئی بات کرنے لگتی طعنے دے کر اسے چپ کروا دیا کرتے مگر آج اسے چپ نہیں ہونا تھا بلکہ انہیں قائل کرنا تھا۔

''حشمت......میری محبت کو مت برا بھلا کہیں......میری محبت اور میں کبھی نہیں پچھتائے مگر خود سوچیں اگر یہی حال رہا تو ہم آئندہ زندگی میں سروائیو نہیں کر پائیں گے......کل کو ہمارے بچے ہوں گے ان کی ضروریات بھی تو ہوں گی آپ کوئی جاب کیوں نہیں کر لیتے''

''جاب کروں گا تو خود مر جاؤں گا......اور میں اپنی تخلیق کو مارنا نہیں چاہتا میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اپنی تخلیق کے ذریعے ہمیشہ کے لیے امر ہو جانا چاہتا ہوں......انہوں نے کئی دفعہ کی کہی بات دہرائی''

''تو پھر مجھے اجازت دے دیجیے......میں کہیں جاب کر لیتی ہوں'' اس نے تھک کر کہا تھا۔

''مجھے عورت کی کمائی کھانے سے نفرت ہے اور پھر میں تم جیسی حسین بیوی کو باہر کمانے کے لیے بھیج دوں تاکہ تمہارے نام نہاد عزت دار باپ کو باتیں بنانے کا موقع مل سکے......'' وہ بھڑک اٹھے۔

''حشمت......وہ جیسے تھک کر بولی تھی کوئی کچھ نہیں کہے گا'' مگر وہ سمجھتے تب ناں۔

''تم جو بھی کہو......مگر میری انا پر یہ بات تازیانہ ہے کہ میرے ہوتے ہوئے تم باہر سے کما کر لاؤ ابھی اتنا بھی برا وقت نہیں آیا میرے اوپر......'' ام کلثوم کا جی چاہا سر پیٹ لے۔

''میں بھی پڑھی لکھی ہوں حشمت......اور پھر گھر میں سارا دن بولائی بولائی سی رہتی ہوں آپ تو صبح کے گئے رات کو لوٹتے ہیں ......میں بھی مصروف رہنا چاہتی ہوں''

''تو گھر میں مصروف رہنے کے اور بھی تو کئی طریقے نکل سکتے ہیں......''

''مگر حشمت......میں گھر کے ایک جیسے حالات سے اکتا گئی ہوں......اب کچھ پیسہ جمع کر کے اپنا مکان بنانا چاہتی ہوں اسے اپنے پسند سے سجانا سنوارنا چاہتی ہوں اور اگر ایسے ہی حالات رہے تو یہ خواب خواب ہی رہے گا'' اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیسے سمجھائے انہیں......

''میرے حالات کو برا بھلا مت کہو ثوما......اگر تمہارے باپ کو احساس ہوتا تو وہ کبھی بھی تمہیں یوں خالی ہاتھ گھر سے رخصت نہ کرتے......میں نہ سہی تم تو آسائشات میں پلی بڑھی تھیں وہ تمہارے آئندہ کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ہی سہی وہ تمہیں اپنا ایک گھر تو دے ہی سکتے تھے'' لے دے کے ان کی تان بس اس کے والدین پر ہی ٹوٹتی تھی ام کلثوم چڑ گئی۔

''حشمت......مجھے یہ سب میرے والدین کیوں دیتے......مجھے تو یہ سب آپ سے لینا تھا، ہم نے اپنا گھر بنانا تھا اپنی محنت اور محبت سے......میں کیوں لیتی اس کو اپنے باپ سے''

''تو پھر یہ رونا بند کر دو......جب کبھی میرے پاس ہوا سب کچھ تمہیں گھر بیٹھے مل جایا کرے گا ابھی جو ہے اسی پر گزارہ کرو ......انہوں نے بات ختم کر دی تھی مگر ام کلثوم اب اس مسئلے کا حل چاہتی تھی زیادہ نہیں تو وہ چاہتی تھی کہ وہ لوگ یہ گھر ضرور بدل ہی لیں۔''

''مگر ہم کسی اچھے علاقے میں شفٹ تو ہو ہی سکتے ہیں حشمت''

''میری سمجھ نہیں آ رہا تم جان بوجھ کر مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کر رہی ہو یا واقعی میں تمہیں میری بات سمجھ نہیں آ رہی......وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھے تھے کیسیٹ کو ایش ٹرے میں جھاڑا۔''

''حشمت......میں یہ دونوں کام نہیں کر رہی......میرے پاس کچھ پیسے ہیں آپ وہ لے لیں اور کوئی اچھا سا گھر ڈھونڈ لیں ......میں اب یہاں اور نہیں رہ سکتی سارا دن ساری ساری رات ٹریفک کا بے ہنگم شور یہاں کا ماحول، گندگی، کچھ بھی اب میری برداشت میں نہیں ہے......'' پورے ایک سال کی بھڑاس وہ اب آج اسی وقت نکال رہی تھی وہ اس کی بات کے جواب میں مبہم سا مسکرائے تھے۔

''میں ابھی لا کے دکھاتی ہوں......آپ کو ایسے یقین نہیں آئے گا'' اسے لگا شاید انہیں یقین نہیں آ رہا وہ بھاگ کر اندر سے الماری سے وہی چیک نکال کر لائی جو بتول آپی نے اسے شادی کے دوسرے ہی دن دیا تھا کہ کبھی نہ کبھی ضرورت آ جائے گی اور اسے خوشی تھی کہ ایک سال بعد اسے ضرورت محسوس ہوئی تھی اور اب وہ اپنا گھر خرید نہیں سکے گی تو کیا ہوا وہ تبدیل تو کر ہی لے گی اور ان پیسوں میں کچھ نہ کچھ تو بچ ہی جائے گا تو وہ ان بقایا پیسوں سے گھر کا فرنیچر اور دوسری چیزیں خرید لے گی......اس نے خوشی خوشی چیک لا کر حشمت کو دکھایا تھا۔

"یہ دیکھیں جناب" اس نے چیک ان کے سامنے لہرایا انہوں نے پکڑ کر دیکھا اور وہ حیران رہ گئے چیک پر اچھی خاصی رقم لکھی تھی۔

"یہ تمہیں کس نے دیا اور کب......" وہ حیران ہی تو ہوئے تھے۔

"بتول آپی دے گئی تھیں ابا جان نے دیا تھا کہ کچھ ضرورت کی چیزیں خرید لوں"

"تمہارے ابا جان آئے تھے کیا...... یا تمہاری بہن آئی تھی تم نے مجھے بتایا ہی نہیں ان کے لہجے میں یکلخت سنجیدگی در آئی تھی"

"کوئی نہیں آیا حشمت...... یہ بتول آپی نے مجھے ہماری شادی کے دوسرے ہی دن دیا تھا مگر مجھے کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی اور پھر مجھے یاد نہیں رہا کچھ اس کے بارے میں......" وہ سادہ سے لاپرواہ انداز میں کہہ رہی تھی مگر حشمت زیدی کو جی بھر کے برا لگا تھا انہیں امید نہیں تھی کہ وہ ان سے یوں چھپائے گی۔

"مگر تمہیں مجھے اسی وقت بتانا چاہیے تھا...... ہم اتنے دن مشکل حالات میں رہے ہیں اور پھر تم احمق عورت...... اتنے سے پر ہی راضی ہو گئیں...... کیا تمہارا حق ان کی لمبی چوڑی جائیداد میں سے صرف 20 ہزار ہی نکلتا ہے......"

"حشمت...... مجھے ان کی جائیداد میں سے کچھ نہیں چاہیے" مگر وہ اور بھی بھڑک گئے۔

"کیوں...... کیوں نہیں چاہیے اور پھر یہ احسان لینے کی بھی کیا ضرورت تھی......" ام کلثوم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے وہ چیک انہیں دکھایا ہی کیوں اسے تو یہ خدشہ تھا کہ وہ بہت زیادہ بگڑیں گے کہ اس نے وہ چیک لیا ہی کیوں مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس لیے لڑیں گے کہ اتنے کم پیسوں کا چیک کیوں لیا...... وہ دم بخود رہ گئی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے...... میں یہ چیک واپس بھجوا دیتی ہوں......" ام کلثوم کو بروقت یہ سوجھا اس نے چیک ان سے لینا چاہا مگر انہوں نے واپس لے کر جیب میں رکھ دیا۔

"رہنے دو...... صبح میں کہوں گا علیم الدین بھائی سے کہ کسی اچھے علاقے میں مکان ڈھونڈ کر دیں" انہوں نے اس کی ذات پر احسان عظیم کیا تھا۔

"سچ...... آپ سچ کہہ رہے ہیں حشمت تھینک یو سو مچ......" وہ انکا ہاتھ تھام کر فرط مسرت سے لبریز لہجے میں کہنے لگی تھی مگر بہت دن گزر گئے اس کا خواب خواب ہی رہ گیا تھا...... وہ ہر روز حشمت سے اپنے گھر کا پوچھتی مگر وہ کہتے کہ ڈھونڈ رہے ہیں ابھی گھر نہیں ملا ...... تین ماہ گزر گئے ایک دن تنگ آ کر اس نے وہ چیک مانگا تو حشمت نے ٹھنڈے لہجے میں جو بتایا اس کی ٹانگوں سے زمین نکال کر لے گیا تھا۔ اس نے وہ چیک اس لیے مانگا تھا کیونکہ وہ ابھی تک بری کے بنائے گئے چند جوڑوں میں ہی گھوم رہی تھی اس نے کوئی ڈھنگ کا جوڑا نہیں بنایا تھا شدید گرمی میں بھی اس نے وہی کپڑے پہنے رکھے تھے...... مگر وہ بھی اب تو گھس گھس کے بے حال ہو چکے تھے اس کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ پیسے نکلوا کر کپڑے بنا لے مگر حشمت نے اسے بتایا تھا کہ اس نے وہ چیک تین ماہ پہلے ہی کیش کروا لیا تھا...... اور اگر اس نے وہ

چیک کیش کروالیا تھا تو پھر اس کا گھر کہاں تھا......اور وہ پیسے اس نے استعمال کہاں کیے تھے اگر گھر نہیں ملا تھا تو اس نے پوچھ بھی لیا تھا۔

''جس انجمن سے میں منسلک ہوں اس کو فنانشل سپورٹ کی ضرورت تھی تو میں نے کچھ پیسے انہیں دے دیے کچھ گھر کے خرچ میں صرف ہو گئے'' ان کا انداز لاپرواہ سا تھا۔

''مگر حشمت......سارے پیسے ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی......وہ پیسے تو ہمارے گھر کے لیے تھے'' اسے ازحد دکھ ہو رہا تھا

''تو کیا اتنے سے پیسوں سے گھر آ جانا تھا کیا......اپنے باپ سے اور پیسے منگوالو......'' اور گھر خرید لیں گے......اچھا اور بڑا سا'ان کو جیسے فکر ہی نہیں تھی کہ انہوں نے ام کلثوم کا دل دکھایا ہے۔

''حشمت......کیوں کیا آپ نے ایسا......اور پھر ہماری ایسی کیا حیثیت کہ ہم انجمن کو اسپورٹ کر سکیں۔''

''میں لیڈر ہوں ترقی پسند مصنفین انجمن کا......اور یہ میرا فرض تھا کہ پہلا دیا میں اپنے گھر سے جلاتا'' ام کلثو کی آنکھ سے بے ساختہ آنسو بہہ نکلے اسے حشمت زیدی کی بے حسی تکلیف دے رہی تھی اسے دکھ ہوا تھا کہ انہیں ام کلثوم کے جذبات کی مطلق پرواہ بھی نہیں تھی انہیں احساس تک نہیں تھا بڑے پرسکون انداز میں کہہ کر اس کے سکون کو تہہ و بالا کر گئے تھے ام کلثوم کچھ کہہ نہیں پائی اور احساسات و جذبات کا گہرا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے حشمت زیدی اس کی خاموشی کو سمجھ تک نہیں تھا وہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی تھی اور وہاں بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کے روئی تھی اسے حشمت زیدی سے ایسی توقع بہرحال نہیں تھی انہیں اس بات کا احساس تو تھا کہ جس انجمن کے وہ لیڈر ہیں اسے وہ سپورٹ کریں مگر انہیں اپنے گھر کی ضروریات اور دگرگوں حالت نظر نہیں آتی تھی......اس اکلوتے کمرے کی پلستر اکھڑی سیلن زدہ دیواروں کی بدبو......بے رنگ اور پرانا قدرے بھدا نظر آتا فرنیچر......اڑا ہوا دیواروں کا رنگ......برآمدے کا اکھڑا فرش......کچن کی بھربھری ہو کر روز بروز بکھرتی سلیب......انہیں ایسا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

''اب اٹھ بھی جاؤ......کس کا سوگ بنا رہی ہو وہ تھوڑی دیر بعد کمرے میں آئے تھے بے حد تلخی سے استفسار کرتے ہوئے وہ ام کلثوم کی دلی و ذہنی کیفیت سے قطعی طور پر لاتعلق نظر آ رہے تھے۔''

''کھانا دو......مجھے بہت بھوک لگی ہے......'' ام کلثوم کو غصہ آ گیا تھا۔ گھر میں تین دن سے راشن ختم تھا اور وہ حشمت سے کہہ کہہ کے تھک چکی تھی اور انہوں نے آج صبح بھی لا کر نہیں دیا تھا وہ تڑکے ہی ٹی ہاؤس چلے گئے تھے اور اب اکثر ہی وہ جلدی چلے جایا کرتے اور رات گئے لوٹا کرتے تھے۔

''کہاں سے لاؤں کھانا......گھر میں ایک چٹکی زہر تک نہیں جو میں ان حالات سے تنگ آ کر پھانک لوں۔ وہ بھی غصے میں آ گئی تھی بہت عرصے بعد اس کے اندر کی جذباتی اور ضدی ام کلثوم نے سر ابھارا تھا......مگر حشمت زیدی اس کے ایسے رویے کے عادی نہیں تھے۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو......اگر اتنی ہی تنگ ہو ان حالات سے تو چلی کیوں نہیں جاتیں اپنے ماں باپ کے گھر......وہاں تو روپے

پیسے کی کمی نہیں ہوگی تجھے......'' ام کلثوم تو دم بخود رہ گئی تھی اسے امید نہیں تھی کہ حشمت اسے یوں جانے کو کہہ دیں گے۔

''چلی جاؤں'' اس نے دکھ سے دہرایا ''آپ نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ چلی جاؤں جو کچھ میں آپ کے کہنے میں آ کر ان کے ساتھ کر چکی ہوں اب کوئی گنجائش رہ گئی ہے کیا میرے واپس جانے میں'' وہ دکھ سے چور ہوتی کہہ گئی تھی مگر اس کی یہ بات حشمت زیدی کو تازیانے کی مانند پڑی تھی وہ بلبلا اٹھے تھے۔

''میں ورغلا کے نہیں لے گیا تھا تمہیں......نہ ہی میں نے تمہاری منت کی تھی تم خود آئی تھیں میرے پاس......تم جیسی امیر گھروں کی لڑکیوں کو عادت ہوتی ہے ہمارے جیسے غریب گھرانے کے مردوں کے عشق میں گرفتار ہو کر ماں باپ کی عزت نیلام کرنے کی......اور برے ہم بن جاتے ہیں......'' وہ بھی طیش کے عالم میں بکنے لگے تھے ان کی نوک جھونک اب سنجیدہ رخ اختیار کرتی جا رہی تھی......اور سچ تو یہ ہے کہ خالی پیٹ محبت کی بھی نہیں جا سکتی۔

''حشمت......آپ میری محبت کی توہین کر رہے ہیں......میں نے کب کہا کہ میں تنگ ہوں اور کب شکایت کی آپ سے آپ جن حالات میں رکھ رہے ہیں میں رہ رہی ہوں میں نے کب کی آپ سے شکایت......پورا سال گزر گیا مجھے اپنی بری کے چار جوڑوں کو پہنتے ہوئے اب تو وہ بھی گھس گھس کر بدرنگ ہو چکے ہیں......'' وہ سسک اٹھی تھی۔

''تو جاؤ اور جا کر میری غریبی کے پوسٹر لگوا دو زمانے میں......کہ نامور لکھاری کی بیوی بری کے بدرنگ اور گھسے ہوئے چار جوڑوں میں سال بھر سے گزارہ کر رہی ہے'' وہ بھڑک گئے تھے۔

''غلط بھی نہیں ہے......اور ہاں یہ میرا ہی قصور تھا میں نے اپنے ماں باپ کا دل دکھایا تھا مجھے اپنی کرنی کو بھرنا تو تھا ہی ناں......'' آج تو ام کلثوم کے ضبط کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا تھا وہ بھی دوبدو جھگڑا کر رہی تھی۔

''تو پھر چلی کیوں نہیں جاتیں اپنے باپ کے گھر......تا کہ مجھے بھی کوئی سکون ملے......بندہ گھر میں سکون کیلئے آتا ہے اور تم ہو کہ آتے ہی بے سکون کر دیتی ہو......کیا نہ آیا کروں میں گھر......میں ہی چلا جاتا ہوں گھر سے......تم راضی ہو جاؤ......بس کسی طرح سے......'' وہ گرجتے ہوئے گھر سے نکل گئے تھے ام کلثوم بے بسی سے رو دی......وہ اس کو ہی غلط کہہ گئے تھے اور ام کلثوم حق پر ہوتے ہوئے بھی غلط تھی......وہ ساری رات گھر نہیں لوٹے تھے ام کلثوم جب رو رو کے تھک چکی تو اسے حشمت کے نہ لوٹنے کی پریشانی لاحق ہونے لگی اس کا جی چاہا وہ ان کے پیچھے جائے ان کا پتہ کرے ان کو جا کر ڈھونڈے انہیں منا کر لائے مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکی کیونکہ اسے خبر نہیں تھی کہ وہ اس وقت کہاں تھے......مگر وہ ٹی ہاؤس میں ہی تھے ساری رات انہوں نے سفید پتھر کی چوکور میز پر بیٹھ کر سگریٹ پھونک پھونک کے گزاری تھی......جب غصہ اترا تو احساس ہوا کہ وہ غلط کر آئے ہیں مگر وہ ساتھ ہی ایک فیصلہ کر کے اٹھے تھے۔

☆☆☆

گھر واپس آتے ہوئے وہ ازالے کے طور پر نان اور پوریاں لائے تھے وہ جانتے تھے ام کلثوم کو ایسا ناشتہ بے حد مرغوب ہے ......دودھ چائے پتی چینی اور دیگر اشیائے خورد ونوش کا سامان بھی لائے تھے ان کی یہ بیوقوفی تھی کہ انہوں نے گھر پر توجہ دینا ہی چھوڑ دی تھی ......انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو دروازے کی دستک پر بے تابی سے کان لگائے ام کلثوم فوراً اٹھی تھی ......حسب توقع حشمت ہی تھے ......اس کی ویران آنکھوں میں پھر سے پانی جمع ہونے لگ گیا وہ درمیان سے ہٹ گئی۔

"کیسی ہو......"انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اس سے پوچھا تو ام کلثوم کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی لڑیوں کی مانند ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے تھے انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

"ناراض ہے میری جان"انہوں نے اپنا بازو اس کے کندھوں کے گرد حمائل کرتے پوچھا تو ام کلثوم اس التفات پر اور زیادہ بکھر گئی تھی۔

"کیوں سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کرتی ہو......وہ دن دور نہیں جب تم پیسے میں کھیلو گی ......ایک بہترین بنگلہ خرید کر تمہارے نام کر دوں گا بہت جلد تمہیں ایک خوشخبری سنانے والا ہوں......ایک ڈرامہ لکھنے کی آفر ملی ہے ان دنوں......بہت پیسہ آجائے گا اب اٹھو اور جا کر ناشتہ لے کر آؤ بہت بھوک لگی ہے مجھے......"مگر وہ اٹھی نہیں وہیں جمی بیٹھی رہی۔ حشمت زیدی اٹھ کر خود کچن میں گئے اور نکال کر کھانا لائے ......اس روز خود ہی انہوں نے ام کلثوم کو کھانا کھلایا......وہ برستی آنکھوں سے ان کے ہاتھ سے نوالے منہ میں ڈالتی رہی اور سوچتی رہی۔

"کیا حشمت زیدی کی کہی گئی ان باتوں کی تکلیف کا ازالہ ان کے اس التفات سے ہو سکتا ہے اس کا دل و دماغ نفی میں شور مچانے لگا تھا اور وہ برستی آنکھوں سے نوالہ چبانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ابھی تو آغاز ہوا تھا انجام جانے کب اور کس طرح کا ہونا تھا......کوئی کیسے جان سکتا تھا"

"چند دن مزید سرکے جب ایک روز حشمت زیدی اس سے کسی کو ملوانے کے لیے لائے تھے ان دنوں انہوں نے اس کا بہت زیادہ خیال رکھا تھا ام کلثوم مطمئن رہنے لگی تھی مگر اس کا اطمینان عارضی ثابت ہوا تھا اس وقت جب وہ وکیل کے ہمراہ اس سے ملنے آئے تھے......وہ تو اکثر رات گئے گھر لوٹا کرتے تھے ام کلثوم اس روز انہیں سر شام ہی گھر میں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔"

"دو کپ چائے بنا کر جلدی لے کر آؤ"انہوں نے آتے ہی آرڈر جاری کیا جس کی تکمیل میں وہ فوراً کچن کی جانب دوڑی تھی جب وہ چائے بنا کر گئی اس وقت وکیل کچھ کاغذات پھیلائے اس کی آمد کا منتظر تھا۔

"لو......ان پر دستخط کر دو......"انہوں نے وہی فائل اس کے سامنے کر دی تھی۔

"یہ کیا ہے؟"اس کی آواز مزید دھیمی ہو گئی ذہن و دل میں یکلخت آندھیاں چلنے لگی تھیں۔

"یہ تمہاری بقا کی جنگ ہے تمہارے حق کی لڑائی ہے......اور یہ جنگ تمہیں لڑنی ہے ام کلثوم اپنا حق لینا ہے"ام کلثوم ان کی بات

سمجھ نہیں سکی وہ کس کی بات کر رہے ہیں

”میرا حق......کونسا حق اور کیسی جنگ؟“

”ثوما جان......تم اپنے والدین پر کیس کرو گی اپنے حصے کی جائیداد کے حصول کا“ انہوں نے بے حد نرمی سے اس کے حواسوں پر بم پھوڑا تھا وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

”میں وکیل صاحب کو ساتھ اسی لیے لے کر آیا ہوں......“ سارے کاغذات مکمل ہیں ہم اپنا حق لیں گے۔

”تمہاری ہر خواہش پوری ہوگی......کوئی آرزو تشنہ نہیں رہے گی“ ام کلثوم کو اس سے ان سے بے حد کراہت محسوس ہوئی تھی وہ خوشبو بھری مہکتی باتیں لکھنے والے کس قدر ذہنی گراوٹ کا شکار تھے ان کے جذب سے بھرپور لہجے میں ام کلثوم کو سانپ کی پھنکار محسوس ہو رہی تھی وہ کس قدر خود غرض تھے ابھی کیا کمی رہ گئی تھی جو وہ مزید اپنے والدین کو رسوا کرتی......اس نے تو پہلے ہی انہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا اور اب حشمت زیدی انہیں عدالتوں کے چکر میں الجھا رہے تھے اسکا باپ جو اس قدر معزز تھا جس نے ساری زندگی لوگوں کے کیس لڑے تھے ان کے فیصلے کیے تھے اور آج ام کلثوم کا انتخاب ان کو عدالت میں چیلنج کرنے کی بات کر رہا تھا وہ ایک مرتبہ پھر ام کلثوم کی طرف سے انہیں ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلی بار ام کلثوم کی محبت کو اپنے انتخاب پر شرمندگی ہوئی اور از حد ہوئی......اس کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا اور پھر ہلتا چلا گیا۔

”میں ان کاغذات پر ہرگز سائن نہیں کروں گی، اس نیقطعتسے انکار کر دیا تھا اپنی اور صرف اپنی عزت کی بہت پرواہ کرنے والے حشمت زیدی کو اس سے بہت سبکی محسوس ہوئی“

”کیا بکواس کر رہی ہو......“ وہ ہولے سے اس کے کان کے پاس غرائے۔ وکیل کا خیال نہ ہوتا تو شاید گدی سے پکڑ کر نیچے جھکا دیتے۔

”میں......ان کاغذات......پر دستخط نہیں کروں گی“ جواباً اس نے ایک مرتبہ پھر ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر ادا کرتے کہا تھا۔

”ثوما جان......یہ ہماری بہتری کے لیے ایک اقدام ہے جو میں کر رہا ہوں تمہارے لیے......“ انہوں نے اچانک ہی پینترا بدلا تھا جانتے تھے دال ایسے نہیں گلے گی۔

”آپ جو بھی کہیں حشمت......مگر میں یہ سب نہیں کروں گی کبھی بھی نہیں“ وہ مڑ کر اندر چلی گئی حشمت زیدی نے لب بھینچ لیے وکیل اٹھ کے ان کے نزدیک آیا۔

”حشمت صاحب......میں چلتا ہوں آپ نے خوامخواہ میں میرا اتنا وقت برباد کیا پہلے بیوی کو تو راضی کر لیتے آپ......“ تابوت میں آخری کیل وکیل کی بات نے ٹھونک دیا تھا وہ جیسے تیسے اسے رخصت کر کے اندر آئے اندر کلثوم بیٹھی اپنے نصیبوں کو کوس رہی تھی۔

''ہاں اب بول منحوس عورت......ابھی باہر کیا بکواس کر رہی تھی تو......'' وہ اس کے ان ریشمی لہرے دار بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر کھینچے تھے جن کی مسحور کن خوشبو کی چاہ میں وہ صفحات کالے کر دیا کرتے تھے انہوں نے اس کے پھولوں جیسے گال پر تھپڑ کس کر مارا تھا جس کی رعنائی و دلکشی بیان کرتے وہ زمین و آسمان کے قلابے ملا دیا کرتے تھے وہ الفاظ کا سحر نہیں تھا اس وقت وہ محبت کا سحر تھا جو ان کی تحریر کو جگمگا دیا کرتا تھا اور خواتین کی اکثریت اپنی اس قدر عزت و تکریم پر اپنے خون سے ستائشی خط لکھا کرتی تھیں اگر وہ اس سے اس ساحر کے منہ سے نکلتے آگ اگلتے الفاظ سن لیتیں تو شاید اپنے کانوں میں سیسہ انڈیل کر خود کو بہرہ کرنا زیادہ پسند کرتیں اور وہ حشمت زیدی کی تحریریں پڑھنے کی بجائے اپنی آنکھوں کو اندھا کرنے کو زیادہ ترجیح دیتیں۔ وہ اسے مار رہا تھا بے تحاشہ......بے حد و بے حساب......ام کلثوم کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو پگھلے اس کی چیخیں حلق میں ہی گھٹ گئی تھیں۔

''بہت زبان درازی کرنے لگی ہے ناں تو......گدی سے کھینچ لوں گا تیری زبان اگر اب بکواس کی تو''

''میں اپنے باپ کو مزید رسوا نہیں کروں گی......چاہیں آپ مجھے جان سے ماردیں'' وہ گھٹی گھٹی چیخوں میں بس اتنا ہی بول پائی مگر اس کا اتنا کہنا ہی غضب ہو گیا تھا چار چوٹ کی مار کے ساتھ مغلظات کا طوفان تھا جو حشمت زیدی کے منہ سے اگلا تھا مگر ام کلثوم کی ایک ہی رٹ تھی وہ اپنے باپ کے ساتھ مزید کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''جان تو میں تیری نکال دوں گا......یہ تیری بھول ہے کہ اب کبھی تو واپس اپنوں سے ملے گی، اگر تو یہ چاہتی ہے کہ تیری معافی تلافی ہو جائے تو پھر بھول جا......تیری ساری کشتیاں میں اپنے ہاتھوں سے جلا دوں گا'' وہ اسے ٹھوکر مار کر نیچے گراتے کہہ رہے تھے۔ام کلثوم اپنی جگہ ساکت رہ گئی غصے میں وہ اپنے دل کی بات واضح عیاں کر گئے تھے۔

ام کلثوم اپنے انتخاب کو دیکھتی رہ گئی جس باپ کی عزت اس نے محبت کی خاطر اچھالی تھی اسے بھرے بازار میں رسوا کر دیا گیا آج وہی محبت اس کو پچھتانے پر مجبور کر رہی تھی......اس کے حالات آئندہ آنے والے دنوں میں سلجھنے کی بجائے مزید الجھ گئے تھے......حشمت زیدی کئی کئی دن گھر نہ لوٹتے......وہ بھوکی پیاسی گھر کے کونے کھدرے میں بے حس و حرکت پڑی رہتی دنوں میں وہ مرجھا کر رہ گئی تھی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں رنگت میں زردی کھنڈ گئی اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا وہ سندر رنگت والی نازک اندام ام کلثوم کہیں کھو سی گئی تھی محبت نے اس کے شباب کو نگل لیا تھا۔

دروازے پر بہت دیر سے دستک ہو رہی تھی......ام کلثوم نے اپنی ہمت مجتمع کر کے خود کو اٹھانے کی سعی کی ٹانگوں میں واضح لرزش اسے کھڑا ہونے نہیں دے رہی تھی وہ تین دن سے بھوکی تھی اور حشمت زیدی تین دن سے گھر نہیں لوٹے تھے......اس نے جا کر دروازہ کھولا تو ٹھٹک گئی سامنے علیم الدین کھڑے تھے ام کلثوم نے بے ساختہ دوپٹہ سر پر جما کر دایاں گال چھپایا جس پر نیل پڑا تھا علیم الدین صاحب نے اسے بے حد دکھ سے دیکھا ان کے گھریلو حالات اور حشمت زیدی کی ظلم کی داستان کسی طور پر بھی ان کی نگاہوں سے مخفی نہیں تھی اور وہ

جانتے تھے کہ اس کا سبب کیا چیز ہے......انہوں نے خاموشی سے شاپر ام کلثوم کی جانب بڑھایا۔

''بٹیا......ایک بات کہیں آپ سے......وہ جاتے جاتے پلٹ کر آئے تو ام کلثوم نے بے ساختہ سر اثبات میں ہلا دیا اور انہیں اندر آنے کا راستہ دیا......'' وہ برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''حشمت زیدی آج کل کسی نئی عورت کے چکر میں تھے وہ لاہور شہر کی ابھرتی ہوئی شاعرہ تھی جو شاعری کم مگر اپنے تعلقات اور اختیار زیادہ استعمال کرنے کی قائل تھی آج کل اپنے التفات حشمت زیدی پر نچھاور کر رہی تھی وہ ہر جگہ ان کے ساتھ جاتی تھی اور ان دونوں کی آپسی بے تکلفی التفات اور دوستانہ تعلقات کسی سے بھی ڈھکے چھپے نہیں تھے......ٹی ہاؤس میں حشمت زیدی کے خلاف ہونے والی چہ مگوئیاں ان کے کردار کی دھجیاں بکھیر دینے کو کافی ہوتی تھیں سبھی کو معلوم تھا انہوں نے ام کلثوم کے ساتھ شادی کیسے اور کن حالات میں کی تھی سو اب اتنی جلدی ان کا پہلی شادی سے دل بھر جانا اور دوسری عورتوں کے چکر میں پڑنا ان کے کردار کو زیب نہیں دیتا تھا ان کی شخصیت کو گرہن لگ رہا تھا مگر انہیں خبر نہیں تھی''

''کہیے بھائی صاحب! ام کلثوم نے انہیں چپ بیٹھے دیکھ کر استفسار کیا تو وہ گہری سانس بھر کر رہ گئے تھے وہ بھلا اسے کیسے بتاتے کہ جس شخص کی خاطر انہوں نے اپنی ساری کشتیاں جلا دی تھیں اس نے بیچ منجدھار میں ہی اسے ڈوبنے کو چھوڑ دیا تھا''

''تم بالکل میری بیٹیوں جیسی ہو ام کلثوم......اور ایک بڑے بھائی اور باپ ہونے کی حیثیت سے میں یہ بات تمہیں سمجھا رہا ہوں......خود کو اکیلا مت سمجھنا کوئی بھی مسئلہ ہو مجھ سے آ کر کہنا......اور گھر میں کوئی مسئلہ ہو جائے تو اسے مل بیٹھ کر سلجھا لینا چاہیے......اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے ورنہ باہری دنیا کے غاصب گھات لگائے اس گھر کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں ان سے بچاؤ کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے سلجھاؤ مل بیٹھ کر اپنی انا کو بالائے طاق رکھ کر حالات کے سدھار کی کوشش کرنا......ورنہ گھر ٹوٹ جاتے ہیں تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات، ام کلثوم نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلایا مگر بولی کچھ بھی نہیں علیم الدین بھائی اسے کیا سمجھانا چاہ رہے تھے اس کے گھر کو کس سے خدشہ تھا اس کی خوشیوں کا کون غاصب تھا......سوالات کا ایک ہجوم تھا جو اس کے ذہن میں شور مچا رہا تھا......اسی شام وہ خود سے ٹی ہاؤس جانے کے ارادے سے تیار ہو کر نکلی تھی اس نے علیم الدین بھائی کی باتوں کا اثر لیا تھا انہیں سمجھا تھا اور اسی لیے وہ حشمت زیدی کو منانے کے لیے جا رہی تھی......اسی جگہ جہاں پہلی بار وہ ان سے ملنے گئی تھی جہاں ان دونوں کی محبت کی داستان پروان چڑھی تھی جہاں انہوں نے ایک دوسرے کو جانا تھا جہاں ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں'' ام کلثوم کو یقین تھا آج وہیں بیٹھ کر وہ اپنے مسائل حل کر لیں گے......وہ اپنی محبت کو مرنے نہیں دیں گے وہ اپنی محبت کا مان ٹوٹنے بکھرنے نہیں دیں گے، اسے اپنے گھر کو بچانا تھا ان تمام غاصبوں سے جو گھات لگا کر بیٹھے تھے......وہ مرکزی دروازے تک آتے آتے خود سے عہد کر رہی تھی وہ آج حشمت کو منا کر ہی جائے گی وہ جتنا بھی غصہ کر لیں گے وہ انہیں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ کر بھی ساتھ لے جائے گی وہ انہیں سمجھائے گی کہ وہ بہت تھوڑے میں گزارہ کر سکتی

ہے......وہ خودنوکری کرسکتی ہے......وہ جیسے تیسے انہیں سمجھا لے گی کہ اسے اپنے والدین سے تعلق نہیں رکھنا اسے ان کی جائیداد سے کوئی لینا دینا نہیں ہے اسے دولت کا کوئی لالچ نہیں ہے اس کے قدم ٹھوکر لگنے سے رکے تھے ام کلثوم نے بے ساختہ دروازہ تھام کر سامنے کا دھندلا منظر دیکھا......وہ ساکت ہوگئی کائنات تھم گئی اس کی سانس رک گئی بس وہ مری نہیں تھی سامنے حشمت زیدی شیشے والی کھڑکی کے پاس ایک طرحدار لڑکی کو بغل میں لیے بیٹھے تھے شاید وہ اس کا ہاتھ دیکھ رہے تھے اور ادبی سرگوشیاں کررہے تھے اور جواباً وہ شرم سے سرخ پڑ رہی تھی ام کلثوم کا مان، فخر وغرور آن واحد میں بکھرا......اس نے اپنی محبت کو کسی اور کے ساتھ محو کلام دیکھا......محبت و پیار کے والہانہ مظاہرہ کرتے دیکھا......اس کی محبت کبھی یہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ حشمت اس سے بے وفائی کے مرتکب بھی ہوسکتے ہیں ان کی محبت اتنی جلدی فقت ایک سال میں اپنی کشش کھوسکتی ہے وہ یوں ایک دوسرے سے صدیوں کے فاصلوں پر بھی جاسکتے ہیں......ام کلثوم کو وہیں کھڑے علیم الدین بھائی کی باتیں سمجھ میں آنے لگیں......تو کیا وہ جانتے تھے کہ ان کے گھر کو کسی غاصب کا خدشہ تھا اور اس غاصب کو راہ دکھانے والا خود اس کا شوہر ہی تھا......تکلیف ہی تکلیف تھی بے تحاشہ اذیت وہ الٹے قدموں وہاں سے لوٹ آئی بازار میں چلتے وہ گرتے پڑتے بس جیسے تیسے قدم اٹھا رہی تھی اس کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کی دھند بڑی تیزی سے تن رہی تھی......مگر وہ بکھری بکھری دور سے ہی لٹی پٹی نظر آرہی تھی......ہاں اسے اعتراف تھا کہ وہ لٹ چکی تھی اسے اس کی محبت کے انتخاب نے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا تھا اس کی کشتیاں جل چکی تھیں واپسی کے سارے راستے بند تھے اور خود وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی تنہا اور ویران۔

علیم الدین بھائی نے کاؤنٹر کے پیچھے سے اسے مرکزی دروازے سے لوٹتے دیکھ لیا تھا وہ بے ساختہ اس کے پیچھے دوڑے تھے ......انہیں اس کو روکنا تھا اس کی ذہنی حالت مخدوش ہوگئی تھی وہ جانتے تھے کہ محبت کرنے والوں کیلئے بے وفائی کا بار اٹھانا بہت مشکل ہوتا ہے جان لگانی پڑتی ہے مگر چین کسی طور کسی پل نہیں پڑتا......

ام کلثوم پاگلوں کی طرح سیدھی سڑک پر چل رہی تھی اس کا دوپٹہ سر سے ڈھلک کر شانے پر اٹک گیا تھا مگر وہ ارد گرد سے بے نیاز کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائے آگے کی جانب بڑھ رہی تھی......تبھی اچانک سے بہت زور کا چکر آیا تھا اس سے پہلے کہ علیم الدین بھائی اس تک پہنچتے وہ نیچے گر چکی تھی اور اس کے گرتے ہی بے ساختہ آنے والی گاڑی نے بریک لگائی تھی علیم الدین بھائی نے بے ساختہ آنکھوں پر بازو رکھ کر خود کو اس اندوہناک منظر سے نظریں چرانے کی کوشش کی......اگر بروقت گاڑی کو بریک نہ لگتے تو وہ قطعی نہ بچ پاتی......وہ شاید کوئی بھلا مانس انسان تھا جو گاڑی سے نکل کر ام کلثوم کو اٹھانے نکلا تھا وہ اپنے ڈرائیور کے نکلنے سے بھی پہلے نکلا تھا......وہ اس شہر کے ہائی کورٹ کے معزز ایڈیشنل جج تھے......وہ ام کلثوم کے ابا جان تھے......اور وہ جتنا بھی ناراضگی کا اظہار کرتے مگر ان کا غصہ جھاگ کی طرح سے آن واحد میں بیٹھ گیا تھا ان کا کلیجہ پھٹ گیا تھا اپنی ام کلثوم کو اس حالت میں دیکھ کر......پورے ایک سال بعد وہ اسے دیکھ رہے تھے اور انہیں خود پر بے تحاشہ غصہ آیا انہیں اپنی لاعلمی پر تاؤ آیا تھا انہوں نے کیوں لاپروائی کی تھی بچے تو غلطیاں کرتے ہیں والدین کو ہمیشہ ہی اپنا

دل اور ظرف وسیع رکھنا پڑتا ہے پھر وہ تو جانتے تھے حشمت زیدی کی فطرت و اوقات......انہیں تو در پردہ ہی سہی مگر ام کلثوم کا خیال رکھنا چاہیے کیا خبر کس وقت اسے ان کی ضرورت پڑ جاتی......اور اس کی مخدوش حالت انہیں احساس دلا رہی تھی وہ کس قدر غلط تھے انہوں نے انجانے میں کتنا ظلم کیا تھا......سچ ہی کہتے ہیں غصہ عقل کا دشمن ہوتا ہے......انہوں نے بے ہوش پڑی ام کلثوم کو گاڑی میں اٹھا کر ڈالتے دلگرفتی سے سوچا تھا۔علیم الدین بھائی واپس لوٹ گئے اب انہیں کوئی فکر نہیں تھی ام کلثوم محفوظ ہاتھ میں پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆

اسے جب ہوش آیا تو وہ ایک انجانے کمرے میں لیٹی تھی......اس کا ذہن خوابیدہ اور آنکھوں کے پپوٹے قدرے بھاری تھے اس نے آنکھیں کھول کر اس کمرے کی شناخت کرنا چاہی مگر کر نہیں سکی......تبھی ایک جانا پہچانا روح کو سرشار کرتا لمس اس نے محسوس کیا تھا اس کے بالوں میں کسی مہربان وجود نے انگلیاں پھیریں تھیں اس کے اندر یکلخت سکون کے جھرنے بہنے لگے تھے اس نے خود کو تپتے صحرا سے آن واحد میں نخلستان میں محسوس کیا اس کے اندر سکون اور اطمینان کے سوتے پھوٹ پڑے اس کی آنکھوں سے گرم سیال بہنے لگا اس نے آنکھیں کھول کر بے ساختہ اس مہربان وجود کو دیکھنے کی کوشش کی جس کے لمس کو جس کے احساس کو وہ کروڑوں میں پہچان سکتی تھی جس کے لیے وہ ترس رہی تھی اس نے پوری قوت صرف کر کے آنکھیں کھولیں......اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ کا حلیم پر شفقت چہرہ تھا......ام کلثوم کا دل کٹ کٹ کے گرا......اس کے ابا جان بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے وہ اس کو دیکھ کر غصہ نہیں تھے بلکہ اس کی حالت پر غمگین تھے ام کلثوم نے بالکل بھی جاننے کی کوشش نہیں کہ وہ یہاں کیسے اور کس طرح پہنچی بلکہ وہ اس احساس کو محسوس کرنا چاہتی تھی جس کے لیے وہ بے تاب تھی......اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی والدین کو کچھ بتانے کی ضرورت کبھی پڑتی بھی نہیں وہ دل کی بات جان جایا کرتے ہیں وہ بچوں کی غلطیاں معاف کر دیا کرتے ہیں جیسے ام کلثوم کی غلطی معاف کر دی گئی تھی جیسے وہ اپنوں میں لوٹ آئی تھی۔

علیم الدین کے بتانے پر حشمت زیدی کو ام کلثوم والے واقعے کی خبر ہوئی تھی......انہیں ندامت نہیں ہوئی کہ ام کلثوم انہیں اس شاعرہ کے ساتھ دیکھ کر دلگرفتہ ہوگئی ہے بلکہ انہیں علیم الدین پر غصہ تھا انہوں نے بروقت انہیں بتایا کیوں نہیں تھا کہ ام کلثوم سڑک پر بے ہوش ہو کر گری ہے۔

”حد ہے علیم الدین صاحب......کم از کم آپ کو تو ہماری عزت کی پرواہ کرنی چاہیے تھے“ وہ بھڑ کے تھے۔

”مجھے کوئی دکھ نہیں اس بات کا......بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ام کلثوم بٹیا اب محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں انہیں اس وقت اپنوں کی توجہ اور محبت کی ضرورت ہے اور آپ کو جانا چاہیے ان کی خبر گیری کرنے کے لیے......“

”کیسے جاؤں وہاں دوبارہ......اس کے باپ کو آپ جانتے ہیں ناں کیسا ہتک آمیز سلوک وہ کر سکتے ہیں ہمارے ساتھ......میں وہاں قطعی نہین جا سکتا انہیں اپنی عزت وانا بہت عزیز تھی ام کلثوم سے کہیں زیادہ“

''بٹیا تو ٹوٹ جائیں گی اگر آپ ان کی خبر گیری کے لیے نہ گئے تو......''

''اور جو میری عزت کا جنازہ نکلے گا اس کا کیا......'' وہ تن کر کھڑے ہو گے تھے۔

''تو پھر آپ اطمینان سے بیٹھ کر یہ فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کو محبت بچانی ہے یا غیرت'' ہم آپ کے لیے چائے لاتے ہیں......وہ یہ کہہ کر پلٹ گئے تھے مگر حشمت زیدی کو سوچوں کی یلغار میں گھیر کر......ام کلثوم کے لیے ان کے دل میں محبت ماند ضرور پڑ گئی تھی مگر مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی اور پھر وہ پہلی لڑکی تھی جس نے انہیں متاثر کیا تھا جس پر وہ دل ہارے تھے ورنہ عورتوں کی کمی انہیں کبھی بھی نہیں رہی تھی۔

''کچھ سوچا پھر؟'' علیم الدین چائے لے کر آئے تو انہیں سوچوں میں ہنوز گم دیکھ کر پوچھ بیٹھے۔

''ام کلثوم ہمارے دل میں بستی ہے علیم الدین صاحب......'' مگر وہ اٹک گئے۔

''محبت میں اگر مگر نہیں چلتے حضور......محبت اگر مگر لیکن ویکن سے مشروط نہیں ہوتی'' علیم الدین ہولے سے مسکرائے بڑی عجیب بات تھی محبت لکھنے اور تخلیق کرنے والے انسان کو ایک عام انسان محبت کرنا سمجھا رہا تھا۔

''تو پھر شام کو جا رہے ہیں ناں بٹیا کو لینے کے لیے'' وہ مسکرا رہے تھے۔ جانتے تھے ناں کہ ان کی لگائی گئی چوٹ پوری ضرب سے پڑی ہے۔ حشمت زیدہ حسب وعدہ شام کو ام کلثوم کو لینے کے لیے گئے تھے......وہ ڈرائنگ روم میں ام کلثوم کی آمد کے منتظر بیٹھے تھے اور یہ حشمت زیدی کی بدقسمتی تھی کہ ام کلثوم نے باپ کی ہمدردی و توجہ ملتے ہی انہیں ساری حقیقت کہہ سنائی تھی یہ ام کلثوم کی بے وقوفی تھی جو اس نے گھر کا بھرم توڑ دیا تھا کیونکہ بھرم اسی وقت تک قائم رہتے ہیں جب تک باتیں چار دیواری کے اندر رہیں جیسے ہی زبان سے الفاظ نکلیں وہ پرائے ہو جایا کرتے ہیں اور ہر انسان انہیں اپنے مطالب کے معنی پہناتا ہے اپنی سوچ اور فہم کے مطابق......ام کلثوم نے حشمت زیدی کے خلاف دل میں موجود نفرت میں کمی نہیں بلکہ اپنی سادگی و جذباتیت میں آ کے اضافہ کر دیا تھا......مسٹر انوار حسین مزید بھڑک گئے تھے۔ اسی لیے جب حشمت زیدی ام کلثوم سے ملنے کیلئے آئے تو انہیں روک دیا گیا تھا۔

''وہ تم سے ملنا نہیں چاہتی......'' مسٹر انوار حسین نے اسے ڈرائنگ روم میں آ کے بتایا تھا اور وہ جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے ام کلثوم ان سے اپنی محبت سے اس سمے اس قدر دلگرفتہ تھیں کہ انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا تھا جبکہ حشمت زیدی کو شاک لگا تھا انہیں وہ مسٹر انوار حسین کی کوئی چال لگی تھی۔

''میں نہیں مان سکتا کہ وہ ایسا کہہ سکتی ہے وہ بیوی ہے میری'' ان کے لہجے میں مان تھا مسٹر انوار حسین اس کے حد درجہ یقین پر تمسخر سے ہنسے۔

''اچھا......اچھا کو لمبا استہزائیہ انداز میں کھینچا......وہی بیوی جو تین دن سے گھر میں فاقے کاٹ رہی تھی اور تم ٹی ہاؤس میں کسی نئی عورت کے زلفوں کے اسیر ہو رہے تھے اور کیا وہی بیوی جس کی دگرگوں حالت اسے سڑک پر گر کر مرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور تمہیں پانچ

روز کے بعد پتہ چلتا ہے'' وہ حسب عادت اسے بھگو بھگو کر مار رہے تھے ان کا تو بس نہیں چل رہا تھا وہ سامنے کھڑے شخص کا خون کر دیتے۔

''دیکھیے محترم...... یہ ہم میاں بیوی کا آپسی معاملہ ہے...... اسے ہم خود مل بیٹھ کر سلجھالیں گے'' انہوں نے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔

''ہونہہ...... سلجھالیں گے...... کیا اس کی اس حالت کے بعد بھی تمہیں لگتا ہے کہ معاملات سلجھ جائیں گے......'' انہوں نے اس پر یہ طنز کا گھونسہ جڑ دیا تھا۔

''چلے جاؤ یہاں سے...... اور آج کے بعد ادھر کا رخ کبھی مت کرنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا بھول جاؤ کہ کسی ام کلثوم سے تعلق تھا تمہارا...... کیونکہ اب میں اپنی بیٹی کو اس قید خانے میں کبھی نہیں بھیجوں گا پہلے بھی جو میں کر چکا ہوں تو اس پر ہی بہت شرمندہ ہوں اب مزید کوئی غلطی نہیں دہرا سکتا......'' حشمت زیدی نے یکلخت ان کا فیصلہ سننے کے بعد کہا تھا۔

''اگر یہ سب کچھ ام کلثوم میرے سامنے کہہ دے تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا اور میں اپنی قسم کا بہت پکا انسان ہوں'' ان کی بلبلاتی اناء یکدم ہی انہیں جذباتی کر گئی تھی جو وہ اتنا بڑا دعویٰ کر گئے تھے انہیں یقین تھا ام کلثوم کی محبت پر اس کے باپ کا دعویٰ غلط ثابت ہونے والا تھا وہ اپنی متوقع فتح کو سوچ کر مسکرائے۔

''تمہیں جتنی جائیداد چاہیے میں دینے کو تیار ہوں مگر میری بیٹی کی زندگی سے نکل جاؤ'' انہوں نے اس کی لالچی فطرت کے پیش نظر اسے دانہ پھینکا تھا۔

''اس بات کا فیصلہ ام کلثوم کے آنے کے بعد ہوگا...... پہلے اس سے تو پوچھ لیں وہ جانا بھی چاہتی ہے یا نہیں......'' ام کلثوم کو بلایا گیا مگر وہ نہیں آئی تین بار بلانے پر وہ مجبوراً آئی حشمت زیدی کو اسے دیکھ کر بہت شرمندگی ہوئی تھی وہ دنوں میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی رنگت میں ہلدی گھنڈی ہوئی تھی آنکھوں پر گہرے حلقے تھے وہ ام کلثوم نہیں تھی جو کلیوں جیسی شباہت رکھتی تھی حشمت زیدی اس کی طرف بے تابانہ طور پر بڑھے تھے اور بس وہ ایک اضطراری لمحہ جس میں زمانہ شناس مسٹر انوار حسین نے وہ دیگر و دلگرفتہ فیصلہ کیا تھا انہوں نے سوچا تھا وہ حشمت زیدی کو ام کلثوم کو لے جانے کی اجازت دے دیں گے...... آخر وہ اس کی بیٹی کے شوہر تھے مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ حشمت زیدی کے نصیب ان کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔

''کیسی ہو ثوما جان......'' وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھے مگر ام کلثوم نے نفرت سے منہ موڑ لیا تھا۔

''ثوما جان......'' حشمت زیدی نے محبت کی تمام تر شدتوں سے پکارا جانے کس منہ سے؟

''مر گئی ثوما...... اسی روز جس روز اس نے آپ کو کسی اور کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھاتے دیکھا...... مر گئی اس روز ثوما جس دن اس نے اپنی آنکھوں سے محبت کا قتل ہوتے دیکھا تھا'' وہ ہانپنے لگی تھی وہ بہت زیادہ کمزور و لاچار ہو گئی تھی مسٹر انوار حسین خاموشی سے باہر نکل گئے۔

"میری بات تو سنو ثوما جان...... تمہیں غلط فہمی"

"نہیں...... مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی کم از کم اس مرتبہ...... آپ جیسا خود غرض سفاک اور لالچی انسان محبت کے قابل ہی نہیں تھا میں ہی غلط تھی جو سراب کے پیچھے بھاگتی رہی......"

"تم پچھتاؤ گی ثوما...... مجھے کچھ نہ کہنے کا موقع دے کر......" انہوں نے اپنی طبیعت کے برعکس تحمل کا مظاہرہ کیا تھا جبکہ وہ چیخ پڑی تھی۔

"میں پچھتا رہی ہوں حشمت زیدی...... اور دن میں ہزار بار اس فیصلے پر خود کو کوستی ہوں جس وقت میں اپنے باپ کی عزت نیلام کرنے آپ کے ساتھ گئی تھی" وہ جواباً پھنکاری تھی حشمت زیدی کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ان کا دماغ الٹ گیا۔

"اوہ...... تو اب محبت تمہارے لیے پچھتاوا بن گئی ہے؟" ان کے سنجیدہ طنزیہ لہجے کی گہرائی میں کہیں کہیں دکھ کی شدت تھی مگر ام کلثوم جذبات کی رو میں بہتے محسوس نہیں کر پائی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کی محبت نے مجھے ایک سال کی رفاقت میں سوائے پچھتاؤں کے اور کچھ نہیں دیا جو میں آپ کو لوٹا سکتی"

"گھر چلو ثوما جان...... ہم اپنے مسائل خود حل کر لیں گے" وہ پھر بھی اس کی طرف بڑھے تھے مگر ام کلثوم مزید چیخ گئی تھی۔

"گھر...... کونسا گھر...... وہ گھر جس میں سے آپ مجھے ہمہ وقت نکالنے کے درپے رہتے تھے میں نکل آئی آپ کے گھر سے ...... اب اس گھر اور آپ پر میرا کوئی حق نہیں...... چلے جائیں یہاں سے......"

"ثوما...... میں آخری بار کہہ رہا ہوں یہ یاد رکھنا کہ میں دوبارہ کبھی نہیں آؤں گا...... گھر چلو......" وہ انائیت پسندی سے دھمکی دینے والے انداز میں اسے ڈرا رہے تھے۔

"اپنی دھمکیاں اپنے پاس رکھیں مسٹر حشمت زیدی...... جائیں یہاں سے میں دیکھتی ہوں کہ کون ایسی عورت ہو گی جو آپ جیسے دولت کے پجاری خود غرض اور سفاک انسان کے ساتھ گزارہ کرتی ہے جو اس قدر بے حس ہے کہ اسے اپنے علاوہ کوئی نظر ہی نہیں آتا ...... جائیں ڈھونڈ لیں پھر کوئی ام کلثوم...... اور ہتھیانے کی کوشش کریں اس کی جائیداد۔ میں کم از کم اب کسی بہلاوے میں آنے والی نہیں " وہ روتے روتے چلائی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا اب، اب کچھ باقی نہیں بچا...... میری محبت کو رسوا کر دیا آپ نے...... اور یہ بات میری برداشت سے باہر ہے میں شرکت برداشت نہیں کر سکتی۔

"ٹھیک ہے تو پھر رہو اپنے اناء کے خول میں بند اور یاد رکھنا کہ میں دوبارہ نہیں آؤں گا...... میں دولت کا بجاری ہوں یا نہیں مگر تم ضرور ہو جو محبت کا دعویٰ کر کے دولت کے بغیر رہ نہیں پائیں...... وہ حسب عادت سارے قصور اس کے کھاتے میں ڈال کر چلے گئے تھے ...... ام کلثوم کو اس قدر امید نہیں تھی کہ وہ یوں اس کو منائے بغیر چلے جائیں گے مگر وہ ہمیشہ ہی اس کے اندازے کے برعکس نکلے تھے ام کلثوم ان کے جانے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی مسز حسینہ اس کی ہچکیوں کی آواز سن کر کمرے میں آئی تھیں۔"

''کیا ہوا ام کلثوم......میری بچی'' وہ بے ساختہ ان سے لپٹ گئی تھی۔

''سب کچھ ختم ہوگیا امی جان......میرا سب کچھ ختم ہوگیا'' بے ربط انداز میں کہتے وہ ان کی گود میں بے ہوش ہوگئی تھی محبت کے کمالات نے فقط ایک برس کے قلیل وقت میں دونوں فریقین کی ہمت و استقامت کو ریزہ ریزہ کردیا تھا۔ دونوں کی جذباتیت وانائیت پسندی نے انہیں اس مقام پر کھڑا کردیا تھا اور ستم بالائے ستم کسی کو بھی احساس نہیں تھا......محبت کا سفر آغاز سے پہلے ہی انجام کی جانب بڑھ گیا تھا......قابلِ افسوس، قابلِ مذمت۔

☆☆☆

''اب کیا ہوگا'' یہ سوال ایک مرتبہ پھر ام کلثوم کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھا اس وقت جب اسے ماں بننے کی خبر ملی تھی......ایک مرتبہ پھر پورے گھرانے پر مردنی چھاگئی تھی......ام کلثوم کو جس روز یہ خبر ملی اسے اس کے اندر ایک نئی امید جاگی......شاید کہ اب حالات درست سمت پر آجائیں......حشمت زیدی باپ بننے کی خوشی میں سب کچھ بھول کر اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرلیں......مگر ان کا شاید شاید ہی رہا تھا......حشمت زیدی کو سبھی نے سمجھا کے دیکھ لیا تھا مگر ان کی ناں ہاں میں نہیں بدلی تھی ان کی اناء نے محبت کو قربان کردیا تھا۔ خالدہ بی بی، خالق اور علیم الدین بھائی سبھی نے اپنی سی کوشش کرکے دیکھ لی تھی۔

''سب کچھ ختم ہوگیا ہے اب علیم الدین صاحب......اس کے نزدیک میری کوئی اہمیت نہیں باپ کی دھن و دولت کی ہے......تو پھر ٹھیک ہے ناں وہ رہے اپنے باپ کے ہمراہ'' ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''ایسا مت کہیں حضور......ہمیں پورا یقین ہے اگر ہم ام کلثوم بٹیا کو لینے کے لیے جائیں تو وہ ابھی ہمارے ساتھ آنے پر راضی ہوجائیں گی......'' ان کے لہجے میں بہت مان تھا۔

''رہنے دیجیے محترم......جہاں غرض آجائے وہاں محبت کے پرندے کوچ کرجایا کرتے ہیں۔ ام کلثوم اب وہ نہیں رہی جنہیں میں یا آپ جانتے تھے......وہ اب بہت بدل چکی ہیں......اور پھر اب میں ان سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق رکھنا ہی نہیں چاہتا......انہوں نے انکار کردیا تھا مگر علیم الدین نے ہار نہیں مانی تھی وہ اور خالدہ بی بی صلح کی غرض سے ام کلثوم کے پاس گئے تھے اور انہیں ساتھ چلنے کو کہا تھا۔''

''آپ کا آنا سر آنکھوں پر بھائی......مگر میں اب اس گھر سے اس طرح نہیں جاسکتی اور پھر اب حالات بھی میرے بس میں نہیں ہیں اب میرے جانے یا نہ جانے کا فیصلہ میرے ابا جان طے کریں گے اور وہ کبھی بھی مجھے نہیں بھیجیں گے اگر حشمت مجھے خود لینے کے لیے نہ آئے تو'' وہ نیم رضامند تھی ویسے بھی جب سے اس کی کوکھ میں ایک ننھے وجود نے سانس لینا شروع کیا تھا وہ بہت دھیمی ہوگئی تھیں بلکہ سمجھوتے پر راضی بھی ہوگئی تھیں۔۔

''ضدمت کریں بٹیا......آپ جانتی ہیں حشمت خود کتنے ضدی ہیں وہ اگر نہ آئے تو خدانخواستہ آپ کیا ساری عمر یہیں رہیں

گی......کبھی نہ کبھی تو آپکو لوٹنا ہی ہوگا ناں"

"انہیں ضد زیادہ عزیز ہے یا اپنا گھر یا ہونیوالا بچہ علیم الدین بھائی......وہ فیصلہ کرلیں میں تب تک نہیں جاؤں گی جب تک وہ خود لینے کے لیے نہیں آئیں گے" اتنا کہہ کر وہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھی ایک بہت غلط موقع پر وہ ضد کر رہی تھی......اور ضد کرنے کا انجام عموماً بہت عبرتناک ہوا کرتا ہے۔ دوسری طرف علیم الدین نے حشمت زیدی کو ام کلثوم کو منا کر لانے کے ہزاروں جتن کیے تھے مگر ان کی ناں بھی ہاں میں نہیں بدلی تھی ایک بار ام کلثوم خود علیم الدین کے بارہا منانے پر گھر واپس آئی بھی مگر حشمت زیدی نے اپنانے سے انکار کر دیا تھا ......انہوں نے اسے ایک مرتبہ پھر بے عزت کر کے نکالا تھا در پردہ اس بے عزتی کا بدلہ یا بدسلوک ام کلثوم نے ان کے ساتھ اپنے گھر پر کیا تھا......اپنی اپنی اناء کے پرچم بلند کرتے سمے کسی نے بھی اس بچے کا نہیں سوچا تھا جو ابھی دنیا میں آنے والا تھا......

حشمت زیدی نے پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا......انہوں نے میدان ادب میں اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے تھے انہوں نے زندگی میں ادب کے حوالے سے بے تحاشہ کام کیا تھا ان کے عورت ذات سے مراسم بھی رہے مگر کوئی بھی ام کلثوم کی جگہ نہیں لے سکی بلکہ انہیں تو عورت ذات سے بے تحاشہ نفرت محسوس کی تھی انہیں عورتوں سے گھن محسوس ہوئی تھی جو اپنے باپ بھائیوں اور شوہروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان کیساتھ مراسم رکھتی تھیں......کچھ وقت سرکا تو ان کے اکیلے پن کے خیال سے خالق بھائی آفاق کو اس کے پاس چھوڑ گئے تھے......دوسری شادی کے لیے راضی کرتے کرتے ان کی ماں قبر میں جا سوئی تھی دوسراہٹ کے احساس کے لیے انہوں نے بھی آفاق کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا......اس کی تمام نجی و تعلیمی ضروریات کا خرچہ انہوں نے اٹھا لیا تھا......ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود انہیں پھر کبھی بھی ام کلثوم کی خبر نہیں ملی تھی نہ ہی انہوں نے کبھی جاننے کی کوشش کی تھی۔ سن 2000ء میں جب علیم الدین نے پاک ٹی ہاؤس بند کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے وہاں جانا ہی چھوڑ دیا......وہ پاک ٹی ہاؤس جہاں پر ادب کے لوگ بہار کی مانند مسکراتے پھرتے تھے وہ اب ویران ہو گیا تھا بالکل حشمت زیدی کی زندگی اور دل کی طرح......

ان کی بے جا ضد، ہٹ دھرمی اور انائیت پسندی نے انہیں بالکل تنہا کر دیا تھا کاش وہ اس وقت اتنے سفاک نہ بنتے تو آج ام کلثوم ان کے ساتھ ہوتی یہ پچھتاوا انہیں دن رات ڈستا رہتا تھا......ایک بار علیم الدین بھائی نے اسے بتایا تھا کہ وہ باپ بننے والے ہیں مگر انہوں نے غصے میں آ کر اس اولاد کو اپنانے سے بھی انکار کر دیا تھا......وہ تنہائی کے عفریت میں گھرے اکثر سوچا کرتے......جانے ان کا بیٹا ہوا ہوگا یا بیٹی......اور جانے اب اس کی عمر کتنی ہوگی۔

☆☆☆

صبح سے شام ہوگئی تھی وہ دم بخود یک ٹک بیٹھے انہیں روتے دیکھ رہی تھی حشمت زیدی کے بوڑھے جھریوں زدہ چہرے پر ان گنت پچھتاوے رقصاں تھے کھلی ہوئی کلی کا چہرہ کملا گیا تھا......

"مجھے اعتراف ہے کہ میری بے جا ضد نے میری زندگی کی خوشیوں کو کھالیا......میں تہی دست و بے اماں ہوگیا......مجھے میری ضد اور انا نے کہیں کا نہیں چھوڑا......مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ام کلثوم کیساتھ بہیمانہ سلوک روا رکھا اس کی محبت کو خود اسی کے لیے سزا بنا دیا......" ان کے جھریوں زدہ چہرے پر آنسو ایک تواتر سے گر رہے تھے کلی ان کے پاس آ بیٹھی ان کے ہاتھ پہ نرمی سے ہاتھ رکھا۔

"میں بہت بدقسمت انسان ہوں میری تحریروں سے ایک دنیا نے فیض پایا مگر میں خود کوئی مفاد حاصل نہیں کر پایا میں نے لوگوں کو محبت کرنا سکھائی مگر مجھے خود کو محبت کرنے کا ڈھنگ کبھی نہ آیا......میں نے دنیا کو سمجھوتی قربانی اور درگزر کا درس دیا مگر خود اس ڈھب کو کبھی اپنا نہیں پایا......میں نے زندگی میں کبھی شکر کرنا نہیں سیکھا کبھی خود کو خوش نہیں کر پایا......بچوں سے بے تحاشہ محبت کرنے کے باوجود میں اپنی اولاد کو کبھی دیکھ اور محسوس نہیں کر پایا......مجموعی طور پر میں ایک ناکام انسان ہوں جو زندگی میں کسی ایک رشتے کو بھی ڈھنگ سے نبھا نہیں پایا......میری زندگی میں فقط ایک بات کا سکون ہے کہ میرا ادبی سفر ناکام نہیں رہا زیادہ نہ سہی مگر کچھ نہ کچھ لوگوں نے ضرور میری تحریروں سے اپنی زندگی کی روشن اور واضح راہیں متعین کی ہیں......ورنہ میرے دامن میں ماسوائے پچھتاؤں اور حسرتوں کے اور کچھ بھی جمع نہیں ہے......صرف خسارہ ہے اور دکھ ہیں" وہ بچوں کی مانند پھوٹ پھوٹ کر روتے اعتراف کر رہے تھے کلی ان کا ہاتھ سہلاتی رہی بہت دیر گزر گئی اس نے خود کو فقط ایک سوال پوچھنے کے لیے تیار کیا وہ سوال جو شاید اس کے وہاں آنے کا سبب بنا تھا۔

"سر......ایک بات تو بتائیں......کیا آپ کے دل میں کبھی یہ خواہش نہیں جاگی کہ آپ اپنے بچے سے ملیں......بیٹا ہے یا بیٹی یہ جانیں......اسے اپنا نام دیں اور کیا آپ کو یہ بھی کبھی نہیں لگا کہ آپ کی اولاد کو آپ کی محبت، شفقت اور نام کی ضرورت بھی ہوگی آپ کی اولاد نے کتنی حسرت زدہ زندگی گزاری ہوگی یا گزار رہی ہوگی......اس کا معصوم بچپن کتنی محرومیوں کا شکار رہا ہوگا آپ کو کبھی خیال کیوں نہیں آیا......آپ نے اور آپ کی بیوی نے صرف اپنی انا اور ضد کا پرچم بلند کیا مگر اپنی اولاد کو کیوں بھول گئے......آج آپ کو پچھتاوا ہے اپنے کیے پر تو اس کا کیا فائدہ......کیا آپ کا پچھتاوا ان محرومیوں کا ازالہ کر سکتا ہے......وہ سراپا سوال بنی ان کے سامنے تن کر کھڑی تھی حشمت زیدی نے یکلخت اسے پہچانا......اس کی نیلی روئی روئی آنکھیں ان سے سوال کر رہی تھیں"

اس بچی کا وہ معصوم بچپن جب وہ پہروں باپ کو یاد کر کے روتی تھی......اور اس کی ماں جس نے ساری زندگی اپنی ناکام محبت کا سوگ مناتے بیٹی کی تربیت و پرورش سے پہلو تہی کرتے گزاری جسے زندگی بھر اس بات کا یقین ہی نہیں آیا کہ حشمت زیدی اس کے ساتھ ایسا بھی کر سکتے ہیں کیا مداوا ہے آپ کے پاس اس بچی کے دکھوں کا جو اس نے چھپ چھپ کر روئے اور اپنی ذات کے ساتھ خود اکیلے بیٹھ کر بانٹے......وہ زار و زار روتے ان سے سوال نہیں کر رہی تھی بلکہ وہ ان کے سامنے کھڑی ان کی ہستی ہلا رہی تھی۔

"تو کیا تم......میری بیٹی ہو......" شدت جذبات سے ان کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔

"ہاں......کلی استہزائیہ ہنسی" اور آپ کی بیٹی ہونے کی سزا میں نے ہر لمحہ پائی ہے" اس کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی چبھن تھی درد

تھا اذیت تھی۔

''میں سمجھا نہیں......''انہیں واقعی میں سمجھ نہیں آئی تھی وہ حیرت میں گھرے تھے۔

''کچھ نہیں......بس باپ کے کیے کی سزا بیٹی نے تو پانی ہی تھی ناں......بیٹی نے تو ان محبتوں کا خراج ادا کرنا تھا جن کی قدر آپ نے زندگی میں کبھی نہیں کی......''وہ سسکی تھی۔

''بیٹی......میرے پاس آؤ......مجھے بتاؤ تمہارے دکھ کیا ہیں''وہ پدرانہ شفقت سے لبریز لہجے میں بے تابی سے اس کو چھونے کے منتظر تھے وہ اسے پیار کرنا چاہتے تھے وہ ان کے وجود کا حصہ ہے اس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے خود کو......

''مجھے اپنے دکھ کسی سے کہنے کی عادت نہیں ہے سر......آپ دوا لے لیں......آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے......''وہ فوراً ہی پیشہ وارانہ انداز میں کہہ کر آگے بڑھنے لگی تھی مگر انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک لیا تھا دونوں باپ بیٹی اب ملکر رو رہے تھے۔

''میں چاہتے ہوئے بھی کبھی آپ سے نفرت نہیں کر سکی......حتیٰ کہ اس وقت بھی جب اس نے صرف میری محبت کو ماننے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ میرے باپ کے نام کی جگہ میرے ابا میاں کا نام درج ہے......ورنہ ہی میں نے کبھی صرف آپ کو قصوروار گردانا ہے میں جانتی ہوں کہ غلطی مما کی بھی تھی......انہوں نے ایک غلط وقت پر اپنی ضد کو بڑھاوا دیا اور باقی کی ساری عمر آپ کی طرح پچھتاوے کی نظر کر دی......مقام حیرت کہ آپ دونوں کو احساس تو تھا مگر کبھی بھی اس غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش نہیں کی......دونوں ہی ایک دوسرے کی جانب سے پہل کے منتظر تھے مگر خود قدم نہیں بڑھایا......آپ کے لیے کیا مشکل تھا مما کو ڈھونڈنا اور یہ بھی کوئی مشکل تو نہ تھی کہ آپ معلوم کر لیتے کہ آپ کی اولاد کون ہے......آپ نے تو مڑ کر پورے تیئس برس خبر ہی نہ لی۔''

''میں مانتا ہوں میری بچی......میں خطا کار ہوں، تم ماں بیٹیوں کا......میں نے ظلم کیا تمہارے ساتھ اور تمہاری ماں کے ساتھ میں گناہ گار ہوں تم لوگوں کا......وہ اس کا سر تھپتھپا کر اعتراف کر رہے تھے میں چاہوں بھی تو بھی اس بات کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ ان تمام دکھوں کی اذیت، تپش جو تم نے ان تیئس برسوں میں سہی، برداشت کی......مگر میرے پاس اب اور کوئی چارہ نہیں ہے میری بچی میری بدقسمتی کہ میں عمر کے اس دوراہے پر کھڑا ہوں جب میرے پاس عمر کی نقدی ختم ہو چکی ہے......وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی مانند رو رہے تھے......کلی بھی رو رہی تھی''

☆☆☆

جس روز ام کلثوم نے بیٹی کو جنم دیا......انوار حسین کے گھر وہ مرگ کا دن تھا......کتنی بدقسمتی کی بات تھی ان کی بیٹی نہ مطلقہ تھی نہ بیوہ پھر بھی ان کی بیٹی ان کے گھر پر تھی بغیر کسی حیثیت کے......وہ ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی......گزشتہ مہینوں میں انہیں بھی کہیں یہ امید تھی کہ حشمت زیدی صلح کی کوشش ضرور کرے گا اور نہیں تو اپنی اولاد کا سن کر تو ضرور ہی آئے گا مگر ان کی یہ خام خیالی ثابت ہوئی تھی حشمت زیدی

نے ان کے ارادوں اور امیدوں کو پوری قوت سے جھٹلایا تھا......انہوں نے بہت مہارت سے انہیں دنیا والوں کے سامنے رسوا اور بدنام کیا تھا جو سیاہی ام کلثوم نے کورٹ میرج کر کے ان کے چہرے پر پوت دی تھی وہ شاید کبھی نہ کبھی ڈھل جاتی مگر جو سیاہی اب کی بار حشمت زیدی نے ان کے چہرے پر ملی تھی انہیں دنیا کا کوئی سمندر نہیں دھو سکتا تھا......انہوں نے خود کو بوڑھا ہوتے محسوس نہیں کیا تھا وہ سچ مچ میں بوڑھے ہو گئے تھے انہوں نے اس کے بعد ہر گزرتے دن حشمت زیدی سے نفرت کی تھی وہ اگر چاہتے تو اس کے سارے کس بل چٹکیوں میں نکال سکتے تھے مگر انہیں ام کلثوم کے ترلے اور واسطے یاد آئے تھے جب انہوں نے خلع کی بات کی تھی اور ام کلثوم نے خلع لینے سے انکار کر دیا تھا اس رات وہ ان کے پیروں پر سر رکھ کے روئی تھی اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے اس نے بمشکل تمام باپ کو حشمت زیدی کی بیوی رہنے کے لیے راضی کیا تھا......ارسہ کا وجود بہت بے ضرر اور معصوم تھا مگر انہیں ایک عرصے تک اس کے لیے ان کی نفرت سہنا پڑی کیونکہ اس کی رگوں میں دوڑتا خون خود غرض، سفاک، بے حس اور لالچی حشمت زیدی کا تھا......مگر ایک روز جب وہ بہت چھوٹی تھی اور وہ پیاس کی شدت سے نڈھال تھے تب اس نے اپنے ننھے منھے ہاتھوں سے انہیں پانی پلایا تھا اور انہیں دبایا تھا اس روز ان کے دل پر جمی نفرت ارسہ کے لیے ہمیشہ کے لیے ڈھل گئی تھی انہیں لگا وہ اس بچی کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں......جس کی بدقسمتی کہ اسے کبھی باپ کا پیار نہیں ملا......ماں نے اپنے دکھوں اور غموں میں گھر کر کبھی توجہ نہیں دی......اس نے اس کی ولدیت کے خانے میں بھی اپنا نام لکھوایا صرف اس لیے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتے کسی محرومی کا شکار ہو......مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ وہ ارشہ حشمت زیدی تھی جو اپنے باپ کی طرح سے ہی ذہین تھی بہت کم عمری میں ہی وہ ان ساری باتوں اور حقیقتوں کو از حد جان گئی تھی جو اگر وہ بتانا چاہتے تو بہت مشکل میں گھر کر بتا پاتے مگر ارسہ زیدی ذہین تھی اس نے اپنوں کی محبت کو ہمیشہ احسان سمجھا تھا اس نے کبھی بھی انہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالا تھا......وہ ان کی لاڈلی بٹیا تھی جس نے ہمیشہ ہی ان کی لاج رکھی تھی جس نے کم عمری میں ہی اپنے باپ کی غلطیوں کا ازالہ کرنے کی سعی کی تھی۔ انہیں اس کے دکھ اور محرومیاں ادھ موا کر دیا کرتی تھیں......اور جب اس نے فقط ان کی خاطر اپنی زندگی کی واحد خوشی سے دستبرداری حاصل کر لی تھی اس روز وہ تہجد کے وقت خون کے آنسو روئے تھے......وہ جانتے تھے ارسہ کے دل کی خوشی وہ لڑکا ہے جس کے لیے وہ وائلن سننا اور بجانا سیکھی تھی مگر وہ اپنے خدشات اور وہمات سے خوفزدہ تھے اب ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کی ایک اور ام کلثوم کا دکھ سہہ پاتے......انہوں نے ارسہ زیدی کو فقط دو لفظوں میں سمجھایا تھا اور ان کے لیے مقام حیرت کہ ارسہ سمجھ گئی تھی ان کی ارسہ......ان کی کلی حد سے زیادہ سمجھدار تھی اور محبتوں کو احسان سمجھ کر اتارنے کی کوشش کیا کرتی تھی اس نے ان کا بھرم رکھ لیا تھا اور اس روز انہوں نے خود سے عہد کیا تھا وہ ارسہ کو ساری حقیقت بتائیں گے......وہ خود اسے حشمت زیدی سے متعارف کروانے والے تھے وہ جانتے تھے وہ اب بہت ضعیف ہو چکے ہیں ان کا بلاوا کسی بھی وقت آ سکتا ہے سو انہوں نے ارسہ کو بہت اچھے الفاظ میں اس کے باپ کی خوبیاں بتائی تھیں انہوں نے اپنی بیٹی اور داماد کی زندگی کا تجزیہ بہت غیر جانبداری سے کیا تھا انہوں نے ارسہ انوار حسین عرف کھلی ہوئی کلی کو اپنے باپ کے پاس ایک کیئر ٹیکر کی حیثیت سے جانے

کی اجازت خود دی تھی......

☆☆☆

''وہ بہت اچھا وائلن بجاتا تھا......اور اس وقت اور بھی اچھا لگتا جب وہ خاص الخاص میرے لیے بجاتا تھا'' کلی نے چہرے پر زبردستی کی بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کی کرتے حشمت زیدی کو بتایا جو اسے بہت محبت اور توجہ سے سن رہے تھے چونک اٹھے۔

''میں گھنٹوں سانس روکے اس کا وائلن سن سکتی تھی......اور وہ بجاتا بھی تھا مگر......وہ اپنا دکھ کہتے کہتے اٹک گئی تھی میری قسمت میں محبت نہیں تھی اس نے مجھے اپنانے سے انکار کر دیا صرف اس لیے کہ میری ولدیت کے خانے میں میرے ابا میاں کا نام درج ہے ......اس نے بہت ظلم کیا ڈیڈی......اس نے تو محبت کے وجود سے ہی انکار کر دیا......وہ رونے لگی تھی مگر حشمت زیدی نہیں روئے وہ مسکرا رہے تھے انہیں جیسے بیٹی کے آنسو نظر ہی نہیں آ رہے تھے''

''اگر وہ تمہیں چھوڑ گیا تو تم یہ سوچ کر آزردہ مت ہو کہ وہ تمہیں چھوڑ گیا بلکہ یہ سوچو کہ وہ تمہارے قابل ہی نہیں تھا......اور جنہیں محبت کی قدر کرنی نہ آئے انہیں تو انسانیت کے درجے پر فائز ہی نہیں کرنا چاہیے......مگر ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دن لوٹ آئے تمہیں ایسا لگا ہو کہ اس نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے ہو سکتا ہے وہ خود کو تمہارے قابل بنانے کی سعی میں جتا ہو'' انہوں نے اس کے سلکی بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیرتے انہیں سہلایا......کلی کے اندر سکون کے جھرنے بہنا شروع ہو گئے......کلی نے چونک کے سر اٹھایا۔

''آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں'' وہ چونک اٹھی وہ مبہم سا مسکرائے۔

''تم نے وراثت میں مجھ سے صرف بدگمانی ہی کیوں لی میرے بچے......ساری زندگی میں بھی از خود پریشان کن سوچوں میں گھرا بدگمان ہوتا رہا......کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ میں بھی غلط ہو سکتا ہوں......''

''میں سمجھی نہیں......'' وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

''کیا تم نے اسے کسی وعدے کی زنجیر میں باندھا تھا؟'' انہوں نے سوال کیا تھا

''کیا یہ کام بھی میں نے کرنا تھا......'' کلی نے بھی سوالیہ انداز اپنایا تھا۔

''محبت میں اناء کو حائل نہیں کرنا چاہیے ورنہ نتیجہ ہمارے حالات جیسا نکلتا ہے''

''مگر میرے ہاتھ تو زادراہ کے طور پر بھی خالی ہی تھے'' کلی سسک اٹھی اسے اپنی اور اس کی آخری ملاقات یاد آئی۔

''کیا خبر وہ بھی یہی سمجھتا ہو'' انہوں نے جیسے اس کی وکالت کی۔

''ابھی تم نے خود ہی تو بتایا کہ جب تمہارے ابا میاں کو لگا کہ تم بھی ماں والے راستے پر چل نکلی ہو تو انہوں نے تمہیں روک دیا تھا اور تم اس لیے رک گئیں کیونکہ تمہیں اپنے ابا میاں کو دکھی نہیں کرنا تھا تم نے اپنی محبت کو قربان کر دیا اور قربانی کبھی رائیگاں نہیں جاتی بچے

......اس کا صلہ کبھی نہ کبھی ضرور ملا کرتا ہے......وہ بڑی امید سے جذب کے عالم میں کہہ رہے تھے"

"ہاں ......اس کا صلہ مجھے ملا ہے آپ کی صورت کہ مجھے آپ کی محبت اور توجہ مل گئی ہے......کلی نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا......" وہ مسکرا دیے تھے انہوں نے بھی اسے نہیں بتایا تھا بس انہوں نے ایک فیصلہ کیا تھا اپنی بیٹی کے لیے......اس کی خوشیوں کے لیے کہ انہیں اپنی بیٹی کی زندگی کی واحد خوشی اسے لوٹانی تھی اسے اس کی محبت سے اسے ملوانا تھا۔ ابھی انہیں اپنے پیارے بھتیجے کو فون کرنا تھا جو جرمنی میں بیٹھا اپنے واپسی کے دن گن رہا تھا......ابھی چند دن پہلے جب وہ اس سے اسکائپ پر بات کرر ہے تھے......کلی نے اسے نہیں دیکھا تھا مگر اس نے اسے دیکھ کر پہچان لیا تھا جب وہ کسی کام سے کمرے میں آئی تھی......اسکا دھیان اسکائپ کی طرف نہیں گیا تھا اور نہ وہ بھی آفاق کو پہچان جاتی......آفاق نے ساری کہانی انہیں بتادی تھی حشمت زیدی کو حیرت ہوئی تھی انہیں آفاق سے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ کسی لڑکی کو اتنا آگے لے جا کر انتظار یا اظہار کی کسی بھی ڈور یا وعدے میں باندھے بغر چھوڑ بھی سکتا ہے......انہوں نے اسے ڈانٹا بھی تھا مگر جو کچھ اس نے کہا وہ انہیں منجمد کر گیا تھا۔

"میں محبت پر یقین نہیں رکھتا چاچا جان......محبت ہمیں سوائے دکھوں کے اور کچھ بھی نہیں دیا کرتی......اور میں اسے ایسے عہد کے کسی ڈور میں نہیں باندھنا چاہتا تھا جس سے بندھ کے وہ مجھ سے توقعات وابستہ کرلیتی جنہیں میں پوری نہ کر پاتا......تو ناکام زندگی گزارنے سے بہتر تھا کہ میں محبت سے دستبرداری قبول کرلیتا...... مجھے جو صحیح لگا میں نے وہ کر دیا......میں آپ والی غلطی نہیں دہرانا چاہتا تھا میں محبت نہیں کرنا چاہتا تھا" وہ رنجیدہ ہوا تھا حشمت زیدی بول نہیں سکے......وہ اس کے احتساب کا دن تھا انہیں ساری رات نیند نہیں آسکی ان کی غلطیاں خسارے پچھتاوے اور ناکامیاں اس قدر زیادہ تھیں کہ اب ان کے بچے محبت کرنے سے ڈرنے لگے تھے......وہ کس قدر خرماں نصیب تھے کہ یادانستہ طور پر اپنے بچوں کی خوشیوں کے بھی قاتل تھے......مگر اب انہوں نے ازالہ کرنا تھا انہیں آفاق کو واپس بلانا تھا ایک چچا کی حیثیت سے نہیں ایک باپ کی حیثیت سے......انہیں اب انوار حسین کے گھر جانا تھا اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے کیلئے" انہوں نے سوچ لیا تھا اب انہیں اپنی اناء کو درمیان میں نہیں لانا تھا انہوں نے ہاتھ جوڑ کر ابا میاں اور ام کلثوم سے معافی مانگی تھی ان کی غلطیاں بہت تھیں مگر وہ جانتے تھے کہ ام کلثوم کی محبت کا ظرف اس سے بھی زیادہ بڑا ہے وہ انہیں معاف کر دے گی......اور اگر اس نے انہیں معاف نہ بھی کیا تب بھی انہیں برا نہیں لگے گا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ام کلثوم حق بجانب ہوگی انہوں نے اس کی زندگی کے تیئس برس ضائع کیے تھے انہیں گرہن لگا دیا تھا یہ ایک دن کی معافی تلافی کا کام نہیں تھا وہ اگلے تیئس چوبیس برس مزید ان کی نفرت سہتے تو بھی ان کی معافی تلافی ممکن نہیں تھی ہاں مگر انہوں نے سوچ لیا تھا وہ آفاق اور ارسہ کی محبت کے لیے اب کی بار کچھ بھی کر جائیں گے کم از کم وہ اپنے بچوں کے لبوں پر سسکیاں اور آہیں ہمیشہ کیلئے نہیں جمائیں گے......وہ آہوں اور سسکیوں کو ان کی زندگی کا حصہ نہیں بننے دیں گے اور کائنات کا نظام تو ممکنات اور ناممکنات پر ہی چلتا ہے......

''کیا خبر......کیا معلوم ام کلثوم مان ہی جائیں ......اور عمر کی بقیہ نقدی وہ ایک ساتھ بتائیں اور چاہے ام کلثوم صرف اور صرف نفرت ہی جتائیں مگر وہ سہہ لیں گے......وہ معافی اور صرف معافی ہی مانگیں گے......ام کلثوم معاف نہ بھی کرے تو بھی وہ بقیہ کی زندگی معافی مانگتے رہیں گے......ان کے لیے یہ احساس ہی باعث اطمینان تھا کہ زندگی انہیں معافی کی مہلت دے رہی ہے''

☆☆☆

''تمہیں یہ کیوں اور کب لگا کہ میں نے تمہاری محبت کو اس لیے ٹھکرایا کیونکہ تمہارے ولدیت کے خانے میں تمہارے ابا میاں کا نام درج ہے'' وہ بالکل اچانک ہی اس کے سامنے آیا تھا۔کلی نے اسے حیرت سے دیکھا تھا تو کیا وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں تک آیا تھا ......اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔

''تو اور کیا سمجھتی یہی وہ آخری سچائی تھی جو بچھڑنے سے دو روز پہلے میں نے تمہیں بتائی تھی'' اس نے بھی برملا اعتراف کیا تھا حشمت زیدی نے ٹھیک ہی کہا تھا اس نے ورثے میں ان سے صرف بدگمانی ہی لی تھی۔

''واہ......اور آپ جناب اتنی سمجھدار ہیں کہ پوچھے بغیر ہی جدا ہونے کا فیصلہ کر بیٹھیں......اذیت میں تو میں رہا بے اعتنائی کا شکار تو میں ہوا پریشانی تو میرے حصے میں آئی جب تم بغیر بتائے کیمپس آنا چھوڑ گئی تھیں......وہ پانچ سال بعد اس کے سامنے کھڑا اپنے دکھ جکھہ رہا تھا کلی کی نیلی آنکھوں کے آگے سمندر کا پانی تن گیا......وہ دن پوری جزئیات سے یاد آ گیا تھا جب اس نے محبت کے وجود سے انکار کر دیا تھا......اس کی محبت کی کہانی کو اظہار کی زبان ملنے سے پہلے ہی ختم ہونا پڑا تھا اس اذیت میں وہ بھی پچھلے پانچ برس سے مقید تھی''

''تو جانے سے پہلے کچھ تو کہا ہوتا......کوئی بھی ایسی بات جس سے میں خوش امیدی کا دامن تھامے رکھ سکتی'' اس کی نیلی آنکھوں میں درد تھا لہجہ بھرایا ہوا......آفاق درد سے ہنسا۔

''آیا تو تھا......کچھ لے کر تمہارے لیے مگر تم کیمپس آنا چھوڑ چکی تھیں میں تین بار وہاں گیا مگر تم نہیں آئی دسویں روز تو میری فلائٹ تھی میں جرمنی چلا گیا تھا ہاں مگر اب لوٹ آیا ہوں کلی کو اچھے سے یاد تھا وہ جان بوجھ کر تب تک کیمپس نہیں گئی تھی جب تک اسے اس کے چلے جانے کا یقین نہیں ہو گیا تھا۔''

''میں اس روز تمہیں پرپوز کرنے گیا تھا مجھے اس بات سے کبھی فرق نہیں پڑتا تھا کہ تم کون ہو یا تمہارے باپ کون تھے......میرے لیے اہم تمہاری ذات اور تمہاری ذات سے وابستہ دکھ اور خوشیاں تھی......میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا میں تمہیں کہنا چاہتا تھا کہ میں خود کو تمہارے قابل بنانے کے لیے باہر جا رہا ہوں تا کہ جس وقت میں لوٹوں......مجھے تمہارے والدین انکار نہ کر سکیں اور میں تمہیں بہترین معیار زندگی دینا چاہتا تھا میں حشمت چچا کی طرح اپنی محبت کو غم میں پڑ کے رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا......ارسہ......وہ دو قدم اس کے قریب بڑھ آیا''

”محبت ایک بہت خوبصورت جذبہ ہے اس کی قدر نہ کی جائے تو یہ مرجھانے لگتا ہے......اور میں نہیں چاہتا کہ ہماری محبت مرجھائے یا وقت کی گرد پڑنے سے یہ دھندلا جائے ہم ایک دوسرے سے زندگی کی آخری سانسوں تک پیار کریں اپنی محبت کو نبھائیں ہمیں یہ عہد کر کے اپنی زندگی کی شروعات کرنی ہیں ایک دوسرے کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرنی ہے“ وہ اس کا ہاتھ تھام رہا تھا اور وہ بالکل خاموش تھی......محبت کسی ایک فریق کے نبھانے کا نام نہیں ہے اسے دونوں فریقین کی باہمی رضا مندی سے گزارنا چاہیے......یہ دیکھو یہ میں نے تمہارے لیے لیا تھا......اس نے جیب سے ایک مخملی کیس نکالا تھا......کلی نے حیرت سے دیکھا وہ لاکٹ چین تھا چ......جس پر Till death do us Part کے الفاظ کندہ تھے اس نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کے وہ لاکٹ تھام لیا اسے ان الفاظ میں زندگی سانس لیتی محسوس ہوئی تھی کس قدر خوبصورت منظر تھا دو محبت کرنے والوں کا ملن ہو رہا تھا......نیلی آنکھوں میں محبت کا خمار اترنے لگا۔ آفاق نے مسکرا کر ان آنکھوں کی روشنی دیکھی ایسا لگتا تھا نیلے کانچ کے سمندر میں کشتی کا بادبان پھڑ پھڑا رہا ہو اس نے اس کی لرزتی پلکوں کو دیکھتے ہوئے سوچا......

”ویسے تم نے میرے چچا کی خدمت بہت کی......تمہارا بہت بہت شکریہ“ وہ اس کا ہاتھ کر اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا کلی نے نہیں پوچھا وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے۔

”میں نے اپنے باپ کی خدمت کی ہے تمہارے چچا کی نہیں اور اگر مجھے خبر ہوتی کہ یہ تمہارے چچا ہیں تو......اس نے لبوں کو یکدم ہی بریک لگا لیا تھا“ آفاق نے اسے بولنے پر اکسایا۔

”ہاں ہاں بولو......بولو خاموش کیوں ہوگئی ہو......تو کیا تم پھر سسر ہونے کی حیثیت سے دہری خدمت کرتیں چچا جان کی ......ہے ناں“ وہ شرارت سے اسے چھیڑ رہا تھا۔ کلی کا سر شرم سے جھک گیا۔

”اچھا اب جلدی سے بتاؤ......کب بھیجوں اپنے چچا جان کو......تمہاری مما سے تمہارا ہاتھ مانگنے کو......“ وہ جان بوجھ کر چھیڑ رہا تھا۔

”اس کا فیصلہ تو ڈیڈی ہی کریں گے......ویسے وہ کل ابا میاں سے ملنے گئے تھے بلکہ روز ہی جاتے ہیں اب تو......“ آفاق نے جیسے سمجھ کر سر ہلایا۔

”ہاں انہیں جانا بھی چاہیے......آخر کو ام کلثوم چچی کا حق بنتا ہے کہ انہیں منایا جائے ویسے میں نے سوچ رکھا ہے کہ میں تمہیں روٹھنے ہی نہیں دیا کروں گا وہ پھر پٹری سے اترا تھا“

”تم اس مار سے ڈرتے ہونا......جو تمہیں ڈیڈی سے پڑے گی، مجھ سے لڑائی کی صورت میں“ وہ مزے سے بولی تھی۔

”جی نہیں......میں ان آنسوؤں سے ڈرتا ہوں جو مجھ سے ناراضی کے بعد تمہاری آنکھوں میں جمع ہوں گے......“ وہ اظہار محبت کر رہا تھا کلی چلتے چلتے رک گئی۔

''آفاق......مجھ سے وعدہ کرو......محبت کو میرے لیے پچھتاوا نہیں بناؤ گے......مجھے بہت ڈر لگتا ہے مجھے ام کلثوم نہیں بننا......'' آفاق مسکرا دیا تھا اس نے جواب نہیں دیا تھا بلکہ اس کے اور اپنے پسندیدہ گانے کے چند مصرعے گنگنائے تھے۔

When Snow will fall on winter nights
I will keep you warm inside yeah beby I will
All thourgh your life I will be by ur side
Till death do us part
My love will never end
Till death do us part

اس کے بعد اس نے وائلن بجانا شروع کیا تھا وہی وائلن جو کلی سانس روکے سنتی تھی وہ کلی تھی وہ کھلی ہوئی خوشبودار کلی تھی محبت جس کے انگ انگ سے مترنم تھی......انہوں نے عہد لیا تھا ایک دوسرے سے......اب کی بار انہیں محبت کو سرخرو کرنا تھا انہیں بڑوں کی غلطی نہیں دہرانی تھی محبت کو انا، ضد اور ہٹ دھرمی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دینا تھا......بھلے عمر کی ریاضت کے بعد یہ سہی مگر سب کچھ ٹھیک رہا تھا اور جو نہیں ہوا تھا کلی کو امید تھی وہ بھی ہو جائے گا......ہاں اسے دکھ تھا اس کے والدین نے اپنی اپنی انا کے خول میں مقید ہو کے اپنی عمر رائیگاں گزار دی تھی......اسے اپنی ماں کی تنہائی ڈپریشن دکھ دیتا تھا اور اب سب جاننے کے بعد حشمت زیدی کے پچھتاوے خسارے اور ذہنی اذیت تکلیف دیتی تھی......یہ ان دونوں کی بدقسمتی کہ ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بعد وہ ایک بھرپور صحت مند زندگی گزار نہیں پائے تھے......دونوں ہی محبت کے حصار سے نکلنے میں ناکام رہے تھے۔ایک عالم کو محبت کا درس دینے والے حشمت زیدی کا دامن ہمیشہ محبت سے خالی رہا نہ انہیں محبت کرنی آئی نہ ہی محبت کو سنبھالنا......قدر کرنا تو دور کی بات......ٹھہری۔

اس کی ماں نے اپنے جذبات کے ہاتھوں ہمیشہ خسارے کا سودا کھیلا مگر محبت کا خسارہ ان کے لیے جان بلب ثابت ہوا کم از کم انہیں اس بات پر سمجھوتہ ساری زندگی کرنا نہ آسکا کہ محبت ان کے نصیب میں نہیں تھی......کلی اپنے والدین کے دکھ میں اپنی محرومیاں بھول گئی انہیں ان پر ترس آتا وہ محبت کے مارے نہیں انا کے مارے لوگ تھے۔

اور انا رشتوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے مند رشتوں کو بھربرا کرتی ہے اور ہٹ دھرمی انسانوں کو مار دیتی ہے......حشمت زیدی اور ام کلثوم اب عمر کے اس حصے میں نہیں تھے کہ اپنی اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر سکتے ہاں مگر کلی کو پھر بھی امید تھی کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور یہ گمان کچھ غلط بھی نہیں تھا۔

☆.................ختم شد.................☆